عدلیہ کی آزادی

حقیقت یا خواب!



محمد اسلم لودھی

عدلیہ کی آزادی
حقیقت یا خواب

تحقیق و تالیف

محمد اسلم لودھی

(مشترکہ کاوش)

طاہر سنز پبلشرز

40/B اُردو بازار لاہور۔فون 7234137۔فیکس 7312159

....

وفا پبلی کیشنز

کمرہ نمبر 15 سیکنڈ فلور جلال دین وقف (حبیب بینک) بلڈنگ

چوک اُردو بازار لاہور 042-7357017 /// 042-7353561

0300-9409732 /// 0321-4742903

WWW. UrdubooksWafaPublications.Com

E-Mail: info@UrdubooksWafaPublications.Com

WafaPub@Yahoo.Com and Lodhi1954@hotmail.Com

فہرست مضامین

-1	انتساب	4
-2	عرض مصنف	5
-3	عام آدمی کا جج (افتخار محمد چودھری)	8
-4	چیف جسٹس کی معطلی کے محرکات	14
-5	چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس	18
-6	جیو پر نشر ہونے والا صدر کا انٹرویو	26
-7	نعیم بخاری کا اختلاف ذاتی تھا یا اصولی	31
-8	سپریم جوڈیشل کونسل کی آئینی حیثیت	33
-9	آئین کی دفعہ 209	41
-10	"سپریم جوڈیشل کونسل" میں چیف جسٹس کی پہلی پیشی	43
-11	چیف جسٹس کی آئینی درخواست کے اہم نکات	45
-12	چیف جسٹس کی آئینی درخواست پر صدر کا جواب	48
-13	چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا بیان حلفی (اردو)	50
-14	چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا بیان حلفی (انگلش)	53
-15	چیف جسٹس کے بیان حلفی پر ردعمل	58
-16	اعلیٰ حکومتی حکام کے بیان حلفی	61
-17	اظہار یکجہتی کے لئے ججوں کے استعفے	68
-18	چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکلا	70
-19	حکومتی وکلا کا پینل	71
-20	سپریم کورٹ فل کورٹ کے ارکان	73
-21	عبوری آئین کے تحت حلف نہ اٹھانے والے جج صاحبان	74
-22	پاکستان کے چیف جسٹس صاحبان	75
-23	عدلیہ کے سربراہان کی تذلیل	79
-24	سپریم کورٹ کا ضابطہ اخلاق	83
-25	پیمرا آرڈیننس میں نئی ترامیم	84
-26	پیمرا ترمیم پر ردعمل	86

-27	وٹی کیس کا از خود نوٹس	88
-28	عدلیہ کے ساتھ کس دور میں کیا ہوا	91
-29	چیف جسٹس سجاد علی شاہ سے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری تک	93
-30	لاہور ہائی کورٹ بار سے چیف جسٹس کا خطاب اور والہانہ استقبال	97
-31	سپریم کورٹ بار کے سیمینار سے چیف جسٹس اور ان کے وکلا کے خطابات	99

عدالتی بحران کے حوالے سے چند اہم شخصیات کے انٹرویوز

-32	سپریم کورٹ بار کے صدر منیر اے ملک کا انٹرویو	105
-33	جسٹس (ر) رشید احمد رضوی کا انٹرویو	114
-34	ممتاز قانون دان ضیا احمد اعوان کا انٹرویو	121
-35	ممتاز صحافی اور دانش ور مجیب الرحمان شامی کا انٹرویو	124
-36	عدالتی بحران کے حوالے سے ایک اہم سیمینار	130

12 مئی قومی تاریخ کا سیاہ ترین دن

-37	سانحہ کراچی..... قومی تاریخ کا بدترین دن	136
-38	12 مئی قیامت صغریٰ ایک خوفناک منظر	139
-38	منیر اے ملک کے دفتر کی بندش اور خاتمہ	142
-39	کراچی سے ''قانون'' شہر بدر کر دیا گیا	145
-40	نازک ترین حالات اور غیر یقینی صورت حال	149
-41	حکومت اور ایم کیو ایم کی وضاحتیں	152
-42	کیا معاوضہ دکھوں کا مداوا کر سکے گا	155
-43	اہل پاکستان کے نام الطاف حسین کا کھلا خط	158
-44	کیا مہاجر ہونا گناہ ہے	165
-45	کراچی --- نامعلوم افراد کہاں سے آئے	168
-46	12 مئی کی ایف آئی آر	172
-47	پختون قوم پرستوں کی آزمائش	174
-48	معین الدین حیدر کا بے لاگ تبصرہ	177
-49	دلدل میں کون اتر رہا ہے	179
-50	سانحہ کراچی: چیف جسٹس سندھ کا از خود نوٹس	183
-51	استفادہ (کتابیات)	186

انتساب

میں اپنی اس کتاب کا انتساب عظیم عدالتی ہیرو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے نام کرتا ہوں جس نے ساٹھ سالہ قومی تاریخ میں جبر اور طاقت کے سامنے سر جھکانے کی بجائے نہ صرف پوری قوم کو ایک نئے عزم اور ولولے سے نوازا بلکہ اپنی جرات اور بہادری سے آنے والی نسلوں کو بھی یہ پیغام دیا کہ تاریخ میں ہمیشہ وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو وقت کی آندھیوں کا بے جگری سے مقابلہ کرتے ہیں کون نہیں جانتا کہ آزادی کے بعد عدلیہ کسی نہ کسی طرح حکمرانوں کی ذیلی ٹیم ہی تصور کی جاتی رہی ہے نام نہاد جمہوریت کا دور ہو یا مارشل لائی حکمرانی 'تمام حکمرانوں نے اپنے تمام تر ناجائز فیصلوں کو جائز بنانے کے لئے عدلیہ کا ہی سہارا لیا دور ایوبی ہو' یحییٰ خاں کی حکمرانی ہو' ضیاالحق کا دور ہو یا جنرل پرویز مشرف کا' تمام فوجی حکمرانوں نے اپنی حکمرانی کو آئینی جواز فراہم کرنے کے لئے عدلیہ اور ججوں پر مشق ستم باندھے رکھا

مجھے فخر ہے کہ میں اس دور میں زندہ ہوں جب عدلیہ کا ایک جرات مند جج افتخار محمد چودھری نہ صرف فوجی حکمرانوں کے عزائم میں دیوار بن کے کھڑا ہے بلکہ اس نے اپنے عدالتی دور میں پاکستان کے وڈیروں' بیوروکریٹوں' چاپلوس سیاست دانوں اور رشوت خور پولیس اہلکاروں کو بھی عدالتی کٹہرے میں لا کھڑا کیا چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی عظمت کو صرف میں ہی نہیں پوری پاکستانی قوم سلام پیش کرتی ہے اگر میں یہ کہوں کہ ایک وکیل محمد علی جناح نے انگریز اور ہندو سامراج سے قانونی جنگ لڑتے ہوئے برصغیر پاک و ہند میں ایک عظیم اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی تو ساٹھ سال بعد وکالت کے ہی پیشے سے وابستہ افراد نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی قیادت میں پاکستان کی حقیقی آزادی اور بقا کی جنگ لڑتے ہوئے ایک آزاد اور خودمختار عدلیہ کا خواب شرمندہ تعبیر کیا تو یہ بات غلط نہ ہوگی آزاد عدلیہ کے حوالے سے لڑی جانے والی اس عظیم جنگ کا لمحہ لمحہ اپنے دامن میں سمونے والی اس کتاب کا انتساب چیف جسٹس افتخار محمد چودھری 'سپریم کورٹ بار کے صدر منیر اے ملک ' چوہدری اعتزاز احسن ایڈووکیٹ' حامد خان ایڈووکیٹ 'جسٹس (ر) طارق محمود' قاضی محمد انور ایڈووکیٹ کے علاوہ ملک بھر کے ان تمام وکلا اور ان کے جرات مند رہنماؤں کے نام کرتا ہوں جو کسی لالچ' طمع اور خوف سے بالاتر ہو کے وقت کی آندھیوں سے ٹکرا گئے پوری پاکستانی قوم ان کی ممنون اور مشکور ہے



عرض مصنف

جنرل پرویز مشرف نے چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری کو 9 مارچ کو غیر فعال کرتے ہوئے ان کے خلاف ریفرنس دائر کر کے یہ بتانے کی کوشش کی کہ جو بھی ان کی مرضی ومنشا کے خلاف فیصلے کرے گا یا ان کے راستے کی دیوار بنے گا اسے یاد ماضی کا حصہ بنا دیا جائے گا بظاہر دیکھا جائے تو چیف جسٹس افتخار چودھری کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے حکمرانوں کی جانب سے تین سو ارب روپے کی سٹیل ملز کو صرف 21 ارب میں فروخت کرنے کے فیصلے کو نہایت جرات مندی سے غیر قانونی قرار دے دیا اسی طرح 570 ارب روپے کی مالیت کا حبیب بنک صرف حکمرانوں کے ایما پر 22 ارب روپے میں فروخت کر دیا گیا چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اس سودے بازی کا ازخود نوٹس لینے والے تھے گوادر میں کھربوں روپے مالیت کی قیمتی اراضی کو کوڑیوں کے بھاؤ حکمرانوں نے خود اور اپنے چہیتوں کو الاٹ کر دیا چیف جسٹس آف پاکستان کی حیثیت سے جسٹس افتخار محمد چودھری نے غیر قانونی طور پر ہونے والی تمام الاٹ منٹ کو منسوخ کر دیا کہ قومی املاک لوٹ کا مال نہیں جسے کسی قانون اور ضابطے کے بغیر اپنوں میں تقسیم کر دیا جائے

انتظامیہ کی نااہلی اور ملک میں ظلم اور زیادتی کے بڑھتے ہوئے واقعات کا ازخود نوٹس لیتے ہوئے چیف جسٹس نے صرف ڈیڑھ سال کے عرصے میں تقریباً چھ ہزار مقدمات کے فیصلے اس طرح کئے کہ ملکی تقدیر کے خود ساختہ مالک بیورو کریٹس' پولیس حکام' وڈیروں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی حکمرانی کو پہلی مرتبہ زد پہنچی اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اس ملک میں کوئی ایسا جرات مند شخص بھی ہے جو ان کی اتھارٹی اور فیصلوں کو چیلنج کر سکتا ہے' گھروں سے اٹھائے جانے والے سینکڑوں افراد کی بازیابی کے لئے بھی چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی کاوشیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں کہا یہ جاتا ہے کہ وہ شخص جو بندوق کے زور پر پورے ملک اور اس کے اداروں کو ایک لاٹھی سے گزشتہ سات سال سے ہانکے چلا جا رہا ہے وہ خود کو آرمی چیف بھی کہلاتا ہے اور پاکستان کا صدر بھی ' پاکستان میں کوئی شخص یا ادارہ اس کی اس حیثیت کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے وہ اپنی نگرانی میں ہونے والے الیکشن میں جس سیاسی جماعت کو چاہتا ہے کامیابی دلا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ناکامی اس کا مقدر بنا دیتا ہے اپنی طاقت اور جبر سے سیاست دانوں کا ایک بڑا طبقہ نیب میں دائر ہونے والے مقدمات کے خوف سے صبح وشام اس کی چاپلوسی میں نہ صرف پیش پیش نظر آتا ہے بلکہ آئین کے بالکل برعکس وردی کو اس ملک کی بقا کا ضامن قرار دیتا نہیں تھکتا' وردی سمیت منصب صدارت پر اس کی بقا کا معاملہ بھی چند ماہ بعد سپریم کورٹ میں زیر بحث آنے والا تھا اسے خدشہ تھا کہ جس شخص کو ماضی میں کسی دھونس اور دھاندلی کے بل بوتے پر ڈرایا نہیں جا سکا اسے وردی اور منصب صدارت پر برقرار رہنے کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا چاپلوسوں کے ایک بڑے ٹولے نے بھی یہی مشورہ دیا کہ جتنی جلدی ہو سکے چیف جسٹس کے عہدے پر بیٹھے ہوئے اس شخص سے جان چھڑوالی جائے وگرنہ مستقبل میں من پسند فیصلوں کو حتمی شکل نہیں دی جا سکے گی چنانچہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف صدارتی ریفرنس کا فیصلہ انتہائی عجلت میں یہ سوچے سمجھے بغیر ہی کر لیا گیا کہ عدلیہ اور قومی وحدت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے صدر اور اس کے حواریوں کو توقع نہیں تھی کہ وردی کی موجودگی میں کوئی شخص ان کی حکم عدولی کی جرات کر سکتا ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہوا اور ایسے جرات مند شخص کے ساتھ پوری قوم اٹھ کھڑی ہوئی

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے بیان حلفی میں بتایا کہ جس طرح ان کو آرمی چیف کی وردی پہنے ہوئے شخص نے اپنے کیمپ آفس میں ساڑھے گیارہ بجے بلایا اور شام پانچ بجے مرضی کے بغیر انہیں آرمی ہاؤس میں محبوس رکھا گیا اس دوران مختلف اداروں کے سربراہ انہیں مستعفی ہونے

پر یہ کہہ کر آمادہ کرتے رہے کہ انکار کی صورت میں نتائج بہت خطرناک ہوں گے اس خوفناک ماحول میں جبکہ ایک طاقتور ادارے کا سربراہ دوسرے مقدس ادارے کے سربراہ کو اپنے اختیارات اور طاقت کے بل بوتے پر دھمکا رہا ہو اس لمحے جرات رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش آمدہ حالات کا سامنا کرنے کا فیصلہ ہی چیف جسٹس آف پاکستان کو ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید کر گیا چیف جسٹس کے مطابق گاڑی سے جھنڈے اتار لئے گئے گھر پر پولیس اور ایجنسیوں کے افراد کا قابض ہونا ' ٹیلی فون منقطع کرنا' موبائل فون' ٹی وی' کیبل اور ڈی ایس ایل کو جام اور منقطع کرنے کا عمل کسی بھی طرح قابل تعریف نہیں تھا خاندان کے تمام افراد کو 9 مارچ کی شام سے 13 مارچ تک کس قانون اور ضابطے کے تحت محبوس رکھا گیا تاکہ چیف جسٹس کو خوفزدہ کر کے ان سے من پسند شرائط پر استعفی حاصل کر لیا جائے پھر کسی جج کو جرات نہیں ہوگی کہ وہ حکومت اور وردی کے خلاف فیصلہ کر سکے چیف جسٹس کے بقول یہ سب کچھ ہوا اور ایک ادارے کے سربراہ نے طاقت کے بل بوتے پر دوسرے مقدس ادارے (عدلیہ) کے سربراہ کو نہ صرف بے بس کر کے غیر فعال بنا دیا بلکہ اسے ذہنی اذیت کا شکار کر کے یہ پیغام دیا کہ اس ملک میں وہی ہوگا جو وہ چاہے گا اس کے برعکس سوچنے والوں کی اس ملک میں کوئی گنجائش نہیں بعد ازاں لاہور ہائی کورٹ بار سے خطاب کرتے ہوئے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے برملا کہا کہ آمرانہ نظام حکومت کا تصور اب ختم ہو چکا ہے جو قومیں تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتیں تباہ ہو جاتی ہیں انتظامیہ بنیادی حقوق کے خلاف قانون سازی نہیں کر سکتی عدلیہ انسانی حقوق اور آئین کے برعکس قانون سازی کو کالعدم قرار دینے کا اختیار رکھتی ہے انہوں نے کہا کہ عدلیہ کی آزادی کا بحال ہونا ملکی بقا کے لئے نہایت ضروری ہے شخصی حکمرانی میں اختیارات اور طاقت کا غلط استعمال بڑھ جاتا ہے بطور چیف جسٹس عدلیہ کی آزادی کو یقینی بنانا میری ذمہ داری ہے فیصلے کی آزادی نہ ہونے کے باعث عدلیہ صحیح طور پر اپنا کردار ادا نہیں کر پاتی بہترین نظام کے لئے بھی عدلیہ کا آزاد ہونا ضروری ہے چیف جسٹس نے مزید کہا کہ آئین میں عدلیہ' مقننہ اور انتظامیہ کے اختیارات واضح ہیں کسی ایک شخص یا ادارے میں تمام اختیارات کا جمع ہونا خطرناک امر ہے آزاد عدلیہ ہی لوگوں کو سستا' تیز رفتار اور فوری انصاف فراہم کر سکتی ہے

بہر کیف 9 مارچ 2007 پاکستانی تاریخ کا سیاہ ترین دن قرار دیا جاتا رہے گا لیکن اس دن کو عدلیہ کی آزادی کے حوالے سے نہایت اہم بھی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسی دن عدلیہ کے سربراہ نے انتظامی سربراہ کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر کے پوری عدلیہ کو آزادی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا اس جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لئے پاکستان کے وہ تمام وکلا قابل تحسین ہیں جنہوں نے شدید ترین گرمی اور نامساعد حالات اور حکومتی جبر و استبداد کے باوجود اپنے ضمیر کو چند سکوں کی نذر نہیں کیا بلکہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر وقت کے حاکم (جو خود کو تمام قوانین اور ضابطوں سے مبرا تصور کرتا ہے) کو یہ پیغام دیا کہ اب آزاد عدلیہ کے خواب کو حقیقت میں بدلنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور آزاد عدلیہ ہی اس ملک کی آزادی اور خود مختاری کے لئے انتہائی ضروری ہے

اسی طرح 12 مئی کے دن کو بھی سنگینی اور ہولناکی کے اعتبار سے 9 مارچ سے کسی بھی طرح کم قرار نہیں دیا جا سکتا اس دن چیف جسٹس افتخار محمد چودھری 'سندھ ہائی کورٹ بار سے خطاب کرنے کے لئے طے شدہ پروگرام کے مطابق کراچی پہنچے لیکن حکمرانوں کے ایما پر ایم کیو ایم کے غنڈوں نے ائیر پورٹ سے سندھ ہائی کورٹ تک درندگی اور وحشت کے وہ مظاہر دکھائے کہ درجنوں انسان ان غنڈوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر گئے جبکہ سینکڑوں زخمی ہو کر ہسپتالوں کی زینت بنے۔ خون کی اس ہولی میں پولیس اور رینجرز نے خاموش تماشائی کا کردار ادا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ یہ سب کچھ حکومت اور حکمرانوں کے ایما پر ہی ہو رہا تھا بہر کیف سانحہ کراچی کی جس قدر مذمت کی جائے' کم ہے لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ عین اسی شام اسلام آباد میں سرکاری خزانے سے کروڑوں روپے خرچ کر کے ملک بھر سے چند ہزار سرکاری ملازموں کو اکٹھا کر کے لڈی اور بھنگڑا شو ترتیب دیا گیا اس جشن کا اہتمام کرنے والے حکمران اسے عوامی طاقت قرار دیتے ہوئے بلٹ پروف شیشے کی دیواروں کے پیچھے بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے اور خود کو احمقوں کی طرح یقین دلا رہے تھے کہ سولہ کروڑ عوام ان کی طاقتور مٹھی میں بند ہیں فخریہ انداز میں تقریر کرنے والوں میں صدر وزیر اعظم وزرائے اعلی وفاقی وزرا سمیت حکومتی ایم این اے اور ایم پی اے بھی شامل تھے اس لمحے انہیں یہ

احساس نہیں ہوا کہ اسی شام کراچی میں کھیلی جانے والی خون کی ہولی سے پورا ملک سوگوار ہے اور تشویش میں مبتلا ہے لیکن حکمرانوں کے چہروں پر نہ تو کسی کے مرنے کا غم تھا اور نہ ہی ایم کیو ایم کی جانب سے درندگی کی پریشانی - دوسرے لفظوں میں انہوں نے کراچی کو مکمل طور پر ایم کیو ایم کے سپرد کر دیا تھا جو اس کے دل میں آئے سلوک کرے - دکھ اور تکلیف کی بات یہ بھی ہے کہ الیکٹرونکس میڈیا پر براہ راست پروگرام یا چیف جسٹس کی کوریج براہ راست دکھانے پر پابندی لگانے والے اپنے سرکاری جلسے کی کئی گھنٹوں تک براہ راست کوریج کروا کے پریشان حال عوام کے زخموں پر نمک چھڑکتے رہے اور بتاتے رہے کہ ان کے عزائم میں کوئی قانون اور ضابطہ حائل نہیں ہوسکتا یہاں اگر میں میڈیا کے جاندار اور موثر کردار کو خراج تحسین پیش نہ کروں تو زیادتی ہوگی کیونکہ بقول چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اگر میڈیا ساتھ نہ دیتا تو نہ وکلا کی تحریک ملک گیر سطح پر مضبوط وتوانا ہوسکتی اور نہ ہی آزاد عدلیہ کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا انہوں نے میڈیا کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ پوری قوم ان نازک لمحات میں ان کی ممنون ہے لیکن قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ جہاں خود کو ہر قانون سے بالاتر تصور کرنے والے حکمرانوں نے عدلیہ کی آزادی کو تاراج کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اسی طرح میڈیا کو پیمرا کے ترمیمی آرڈی ننس کی بدولت پابندیوں میں جکڑنے کی ناکام کوشش بھی کی گئی جس کا معاملہ اب ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے - میری نظر میں چیف جسٹس آف پاکستان سمیت وہ تمام وکلا قابل تحسین ہیں جنہوں نے وقت کے آمر کے سامنے جھکنے کی بجائے انکار کر کے قوم کو آزادی نو کا پیغام دیا جہاں تک وکلا کی جانب سے فوج پر تنقید کا سوال ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ فوج پہلے بھی تمام پاکستانیوں کے لئے قابل احترام تھی اور اب بھی ہے لیکن کوئی ایک شخص وردی پہن کر اگر قومی امنگوں کے برعکس اقدامات اور زیادتیاں کرتا ہے تو اس شخص پر تنقید کو فوج پر تنقید قرار نہیں دیا جاسکتا جو آرمی چیف کی وردی پہن مسلم لیگ ق کے جلسوں میں ان کے لئے ووٹ مانگتا پھرتا ہے کیا فوج کا خود احتسابی قانون اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے وہ فوج کی طاقت کو اپنی ذات کے تحفظ کی علامت بنا کے کھلے عام یہ دعوی کرتا ہے کہ الیکشن ہوں یا نہ ہوں اسمبلیاں رہیں یا نہ رہیں وہ تو ہر صورت آرمی چیف اور منصب صدارت پر فائز رہے گا اس کی یہی باتیں خدا کی خدائی کو چیلنج کرنے والی دکھائی دیتی ہیں بہر کیف وکلا کا موقف تو نہایت واضح ہے وہ کہتے ہیں کہ فوج حکمرانی چھوڑ کر بارکوں میں واپس چلی جائے تو ہم بھی کالا کوٹ پہن کر سڑکوں سے عدالتوں میں آجائیں گے بہر حال تاریخ خود فیصلہ کرے گی کہ ان اعصاب شکن مہینوں میں کون حق پر تھا اور کون دوسروں کے حق پر طاقت کے بل بوتے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا بہر حال میرے لئے وہ تمام مصنفین' تبصرہ نگار' کالم رائٹر فیچر رائٹر' ممتاز قانون دان قابل فخر ہیں جنہوں نے ان نازک لمحات میں اپنے قلم کو آزاد عدلیہ کی جنگ میں بے لاگ اور بغیر کسی لالچ کے استعمال کیا میں سمجھتا ہوں کہ پوری قوم ایسے جرات مند ججوں ' وکیلوں' صحافیوں اور لکھاریوں کی ہمیشہ ممنون و مشکور رہے گی جنہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے ساٹھ سال بعد قومی سطح پر ایک نئی تاریخ رقم کی بلکہ ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی سے آنے والی نسلیں ہمیشہ مستفید ہوتی رہیں گی - اس کتاب کو ترتیب و تالیف کرتے وقت میں نے کسی شخصیت سے ذاتی عناد اور پسند اور ناپسند کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ ان نازک لمحات کو تاریخ کا بہت اہم اور بڑا حوالہ تصور کر کے کتابی صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے اگر اس میں کوئی کمی یا غلطی محسوس ہو تو میں اس کا پیشگی معافی کا خواستگار ہوں یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نہ تو وکیل ہوں اور نہ ہی قانون سے کبھی میرا واسطہ رہا ہے میں تو ایک سیدھا سادا محب وطن پاکستانی ہوں وطن سے اسی والہانہ محبت کو بنیاد بناتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ میری یہ تحقیقی اور تخلیقی کاوش وطن عزیز اور عدلیہ کی آزادی کی جنگ لڑنے والے غیور پاکستانیوں کے لئے ایک اہم دستاویز کی حیثیت ثابت ہوگی انشااللہ

ایک محب وطن تالیف کار

محمد اسلم لودھی

افتخار محمد چودھری

عام آدمی کا جج

واقعہ کربلا کے بعد کوفہ کے چند لوگ ایک مذہبی عالم کے پاس آئے' یہ لوگ عالم سے مچھر مارنے کے لئے فتویٰ لینا چاہتے تھے۔ان لوگوں نے عالم سے پوچھا: ''کیا اسلام میں مچھر مارنا جائز ہے'' عالم ان کی بات سن کر مسکرائے اور فرمایا: ''بدبختو! تم لوگوں نے کربلا میں کیا قیامت برپا کر دی اور سوچا تک نہیں لیکن مچھر مارنے کے لیے فتویٰ تلاش کر رہے ہو۔'' وہ لوگ اٹھے اور چپ چاپ واپس چلے گئے۔ان لوگوں میں حیا اور ضمیر زندہ تھا ورنہ یہ لوگ بھی حکومت پاکستان کی طرح اس مذہبی عالم کے خلاف ریفرنس وائر کر دیتے اور عالم کو باقی زندگی ''ہاؤس اریسٹ'' میں گزارنا پڑتی۔

غیر فعال چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف جو چارج شیٹ منظر عام پر لائی گئی ہے۔یہ 21 مارچ کے اخبارات میں شائع ہو چکی ہے' یہ چارج شیٹ مزاح اور غیر سنجیدگی کا عظیم شاہکار تھی۔اس میں چیف جسٹس آف پاکستان پر 35 الزامات عائد کیے گئے۔ان 35 الزامات میں 26 چیف جسٹس کے صاحبزادے ڈاکٹر ارسلان افتخار سے متعلق ہیں' چارج شیٹ میں دعویٰ کیا گیا' چیف جسٹس نے اپنے صاحبزادے کو میڈیکل کالج میں زبردستی داخل کرایا۔اسے زبردستی ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں بھرتی کرایا' ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ سے ڈیپوٹیشن پر اسے ایف آئی اے میں لایا گیا' ایف آئی اے سے نیشنل پولیس اکیڈمی بھیجا گیا اور ٹریننگ کے بعد اسے پنجاب پولیس میں تعینات کر دیا گیا۔چارج شیٹ میں دعویٰ کیا گیا اس سارے عمل کے دوران چیف جسٹس نے سرکاری افسروں پر دباؤ ڈالا۔اس میں دعویٰ کیا گیا کہ چیف جسٹس نے سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ کو گھر بلا کر بیٹے کی تعیناتی کا حکم دیا۔چارج شیٹ میں دعویٰ کیا گیا چیف جسٹس کو 1600 سی سی کی ایک گاڑی رکھنے کا استحقاق تھا لیکن چیف جسٹس مرسڈیز سمیت سات گاڑیاں استعمال کرتے رہے۔انہوں نے سپریم کورٹ لاہور اور کراچی میں بھی بڑی تعداد میں گاڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔چارج شیٹ میں دعویٰ کیا گیا' چیف جسٹس وزیراعلیٰ اور گورنر کی کاریں استعمال کرنے پر بھی اصرار کرتے رہے' وہ گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کے طیارے اور ہیلی کاپٹر استعمال کرنے کا مطالبہ بھی کرتے رہے تھے۔چارج شیٹ میں دعویٰ کیا گیا' چیف جسٹس کے بعض تحریری فیصلے عدالت میں سنائے جانے والے ان کے فیصلوں سے متصادم تھے۔چارج شیٹ میں ایک ایسے فیصلے کا حوالہ بھی دیا گیا' یہ 55 لاکھ روپے کی رقم کا کیس تھا' چارج شیٹ میں وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری اور چیف جسٹس کی ایک گفتگو کا بھی حوالہ دیا گیا۔اس حوالے کے مطابق چیف جسٹس نے پرنسپل سیکرٹری سے ڈاکٹر ارسلان افتخار کو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تعینات کرنے کا مطالبہ کیا تو پرنسپل سیکرٹری نے جواب دیا: ''یہ معاملہ تحریری طور پر وزیراعظم کے نوٹس میں لایا جا چکا ہے اور اس میں کچھ وقت لگے گا۔'' اس کے جواب میں چیف جسٹس نے کہا: ''یہ پیکج کا حصہ تھا اور اس تاخیر سے معاملہ خراب ہو سکتا ہے۔''

اگر ہم اس چارج شیٹ کو پاکستان کی حکومتی تاریخ' سیاست اور حالات میں رکھ کر دیکھیں تو یہ انتہائی بچگانہ اور مزاحیہ محسوس ہوتی ہے۔چارج شیٹ کے پہلے 26 الزامات چیف جسٹس کے صاحبزادے ڈاکٹر ارسلان افتخار کی تعیناتی سے متعلق ہیں۔یہ الزامات پڑھ کر پاکستانی ذہن سوچتا ہے کہ کیا بولان میڈیکل کالج کا وہ پرنسپل مجرم نہیں تھا جس نے دباؤ میں آ کر ارسلان افتخار کو میرٹ کے بغیر داخلہ دیا تھا؟ کیا بلوچستان کے وہ وزیراعلیٰ مجرم نہیں ہیں جنہوں نے ڈاکٹر ارسلان کو میڈیکل کالج میں داخلہ دینے کا حکم دیا تھا؟ کیا وزیراعلیٰ بلوچستان جام یوسف مجرم نہیں ہیں جنہوں نے ڈاکٹر ارسلان افتخار کو بلوچستان کے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں سیکشن افسر لگوایا تھا؟ کیا ایس اینڈ جی ڈی بلوچستان کے وہ سربراہ مجرم نہیں ہیں' جنہوں نے ڈاکٹر ارسلان کا تقرر نامہ جاری کیا تھا؟ کیا وزارت داخلہ کا وہ افسر مجرم نہیں ہے جس نے ڈاکٹر ارسلان کو ڈیپوٹیشن پر ایف آئی اے میں بھجوایا تھا؟ کیا وہ

ڈی جی مجرم نہیں ہے جس نے ڈاکٹر ارسلان کو ایف آئی اے میں قبول کیا تھا؟ کیا نیشنل پولیس اکیڈمی کا وہ ڈی جی مجرم نہیں ہے جس نے ڈاکٹر ارسلان کو اکیڈمی میں ٹریننگ لینے کی اجازت دی تھی؟ کیا وہ آئی جی پنجاب مجرم نہیں ہے جس نے ڈاکٹر ارسلان کو قبول کیا تھا؟ کیا وزیراعظم سیکرٹریٹ کے وہ افسر مجرم نہیں ہیں جنھوں نے اس سارے عمل کے دوران احکامات جاری کیے تھے؟ کیا وہ سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ مجرم نہیں ہے جو رات کو چیف جسٹس کے گھر گیا تھا اور اس نے ''دباؤ'' میں آ کر ''حکم نامہ'' جاری کر دیا تھا اور کیا وہ وزیراعظم مجرم نہیں ہے جس نے ڈاکٹر ارسلان کی تعیناتی کے لیے قانون میں تبدیلی کی تھی؟ اگر ہم ان سارے افسروں اور عہدیداروں کو ان الزامات سے بری کر دیں تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے اس وقت وفاقی حکومت میں 1132 ریٹائر اور حاضر سروس فوجی افسر تعینات ہیں اور یہ تمام افسر کس قانون کے تحت سول محکموں میں کام کر رہے ہیں؟ کیا آئین اور قانون کسی ریٹائر فوجی افسر کو کسی سول محکمے کا ڈائریکٹر جنرل لگانے کی اجازت دیتا ہے اور کیا یونیورسٹی کے قوانین کسی ریٹائر جنرل کو وائس چانسلر تعینات کرنے کی اجازت دیتے ہیں؟ اگر اس کا جواب ہاں ہے تو پھر چیف جسٹس کے ڈاکٹر بیٹے کی ایف آئی اے یا پولیس میں تعیناتی کیسے جرم بن گئی؟ دوسرا حکومت نے اس چارج شیٹ میں اس پیکج کی وضاحت نہیں کی جس کا حوالہ پرنسپل سیکرٹری کے ساتھ چیف جسٹس کی گفتگو کے دوران دیا گیا ہے' سوال یہ ہے وہ کون سا پیکج تھا' جس کے ذریعے چیف جسٹس کے بیٹے کو پولیس میں تعینات کیا گیا اور اس پیکج کے ذریعے وزیراعظم یا حکومت نے عدلیہ سے کیا کیا فوائد حاصل کیے تھے۔ حکومت نے چارج شیٹ میں چیف جسٹس پر گاڑیوں' ہیلی کاپٹروں اور طیاروں کے استعمال اور مطالبے کا بھی الزام لگایا' سوال پیدا ہوتا ہے ہمارے گورنرز' وزرائے اعلیٰ' وزیراعظم اور صدر یہ ہیلی کاپٹر اور طیارے کس قانون کے تحت استعمال کر رہے ہیں؟ ہمارے وزیراعظم نے پچھلے سال اپنے لیے 5 ارب روپے کا طیارہ خریدا تھا' سوال یہ ہے انہوں نے یہ طیارہ کس قانون کے تحت خریدا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ایم این اے نبیل احمد گبول نے چند دن پہلے نیب میں وزیراعلیٰ سندھ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کے خلاف ریفرنس دائر کیا' اس ریفرنس میں نبیل گبول نے چیف منسٹر سندھ پر الزام لگایا: ''ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے ایک بھارتی خاتون سارا سہگل کو سرکاری ہیلی کاپٹر فراہم کیا تھا اور اس خاتون نے اس ہیلی کاپٹر پر عمر کوٹ' لاڑکانہ' تھرپارکر' حیدرآباد اور خیر پور کی سیر کی تھی۔'' سوال پیدا ہوتا ہے چیف منسٹر سندھ نے یہ ہیلی کاپٹر کس قانون کے تحت ایک بھارتی خاتون کو فراہم کیا تھا اور اس جرم پر حکومت اب تک کیوں خاموش ہے؟ آئین اور قانون صدر' وزیراعظم' وزرائے اعلیٰ اور گورنرز کو بھی ایک ایک گاڑی استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے پھر یہ لوگ کس قانون کے تحت چالیس چالیس بلٹ پروف گاڑیاں استعمال کر رہے ہیں؟ اس وقت ہمارے صدر اور وزیراعظم 51 گاڑیوں کے چار چار کانوائے میں سفر کرتے ہیں اور ان کی سیکورٹی کے لیے سڑکوں پر سات سو پولیس اہلکار کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے انہیں یہ سیکورٹی اور یہ سیکورٹی کانوائے کس قانون کے تحت فراہم کیے جاتے ہیں؟ حکومت نے ایئر فورس کے چیف کو ذاتی طیارہ' نیول چیف کو ذاتی بحری جہاز اور بری فوج کے کمانڈروں کو سی ون تھرٹی کی سہولت دے رکھی ہے۔ ہمارے ریلوے کے آئی جی' سیکرٹری اور وزیر کے پاس دو سو گز لمبے سیلون ہیں اور ان سیلونوں میں ان کے دوست احباب اور ''خفیہ'' مہمان سفر کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے ان لوگوں کو یہ سہولت کس قانون کے تحت حاصل ہے اور آج تک قانون نے ان لوگوں کی طرف آنکھ اٹھا کر کیوں نہیں دیکھا؟ سوال پیدا ہوتا ہے ہمارے ریٹائر افسروں تک کی بیگمات سی ون تھرٹی میں سفر کرتی ہیں اور آج تک کسی کو یہ سہولت چیلنج کرنے کی جرأت کیوں نہیں ہوئی اور ہم نے آج تک ان سوالوں کے بارے میں سوچا اور نہ ہی جواب دینے کی زحمت کی لیکن چیف جسٹس کی طرف ہیلی کاپٹر اور طیارے استعمال کرنے کی درخواست جرم بن گئی ہے اور یہ جرم بھی اس وقت سامنے آیا جب حکومت چیف جسٹس سے خفا ہو گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے اگر حکومت جسٹس نے سے خائف نہ ہوتی تو کیا یہ سلسلہ اسی طرح جاری نہ رہتا اور کیا حکومت کسی ''مہربانی'' کے بدلے میں چیف جسٹس کی مراعات میں اضافہ نہ کر دیتی؟

مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگ پاکستان کی بجائے کوفہ کے شہری ہیں اور پچھلے ساٹھ برس سے ہم پر ایسے لوگ حکومت کر رہے ہیں جو کربلا کے کنارے بیٹھ کر مچھر مارنے کے فتویٰ جمع کر رہے ہیں' جو اپنے حمایتوں کا ایمان تک خرید لیتے ہیں' لیکن اختلاف کرنے والوں کو کھانسنے تک کی اجازت نہیں دیتے۔

کل میرے ایک دوست نے کینیڈا سے فون کیا' یہ صاحب اس قسم کے منظر دیکھ کر پانچ برس پہلے ملک چھوڑ گئے تھے' انہوں نے مجھے فون کیا اور دکھی لہجے میں بولے: ''کینیڈا میں چیف جسٹس سب سے محترم اور بااختیار شخص ہوتا ہے' کینیڈا کی پوری پارلیمنٹ' پوری کابینہ' صدر اور ساری سیاسی جماعتیں مل کر چیف جسٹس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکتیں' چیف جسٹس کسی بھی وقت صدر کو عدالت میں طلب کر سکتا ہے اور صدر کو اس کے سامنے سرتابی کی جرأت نہیں ہوسکتی۔'' میرے دوست کا کہنا تھا ''10 مارچ 2007ء کو کینیڈا میں پاکستان کے چیف جسٹس کی غیر فعالیت اور ہاؤس اریسٹ کی خبر پہنچی تو کینیڈا کے لوگ حیران رہ گئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھنا شروع کر دیا' کیا آپ کے ملک میں صدر' چیف جسٹس سے زیادہ بااختیار ہے؟ اور کیا پاکستان میں صدر' چیف جسٹس کو غیر فعال کر سکتا ہے؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔'' میرے دوست نے ذرا سے توقف کے بعد کہ: ''ترقی یافتہ قوموں نے عدالت کو جان بوجھ کر مقننہ' بادشاہ' صدر' وزیراعظم' کابینہ اور بیوروکریسی سے زیادہ اختیارات دے رکھے ہیں' یہ لوگ جانتے ہیں عدالت معاشرے کا وہ فورم ہوتا ہے جس میں تمام لوگ پہنچ سکتے ہیں' لہٰذا اگر ان کی عدالت ملک کے تمام عہدوں سے بلند ہوگی تو عدالت پر عوام کا اعتماد قائم ہوگا' عدالت پر اعتماد نظام کو طاقتور بنائے گا اور ایک طاقتور نظام ملک کو ترقی دے گا۔'' میرے دوست کا کہنا تھا ''تم دنیا بھر کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کا مطالعہ کر لو تمہیں اقوام عالم میں ہر وہ ملک ترقی یافتہ اور مضبوط ملے گا جس میں عدالت آزاد اور عدالتی نظام طاقتور ہوگا اور تم ہر اس ملک کو پسماندہ پاؤ گے جس کا عدالتی نظام کمزور اور حکمران مضبوط ہوں گے۔'' میرے دوست کا کہنا تھا: ''حکومت کی رٹ عدالتوں سے شروع ہوتی ہے اور عدالتوں پر آ کر ختم ہوتی ہے۔''

مجھے اس کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوا' یہ حقیقت ہے پاکستان کا عدالتی نظام نہ صرف کمزور ہے بلکہ اس سے ہمارے عوام کی توقعات بھی ختم ہو گئی ہیں' اب سوال پیدا ہوتا ہے اس نظام کو کس نے کمزور بنایا؟ یقیناً اس کے ذمہ دار ہمارے حکمران ہیں' پاکستان میں بدقسمتی سے 40 برس فوجی حکمران رہے ہیں' لہٰذا اس بگاڑ کی زیادہ تر ذمہ داری فوجی حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے دنیا میں جب بھی کوئی آمر غیر قانونی اور غیر آئینی طریقے سے اقتدار پر قابض ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے عدالت پر قبضہ کرتا ہے' وہ قانون فہم' انصاف پسند اور ایماندار ججوں کو فارغ کرتا ہے اور ان کی جگہ کمزور اور ''معاملہ فہم'' جج تعینات کر دیتا ہے' اس کے بعد وہ ججوں اور عدالتی نظام کو بھی کرپٹ کرتا ہے اس ساری ایکسر سائز کے نتیجے میں عدالتیں اس آمر کو ریلیف دیتی ہیں' وہ اس حکمران کو آئینی شکل دیتی ہیں اور جوں ہی یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے عدالتیں حکمرانوں کا طفیلی ادارہ بن کر رہ جاتی ہیں اور حکمران ججوں اور چیف جسٹس حضرات سے بھی اسی لہجے میں بات کرتا ہے جس طرح وہ اپنے ٹیلی فون آپریٹر سے مخاطب ہوتا ہے۔ تاریخ ثابت کرتی ہے جب یہ صورتحال پیش آتی ہے تو عوام کا عدالت سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ جج کی بجائے حکمرانوں کے پاؤں میں انصاف تلاش کرنے لگتے ہیں۔ آپ پوری دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی جس جس ملک میں عدالتیں مضبوط تھیں' اس ملک میں کبھی مارشل لاء لگا اور نہ ہی کسی شخص کو اقتدار پر قبضے کی جرأت ہوئی۔ مزید آج تک جس ملک میں مارشل لاء لگتے رہے وہ ملک سماجی اور معاشی لحاظ سے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے' آپ یورپ کو دیکھ لیجئے مشرقی یورپ مغربی یورپ سے معاشی اور سماجی لحاظ سے پیچھے ہے' کیوں؟ اس کی واحد وجہ فوجی حکمران تھے' مشرقی یورپ میں پچاس' ساٹھ برس تک آمریت رہی' جبکہ اس کے مقابلے میں فرانس' برطانیہ' جرمنی اور آسٹریا میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی تھی' آپ یورپ میں سپین' اٹلی اور پرتگال کو دیکھ لیجئے۔ یہ تینوں بھی ترقی کی دوڑ میں دوسرے یورپی ملکوں سے پیچھے ہیں۔ اس کی وجہ بھی آمریت اور مارشل لاء تھے' یہ ممالک بھی آج سے تیس چالیس برس پہلے تک یونیفارم کا شکار تھے چنانچہ یہ یورپ کے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے' آج سے تیس چالیس برس پہلے ان ملکوں کے حکمران عدالت کے زیر انتظام آ گئے' چنانچہ اب یہ ملک بھی ترقی کر رہے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں 2007ء میں صدر چیف جسٹس کو گھر بلا لیتے ہیں اور اسے غیر فعال کر کے گھر میں پھینک دیا جاتا ہے' چنانچہ آج اس کا یہ نتیجہ ہے لوگوں کو انصاف کے لیے صدر کے پاؤں میں جھکنا پڑ رہا ہے یا پھر جامعہ حفصہ کی طالبات انصاف کے لیے ڈنڈے لے کر سڑک پر نکلنے پر مجبور ہیں۔

یہاں پر عرض کرتا چلوں کہ سپریم کورٹ کے ہر چیف جسٹس کو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا نوٹس لینے کا اختیار حاصل ہوتا ہے' مگر افتخار محمد چودھری شاید پہلے چیف جسٹس تھے جنہوں نے اس کا بھرپور استعمال کیا اور یوں انہوں نے کئی ہزار لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کیے۔

انہوں نے سپریم کورٹ میں الگ سے انسانی حقوق سیل قائم کیا جس میں ہزاروں درخواستوں پر دادرسی کی گئی۔ سپریم کورٹ کے سابق جسٹس ناصر اسلم زاہد کا کہنا ہے کہ ازخود نوٹس ان ممالک میں لیے جاتے ہیں جہاں انتظامیہ اور قانون ساز ادارے ناکام ہوجاتے ہیں۔ بدانتظامی ہو' اچھی حکمرانی نہ ہو اور عوام کو انصاف نہ ملتا ہو۔

پاکستانی معاشرے میں بااثر سمجھے جانے والے پولیس افسروں' سردار' وڈیرے یا بیوروکریسی سب ہی کو افتخار محمد چودھری کی عدالت میں جوابدہ ہونا پڑا تھا۔

حیدرآباد پریس کلب کے سامنے انصاف کی آس لگائے بیٹھے ہوئے منو بھیل کے خاندان کی بازیابی کی کوششوں میں انہوں نے آئی جی سندھ کو کٹہرے میں لاکھڑا کر دیا تھا۔

کراچی میں گزشتہ سال ماہ اگست میں جب پولیس نے ایک مزدور رسول بخش کو ڈاکو قرار دے کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کے ورثاء کو چار دن کے بعد لاش دی گئی' اس واقعے کا اسلام آباد کے ایوانوں نے تو کوئی نوٹس نہیں لیا تھا' مگر جسٹس افتخار محمد چودھری کے نوٹس لینے پر اعلیٰ پولیس حکام سمیت کوئی سولہ اہلکاروں کو جیل جانا پڑا تھا۔

انہوں نے سندھ میں روایتی سرداری نظام پر بھی نقب لگائی۔ جیکب آباد کے علاقے ٹھل میں جب ایک جرگے میں خون کے بدلے پانچ بچیوں کا رشتہ دیا گیا تو اس فیصلے میں شریک تمام افراد کو اسلام آباد میں سپریم کورٹ کے سامنے حاضر ہونا پڑا تھا۔

اس طرح حیدرآباد میں قاسم آباد پولیس نے پانی کی مشین چوری کرنے کے الزام میں چھ سالہ سعید' تیرہ سالہ اسد اور مزمل کو گرفتار کیا' ہتھکڑیاں پہنے ہوئے بچوں کی فلم جب ٹی وی چینل پر دکھائی گئی تو رات کو ہی چیف جسٹس نے اس کا نوٹس لیا اور حیدرآباد کی ماتحت عدالت کے جج تھانے پہنچے جہاں انہوں نے چھ سالہ سعید کو اسی وقت رہا کروایا۔ دوسرے روز دیگر دو بچوں کو بھی آزاد کرا دیا گیا۔

ان کے مطابق یہ جوڈیشل ایکٹوزم نہیں بلکہ جوڈیشل ہیومن ایکٹوزم' ہے عدلیہ کے ادراک سے یہ آگاہی ہوئی کہ ان مسائل کو اٹھایا جاسکتا ہے' ان پر بات کی جاسکتی ہے۔

وہ افتخار محمد چودھری ہی تھے جن کی بدولت مرضی کی شادی کرنے کے بعد پانچ سال سے جیل میں پڑی مسمات سوڈہی اور حکیم کو رہائی ملی تھی۔ میاں بیوی کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ دائر تھا۔ چیف جسٹس نے ایک این جی او کی درخواست پر اس کا نوٹس لیتے ہوئے روزانہ سماعت کا حکم جاری کیا تھا۔

کنری کی نادرہ پروین کو ہراساں کرنے کا بھی سپریم کورٹ نے نوٹس لیا' جس میں رکن صوبائی اسمبلی کے والد اور تحصیل ناظم کو فریق بنایا گیا تھا' نادرہ ابھی تک پنجاب میں رہائش پذیر ہیں۔

عورت فاؤنڈیشن کے لالہ حسن پٹھان کا کہنا ہے کہ افتخار محمد چودھری کے اقدام سے لوگوں میں ہمت کا جذبہ پیدا ہوا تھا اور ٹھل میں پانچ لڑکیوں کے جرگے کا ازخود نوٹس لینے کا یہ اثر ہوا کہ جب سکھر میں ایک جرگہ ہوا تو پولیس نے خود اس کا مقدمہ دائر کر دیا' اس طرح ٹنڈو آدم میں جب ایک سابق ایم این اے نے پانچ سالہ بچی کا جرگے کے فیصلے میں رشتہ دے دیا اور اس کا عدالت نے نوٹس بھی نہیں لیا مگر پولیس نے اسی خوف میں اس کا مقدمہ درج کر لیا حالانکہ دونوں فریقوں میں صلح بھی ہوگئی تھی۔

حسن پٹھان کا کہنا ہے کہ جب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سے ایسے مقدمات میں لوگوں کو ریلیف ملنے لگا تو نچلی عدالتوں نے بھی لوگوں کو ریلیف دینا شروع کر دیا۔

اس طرح کوٹ غلام محمد میں بجلی کی تار سے کرنٹ لگنے پر تین بچوں کی ہلاکت ہو یا ٹنڈو جان محمد میں ایک خاتون کی ہسپتال بند ہونے کی وجہ سے زچگی کے دوران موت کا معاملہ ہو' لاپرواہی برتنے والے دو ڈاکٹروں اور واپڈا ملازمین کو معطلی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ایسے کئی مقدمات تھے جو سول کورٹ جیسی عدالتوں کی سماعت کے قابل تھے مگر انصاف سے مایوس افراد کو افتخار محمد چودھری نے امید کی کرن

دکھائی' کچھ لوگوں کو یہ شکایت رہی تھی کہ سپریم کورٹ بڑے معاملات کے بجائے چھوٹے معاملات نمٹا رہی ہے۔

سپریم کورٹ کے سابق جسٹس ناصر اسلم کا کہنا ہے کہ عوام کے تو چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں' بڑے مسئلے بڑے لوگوں کے لیے ہوتے ہیں' انہیں تو انصاف مل بھی جاتا ہے مگر عام آدمی کو انصاف نہیں ملتا ہے۔

انہوں نے بتایا کہ ناکوں پر پولیس کا پریشان کرنا' یوٹیلیٹی کے مسائل' بچے کے داخلے' امتیازی سلوک' حق تلفی' یہ چھوٹے چھوٹے مسائل ہی عوام کے مسائل ہیں جو کوئی سننے والا نہیں ہے۔ان کا کہنا تھا کہ عوام کو اگر پولیس اور حکومتی حکام سے انصاف مل جائے تو پھر چھوٹی موٹی چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سپریم کورٹ کی سالانہ رپورٹ کے مطابق سپریم کورٹ میں 30 جون 2006ء تک اڑتیس ہزار ایک سو انتالیس مقدمات زیر سماعت تھے جن میں سے تیس ہزار تین سو ترپن نمٹا دیئے گئے۔

یہ تو وہ مقدمات تھے جو جسٹس افتخار محمد چودھری کی سربراہی میں ان کے ساتھی ججوں نے نمٹائے مگر انہوں نے بحیثیت چیف جسٹس ہزاروں کی تعداد از خود نوٹس لیے اور عام آدمی کی ایک سادہ درخواست پر احکامات جاری کر کے عام آدمی کو انصاف فراہم کیا۔

سچ تو یہ ہے کہ انہی اقدامات نے انہیں ایک عام آدمی کا جج بنا دیا۔لیکن چیف جسٹس کا فعال اور عوامی مسائل میں دلچسپی لینا اس لیے پسند نہ آیا کہ ان کے درج ذیل چار فیصلے حکمرانوں کے لیے انتہائی گراں گزرے۔

1- سٹیل ملز کی نجکاری کے سودے کی منسوخی۔

2- گوادر میں با اثر اور اعلیٰ سرکاری حکام کو سرکاری زمین کی الاٹمنٹ کی منسوخی۔

3- ہر سال سرکاری سطح پر منائی جانے والی بسنت کے خلاف پابندی (جسے سپریم کورٹ کے واضح احکام کے باوجود بڑے اہتمام سے منایا گیا اور تقریباً 8 انسانی جانیں بسنت کی نذر ہوئیں۔

4- گزشتہ کئی سالوں سے گمشدہ افراد کی بازیابی کے لیے سپریم کورٹ کی جانب سے حکومت پر مسلسل دباؤ تھا۔جن کے لواحقین سڑکوں پر احتجاج کرتے کرتے عدالت عظمیٰ تک پہنچے تھے۔افتخار چودھری چیف جسٹس کی حیثیت سے اس مسئلے کے حل کے لئے خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں۔

ان فیصلوں پر حکمرانوں کی جانب سے کھلے عام ردعمل تو ظاہر نہیں کیا گیا مگر دبے لفظوں میں انتقام اور غصے کا عنصر حکمرانوں کے اس انتہائی فیصلے کی بنیاد بنا جس پر جسٹس افتخار محمد چودھری کو چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے سے غیر فعال قرار دیا گیا۔ابھی حکومتی ریفرنس پر سپریم جوڈیشل کونسل میں سماعت جاری ہے' جس پر قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

افتخار محمد چودھری 12 دسمبر 1948ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی' ایل ایل بی کی ڈگری حیدر آباد سے حاصل کی' 1974ء میں باقاعدہ وکالت کا آغاز کیا' 1976ء میں بطور وکیل ہائی کورٹ اور 1985ء میں سپریم کورٹ کے وکیل کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہوئے۔دوبار بلوچستان بار کونسل کے وائس چیئرمین کے طور پر کام کیا۔1989ء میں بلوچستان کے ایڈووکیٹ جنرل بنائے گئے۔بلوچستان بار ایسوسی ایشن اور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے ایک ایک بار صدر بھی منتخب ہوئے۔ 1990ء میں بلوچستان ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔اس دوران انہیں بلوچستان لوکل کونسل الیکشن اتھارٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔اس حیثیت سے انہوں نے دوبار لوکل پارٹیز الیکشن کرائے' دوبار بلوچستان ریڈ کریسنٹ سوسائٹی کے چیئرمین کے عہدے پر تعینات رہے' 1999ء میں بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے' 4 فروری 2000ء کو سپریم کورٹ کے جج تعینات کیے گئے۔30 جون 2005ء کو چیف جسٹس آف پاکستان کی حیثیت سے حلف اٹھایا' آپ عدالت عظمیٰ کے بیسویں چیف جسٹس ہیں۔ انہوں نے طویل عرصے (12 دسمبر 2011ء) تک اس عہدے پر رہنا تھا۔وہ خود کم بولے مگر ان کے فیصلے بولتے چلے گئے' جنہوں نے ایوان اقتدار پر رعشہ طاری کر دیا' پھر آئین کی پاسداری نے ''آئینی تلوار'' کا سہارا لیا۔چیف جسٹس کو بلا کر ''باعزت رخصتی'' کے لیے کہا گیا مگر

وہ تیار نہ ہوئے اور پھر شاہراہ دستور پر چشم فلک نے وہ ''تاریخ ساز'' منظر دیکھا جب ''منصف اعلیٰ'' کے بال ایک ایسے افسر کے ہاتھ میں تھے جسے ایک مقدمہ میں غلط بیانی کرنے پر ڈانٹ کھانی پڑی تھی' احتجاج کرنے والوں کے ہاتھ میں اب جو بیز تھے ان پر یہ تحریر تھا "Justice for chief justice" (چیف جسٹس کے لیے انصاف) رات گئے تک دفتر میں کام کرنے والے' کیس ملتوی کرنے پر پابندی لگانے والے' اپنے سوموٹو اختیار کو عوام کے لیے وقف کرنے والے' سپریم کورٹ میں پہلی بار حقوق انسانی کا سیل قائم کرنے والے اور آئی جی' پولیس افسران' جاگیرداروں اور وزراء کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنے والے چیف جسٹس کو انصاف کی تلاش میں دیکھا گیا تو وکلاء سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔ گوئبلز کے پیروکاروں نے دن رات ''سچ'' بولتے ہوئے زمین و آسمان ایک کر دیئے مگر عوام نے کسی ایک الزام کو بھی پرکاہ کی حیثیت نہ دی۔ طاقت کے استعمال نے جذبوں کو مہمیز دی۔ یہ کمال اس انکار کا ہے جو چیف جسٹس نے کیا۔ چیف جسٹس افتخار چودھری بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں۔

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

(عشق نے میری فریاد سن کر ہنگامہ کر دیا ورنہ اس قبرستان میں کب کوئی شور اٹھتا ہے۔)

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں جاوید چودھری' ریاض سہیل اور حافظ سجاد قمی کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔



چیف جسٹس افتخار محمد چودھری

کی معطلی کے محرکات

وہ امریکہ ہو گا جہاں سپریم کورٹ کے جج تاحیات منتخب ہوتے ہیں اور جب تک کوئی جج ذاتی وجوہات یا خرابی صحت کے باعث از خود ریٹائرڈ نہ ہو جائے تو حکومت اسے برطرف نہیں کر سکتی۔ لیکن پاکستان کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہاں بیٹھے بٹھائے پوری کی پوری حکومت اور اسمبلیاں گھر بھیج دی جاتی ہیں تو فرد واحد کی کیا مجال ہے کہ وہ خود کو ناگزیر اور دائمی تصور کرے۔

وطن عزیز میں سب سے پہلے جسٹس سید اخلاق حسین کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس بھیجا گیا تھا جس کی بنا پر انہیں گھر بھیج دیا گیا یہ 1960ء کا واقعہ اور ایوبی دور کی ابتداء تھی۔ ان کے بعد جسٹس شیخ شوکت علی پر کرپشن کا الزام لگا۔ مقدمہ چلا۔ وہ ہار گئے اور گھر چلے گئے۔ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس فضل غنی عقلمند تھے۔ وہ خود پر لگائے گئے الزام کی تاب نہ لا سکے اور مستعفی ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے نواب محمد احمد خان کیس میں ذوالفقار علی بھٹو کو بری کرنے والے جج جسٹس غلام صفدر شاہ کو نہ صرف نوکری سے نکالا بلکہ دنیا سے ہی نکال دیا گیا وہ کسمپرسی کے عالم میں پشاور سے خچر پر بیٹھ کر پہلے افغانستان اور وہاں سے انگلستان پہنچ گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ نواز شریف کی حکومت میں سپریم کورٹ پر باقاعدہ چڑھائی ہوئی' سینکڑوں افراد نے جن میں نامی گرامی لیڈر صاحبان بھی شامل تھے۔ اسلام آباد میں سپریم کورٹ کی عمارت پر حملہ کر دیا اور اس وقت کے چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ نے بمشکل چھپ کر اپنی جان بچائی بعد ازاں انہیں برطرف کر دیا گیا۔ اب تازہ ترین واقعہ گزشتہ روز سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار چودھری کی معطلی کا ہے۔ جس نے ایک بار پھر بحث کا پنڈورا باکس کھول دیا ہے اور بظاہر انتظامیہ سے عدلیہ کی لڑائی کا شاخسانہ ہے۔

16 فروری 2007ء کو نعیم بخاری ایڈووکیٹ نے چیف جسٹس افتخار چودھری کو ایک خط لکھا تھا جس میں ان پر اپنے عہدے کے وقار کے منافی اقدامات کرنا' اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے سی ایس ایس میں فیل ہونے والے اپنے بیٹے کو سفارش کر کے بطور اے ایس پی بھرتی کرانے کے الزامات لگائے گئے تھے۔ نعیم بخاری ایڈووکیٹ نے اپنے خط میں چیف جسٹس افتخار چودھری کو اس بات پر بھی مورد الزام ٹھہرا دیا تھا کہ ان کے دیئے گئے فیصلوں میں تضاد بھی پایا جاتا ہے جو کہ اس منصب کے شایان شان نہیں ہے۔ متعدد الزامات کے ساتھ ساتھ جسٹس افتخار محمد چودھری کے بیٹے ارسلان کو رولز اینڈ ریگولیشن سے ہٹ کر ملازمت دلانے کے الزام کے بعد خیال کیا جا رہا تھا کہ جسٹس افتخار چودھری نعیم بخاری کے خط کے جواب میں ان پر ہتک عزت کا کیس دائر کریں گے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اب تک ایسا نہ ہوا جس کی وجہ سے ان کی پوزیشن خراب ہوئی۔ اسی طرح ان کے بیٹے ارسلان نے بھی میڈیا میں کہا تھا کہ ان الزامات کا جواب دیں گے اور باقاعدہ ثبوت پیش کریں گے مگر وہ بھی ایسا نہ کر سکے لہٰذا 9 مارچ کو صدر پاکستان نے آئین کے آرٹیکل 209 کے تحت ان کے خلاف تادیبی کارروائی کا حکم دیا۔

بعض سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ جسٹس افتخار محمد چودھری اتنے مضبوط جج نہیں تھے مگر انہوں نے کچھ عرصہ قبل اسٹیل ملز کی نجکاری کے حوالے سے جو فیصلہ دیا تھا' اسی طرح پولیس اور بیوروکریسی کے رویے اور کارکردگی کے بارے میں جو ریمارکس دیئے تھے ان کے خلاف کارروائی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف اختیارات کا ناجائز استعمال کے حوالے سے عدلیہ کی تاریخ میں یہ ایک ایسا افسوسناک اور چونکا دینے

والا واقعہ ہے جس کی اس سے پہلے کوئی مثال موجود نہیں۔ انہوں نے اسٹیل مل کی نجکاری اور گمشدہ لوگوں کے بارے میں جو فیصلے یا رولنگ دی کہا جاتا ہے کہ حکومت اس سلسلے میں ان سے ناراض تھی' تاہم یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔ اس میں اگرچہ کوئی ٹھوس حقیقت نہیں' مگر اس کے علاوہ بھی چیف جسٹس افتخار محمد چودھری مفاد عامہ کے بعض معاملات میں یا معاشرتی وسماجی برائیوں' بے ضابطگیوں اور کرپشن کے بارے میں از خود نوٹس لے کر جو فیصلے کر رہے تھے یا جس طرح پولیس کی نااہلی کے بارے میں انہوں نے کچھ فیصلے دیئے اس کے باعث عوام میں ان کی مقبولیت بڑھتی جارہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اختیارات کا ناجائز استعمال اور سرکاری سہولتوں کے ناجائز استعمال کے الزام میں جب صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے ان کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں جو ریفرنس پیش کیا ہے بعض عوامی حلقوں کے نزدیک اسے درست اور انصاف پرمبنی تصور نہیں کیا جارہا۔

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری یا ان سے قبل مختلف ادوار میں جن جج صاحبان کے خلاف حکومت نے کارروائی کی اسے اپوزیشن حلقوں نے ہمیشہ ناپسندیدہ اور سیاسی انتقام قرار دیا ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ ریاست کے چاروں ستونوں عدلیہ' انتظامیہ' مقننہ اور میڈیا کے درمیان کم سے کم اختلاف اور زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی نہ ہوتو پھر تصادم جنم لیتا ہے اور اس ٹکراؤ میں جو طاقتور ہو اس کی جیت ہوئی ہے۔ چیف جسٹس افتخار چودھری نے بہت سے بولڈ اقدامات بھی اٹھائے جن میں پاکستان اسٹیل کی اونے پونے نیلامی کو روکنا' گمشدہ افراد کے لئے از خود نوٹس لینا اور انتظامیہ و پولیس کی زیادتیوں پر کارروائی جیسے امور شامل ہیں لیکن وہ اپنے صاحبزادے ڈاکٹر ارسلان افتخار کے کیس میں مات کھا گئے جنہیں میرٹ سے کم نمبروں کے باوجود بولان میڈیکل کالج میں داخلہ ملا۔ پھر بلوچستان کے محکمہ صحت میں ملازمت مل گئی۔ تین مرتبہ سی ایس ایس کے امتحان میں ناکامی کے باوجود ایف آئی اے میں تعینات کر دیا گیا اور معمول سے ہٹ کر انہیں پنجاب پولیس میں اے ایس پی کی ٹریننگ پر بھیج دیا گیا۔

اس عہدے کیلئے سی ایس ایس میں کامیابی یا پھر پولیس سروس میں ہونا ضروری ہے دیگر الزامات کا ذکر سپریم کورٹ کے سینئر وکیل نعیم بخاری نے چیف جسٹس افتخار چودھری کے نام اپنے خط میں کیا ہے جس کا متن مندرجہ ذیل ہے۔

جسٹس افتخار محمد چودھری

چیف جسٹس

سپریم کورٹ آف پاکستان' اسلام آباد

مائی لارڈ!

میں یہ خط سپریم کورٹ کے ایک معاون کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ میں 1948ء سے سپریم کورٹ رجسٹرڈ ہوں جبکہ 1972ء سے ہائی کورٹ کے وکیل کے طور پر رجسٹرڈ ہوں۔ ایک اٹارنی کی حیثیت سے میں قانون کے پیشے سے حاصل ہونے والی آمدنی سے اپنے دیگر ہم پیشہ ساتھیوں سے کہیں زیادہ ٹیکس ادا کرتا ہوں جن میں سے بہت سارے ترقی کر کے جج بن چکے ہیں اور قانون کی عملداری کو یقینی بنانے کے حوالے سے بھی خود کو حصہ دار سمجھتا ہوں۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے بہت سارے جج صاحبان مجھے کئی دہائیوں سے جانتے ہیں اور ان کو میرا تعارف ایک ایسے شخص کی حیثیت سے ہے جو انسانی غلطیوں اور خامیوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ عدالت میں میرا نقطہ نظر ہمیشہ عاجزانہ رہا۔ میں عدالت کا احترام اس لئے کرتا ہوں کہ میں پورے خلوص سے سمجھتا ہوں کہ ایسا کیا جانا چاہیئے نہ کہ اس لئے کہ یہ ایک مجبوری ہے۔ جب میں جج کو مائی لارڈ کہہ کر پکارتا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ایسا کہنا مجبوری ہے بلکہ اس لئے کہ میں خود یہی لفظ استعمال کرنا چاہتا ہوں میں عدلیہ کو ایک ایسے مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں جسے سر اٹھا کر دیکھا جائے اور اس کو یہ بلندی اس کے وقار، ہمدردی اور انصاف کی بناء پر عطا ہو۔ میں نے اپنے ملک کی سپریم کورٹ کو جسٹس حمودالرحمٰن، جسٹس یعقوب علی خان، جسٹس ایس انوار الحق اور جسٹس حلیم احمد کی سربراہی میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ 70ء اور 80ء کی دہائی کا زمانہ ہے۔

میں جسٹس سجاد علی شاہ کی قبل از وقت رخصتی کا بھی گواہ ہوں اور اس بات سے بھی آگاہ ہوں کہ اس وقت کے وزیراعظم کئی ججوں کو مختلف

ہتھکنڈوں سے مجبور کرتے رہے تھے اور وہ سپریم کورٹ پر حملے کا موجب بھی بنے۔

جس انداز میں جسٹس ارشاد حسن خان نے سپریم کورٹ کو چلانے کی کوشش کی اور جیسا سلوک جسٹس شیخ ریاض سے کیا گیا جب وہ چیف جسٹس تھے ان حالات نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔

میں اس اقدام پر بھی دہل کر رہ گیا تھا جب یہ فیصلہ کرنے کے لئے پانچ ججوں پر مشتمل بینچ قائم کیا گیا تھا کہ آیا ججوں کے عرصہ ملازمت میں کمی کا فیصلہ آئینی ہے یا نہیں۔ یہ سیدھا سیدھا آپ کی تقرری کو روکنے کی کوشش تھی۔ میں آپ سے پہلے جسٹس امیر الملک مینگل کو چیف جسٹس بنانے کے فیصلے کے بھی خلاف تھا۔ اپنی بساط کے مطابق (جو بہت محدود ہے) میں مکمل طور پر آپ کو چیف جسٹس بنانے کے حق میں تھا۔ جسٹس جاوید بٹر کے سامنے میری پوزیشن بالکل واضح تھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ میں سپریم کورٹ کے وقار کو بلند کرنے کی تمام تر صلاحیتیں ہیں لیکن افسوس ایسا نہ ہوسکا۔

مجھے آپ کی طرف سے پروٹوکول کے اصرار پر بھی کوئی تشویش نہیں (حالانکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک چیف جسٹس کو عوام کی نظروں سے دور نہیں ہونا چاہئے۔ پولیس اسکارٹ، جھنڈے اور ہوٹر محض نمائش ہے اس کا چیف جسٹس کے مرتبے کی روح سے کوئی تعلق نہیں)۔

پشاور میں آپ کی گارڈ آف آنر کے لئے خواہش مجھے بڑی دلچسپ لگی۔ اپنے لئے مرسیڈیز کار کا انتظام (یا شاید وہ ایک سے زیادہ کاریں تھیں)، ملتان میں فاتحہ خوانی پر جانے کیلئے حکومت پنجاب کے ہیلی کاپٹر کا استعمال، حیدرآباد ہائی کورٹ کی تقریب میں شرکت کیلئے حکومت سندھ کے طیارے کا استعمال، چیف جسٹس کی رہائش گاہ کی تزئین وآرائش پر بھاری رقوم کا استعمال، اپنے لئے لاہور میں سپریم کورٹ کے ججوں کے گیسٹ ہاؤس کے پورے ایک ونگ کو ریزرو کروانے اور چیف جسٹس سندھ کی سرکاری رہائش گاہ کو سندھ میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی رہائش گاہ میں بدل دینے کے اقدامات میرے لئے بہت اذیت ناک ہیں۔ اس آخری اقدام کے نتیجے میں چیف جسٹس سندھ جو گورنمنٹ کالج میں میرے ہم جماعت رہے، کو اپنے والد کے گھر کی نچلی منزل میں منتقل ہونا پڑا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ باپ کے گھر کی نچلی منزل میں رہنے پر انہیں کوئی پریشانی بھی نہیں۔

میں اس بات پر بھی پریشان نہیں ہوں کہ ڈاکٹر ارسلان (آپ کا بیٹا) نے سول سروس کے امتحان میں انگریزی کے پرچے میں سو میں سے سولہ نمبر لئے اور یہ کہ بلوچستان ہائی کورٹ میں ان کے خلاف کوئی کیس موجود ہے، اور یہ کہ انہیں بلوچستان کے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ سے ایف آئی اے میں منتقل کیا گیا، یا یہ کہ انہوں نے پولیس اکیڈمی سے ٹریننگ حاصل کی اور یہ کہ وہ بی ایم ڈبلیو سیون سیریز کی کار میں دیکھے جاتے ہیں اور یہ بھی کہ ان کے خلاف قومی احتساب بیورو میں شکایت کی گئی ہے۔ میرے تحفظات اور احتجاج ذرا مختلف نوعیت کے ہیں۔

مجھے یہ پریشانی ہے کہ سپریم کورٹ کو آپ کے بیٹے کے بارے میں وضاحتی بیان جاری کرنا چاہئے۔ مجھے اس بات کی پریشانی ہے کہ جسٹس ریٹائرڈ وجیہہ الدین احمد کو اس بات سے روکنا چاہئے تھا کہ وہ آپ کو ٹی وی پر آکے یہ نصیحت نہ کریں (شیشے کے گھروں میں رہنے والوں کو دوسروں پر پتھر نہیں پھینکنے چاہئیں) مجھے اس بات کی پریشانی ہے کہ چیف جسٹس کو چاہئے تھا کہ وہ ڈاکٹر ارسلان کے معاملے پر مسٹر شکیل الرحمان کو اپنے چیمبر میں بلاتے۔ میں اس بات پر دہل کے رہ جاتا ہوں کہ آپ عدالت میں ایک فیصلہ سناتے ہیں اور تحریری فیصلہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ پارلیمانی امور کے وزیر ڈاکٹر شیر افگن نیازی کی طرف سے اپیل کی اجازت طلب کرنے کی پٹیشن (جس میں مدعا علیہ کے وکیل مسٹر خالد انور اور مسٹر قادر سعید تھے) آپ نے کھلی عدالت میں اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا جبکہ تحریری حکم میں آپ نے اپیل کی اجازت دے دی۔

15 فروری 2007ء کو مسٹر فخر الدین جی ابراہیم نے یہ شکایت کی کہ کھلی عدالت میں آپ نے ان کی اپیل کو منظور کر لیا لیکن تحریری حکم میں آپ نے اسے رد کر دیا۔ اگر قانون و پارلیمانی امور کے سابق وزیر خالد انور اور فخر الدین جی ابراہیم جیسے سینئر وکیل کے ساتھ یہ کیا جاتا ہے تو نسبتاً کم معروف وکلاء کی حالت تو یقینی طور پر خراب ہوگی۔

میرے تحفظات اس طریقہ کار کے بارے میں ہیں جن کے تحت پاکستان کی سب سے اعلیٰ عدالت آپ کی سربراہی میں عدل وانصاف کرنے

کی کوشش کر رہی ہے۔

مائی لارڈ! آپ کے ہاتھوں وکلاء کا وقار مسلسل مجروح ہو رہا ہے۔

ہمارے ساتھ انتہائی سختی اور بدتمیزی سے پیش آیا جا رہا ہے۔ ہماری بات تک نہیں سنی جاتی۔ ہمیں اپنا مقدمہ درست طریقے سے پیش ہی نہیں کرنے دیا جاتا۔ کسی کے لئے صحیح معنوں میں وکالت کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی۔ بار روم میں عدالت نمبر 1 (کورٹ نمبر 1) کے لئے بچڑ خانہ کی اصطلاح عام ہو چکی ہے۔ آپ کی سربراہی میں بینچ نے ہمیں زمین کے ساتھ لگا دیا۔ ہمیں اب تک آپ کی جانب سے تکبر، غرور اور جارحیت کے سوا کچھ نہیں ملا۔ آپ یہ کہتے ہوئے کہ "کہ اسے رد کیا جاتا ہے" فائلیں بھی اٹھا کر پھینک چکے ہیں۔

لیکن یہ جارحانہ پن ہر ایک کے لئے نہیں، جب شریف الدین پیرزادہ آپ کے سامنے آتے ہیں تو آپ کا سارا جلال ہوا ہو جاتا ہے اور زہر کی جگہ شہد لے لیتا ہے۔

قصہ مختصر! ہمیں آپ کی عدالت میں پرلے درجے کے امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ میں اس معاملے کو نہیں اٹھا رہا جس کا تعلق ان بدقسمت پولیس اور سول حکام سے ہے جنہیں عدالت میں طلب کیا جاتا ہے، ذلیل کیا جاتا ہے اور یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ "یہ سپریم کورٹ ہے"۔

جس طرح سے آپ عزت مآب مقدمات کی سماعت فرماتے ہیں، وہ طریقہ کار قیام عدل کے لئے بالکل مناسب نہیں۔ درحقیقت ضوابط کے تحت کارروائی میں رکاوٹ ڈال کر سپریم کورٹ خود توہین عدالت کا مرتکب ہو رہی ہے۔

میں آپ عزت مآب کی عدالت میں بنیادی حقوق کے تمام مقدمات کی تشہیر پر بھی دل گرفتہ ہوں۔ سپریم کورٹ میں شنوائی سے قبل ان مقدمات کو بڑی آسانی سے ڈسٹرکٹ اور سیشن ججوں کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ میں اس بات پر اور بھی دل گرفتہ ہوں کہ میڈیا میں جس انداز سے ایک خاتون کی بازیابی کی تشہیر کی گئی، بار روم میں اس واقعہ کے لئے "میڈیا سرکس" کی اصطلاح استعمال کی گئی۔

مائی لارڈ! میری اس ہرزہ سرائی سے شاید آپ غضب ناک ہو جائیں اور ویسے بھی آپ ایک لمحے میں غضب ناک ہونے کی شہرت رکھتے ہیں لیکن اس پر غور فرمائیے۔ شاید آپ ان جذبات و احساسات سے آگاہ نہیں ہیں جو آپ کے جج ساتھی آپ کے بارے میں رکھتے ہیں۔

مائی لارڈ! قبل اس کے کہ آپ کے ساتھی جج ہی آپ کے خلاف بغاوت کر دیں (جیسا کہ مسٹر سجاد علی شاہ کے معاملے میں ہوا) قبل اس کے کہ بار متحد ہو کر آپ کے خلاف کھڑا ہو جائے اور یہ سارا معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل میں پہنچ جائے، شاید ابھی وقت ہے کہ اس صورت حال کی تصحیح کر لی جائے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میں وہ دانائی اور جرأت ہے کہ آپ اپنے طرز عمل میں تبدیلی لے آئیں جس کے باعث سپریم کورٹ کا وقار اور ہمدردانہ عدل کرنے کی شہرت بحال ہو جائے۔ آپ کا خیر خواہ نعیم بخاری ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان۔



چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس

TEXT OF PRESIDENTIAL REFERENCE AGAINST CJ

Following is the text of presidential reference before the Supreme Judicial Council, Pakistan, Islamabad under Article 209 of the constitution.

Respectfully sheweth: The facts and circumstance necessitating this Reference by the President of the Islamic Republic of Pakistan ("Pakistan") under Article 209 of the Constitution, briefly stated, are as under:

(I) the Prime Minister of Pakistan on receipt of information from several source with respect to the conduct of Mr. Justice Iftikhar Muhammad Chaudhry, Th Chief Justice of Pakistan (hereinafter referred to as, "the learned judge") was pleased to advise the President of the Islamic Republic of Pakistan to "dire the Supreme Judicial Council of Pakistan in exercise of its powers under Article 209 of the Constituion, to inquire into the matter and report to the President whether the learned judge has been guilty of misconduct and further, whether he should be removed from office?

(II) The advice of the Prime Minister was, inter alia, based on the following:

1. Dr. Arsalan Iftikhar is one of the sons of the learned judge. As narrated in paragraph 2 to 25, the learned judge committed misconduct by employing position to gain undue advantage for Dr. Arsalan Iftikhar. To secure this end he committed and was responsible for the commission of a number of unlawful acts. That all the acts narrated in paragraphs 2 to 25 were committ as a result of his influence and on account of the demands made by him an the pressure exerted by him. He unlawfully used his position as a judge and Chief Justice of the Supreme Court of Pakistan to influece, harass and intimidate all concerned and compelled them to act in an unlawful manner. Such conduct is unbecoming a judge and is particularly reprehensible in the case of the Chief Justice of Pakistan.

2. Dr. Arsalan Iftikhar sought admission of Bolan Medical College in the year 1996. Having secured 639 marks with an overall "C" grade in his Intermedi Examinations he could not be admitted on merit. The threshold being 750 marks. The Chief Minister of Balochistan was approached who nominated him, "for admission in 1st year MBBS class in Bolan Medical College, Que against leftover foreign vacant seats/special seats."

3. On 22 June 2005 Dr. Arsalan Iftikhar was appointed as Medical Officer/Demonstrator in the Institute of Public Health, Quetta.

4. On 18 July 2005, a few days after Dr. Arsalan Iftikhar was so appoined, the Chief Minister of Balochistan passed the following order: "Dr. Arsalan Iftikha Medical Officer, presently posted as Demonstrator, Institute of Publich Hea Quetta be transferred and posted as Section Officer (Technical) in Health

department with immediate effect in the interests of public service. Please issue notification." [Emphasis supplied]

The Chief Secretary, Balochistan, to whom these orders were addressed directed these to the Health Department on that very day (18 July 2005).

5. The Health Department on 10 August 2005 referred the case to the Service and General Administration Department ("S&GAD") as the authority "for posting/transfer of Secretariat staff is S&GA Department."

6. On 11 August 2005, in a Summary for the Chief Minister, The S&GAD poi out that "no...post in Technical quota is available against which Dr. Arsalan could be considered for posting as Section Officer." It was, however pointed out that 07 posts of Section Officers against the "quota of initial recruitment are vacant", the case for placing the requisition of these posts with the Balochistan Public Service Commission was being processed separately. It was "proposed that Dr. Arsalan Iftikhar may be considered for posting as Section Officer against one of the vacant post as a temporary arrangement."

7. On 15 August 2005 a notification was issued to the effect that Dr. Arsalan Iftikhar Demonstrator in Institute of Public Health, Quetta was "transferred a posted as Section Officer (Dev.) in Health Department, against exist- ing vacancy with immediate effect until further orders".

[Emphasis supplied]. It may be stated that as was pointed out in the Summary to the Chief Minister, there was no existing vacancy. The 07 vacancies had to be filled by initial recruitment through the Balochistan Pub Service Commission. What was proposed was that at best Dr. Arsalan Iftikh be temporarily accommodated against one of these vacancies, till it was fille by a suitable candidate by the Balochistan Public Service Commission.

8. Nine days before the notification of 15 August 2005 was issued, the Ministry of Interior, Government of Pakistan addressed a letter on 6 August 2005 to the Chief Secretary Government of Balochistan: The servi- ces of Dr. Arsala Iftikhar, as BS-17 officer of the Health Department, Government of Balochistan are required to be utilized in FIA in public interest. [Emphasis supplied]

2. It would be highly appreciated if you could place the services of Dr. Arsala Iftikhar at the disposal of the Ministry of Interior for posting in FIA.

On 13 August 2005, two days prior to the notification of 15 August 2005, the S&GAD, Government of Balochistan conveyed to the Ministry of Interior, Government of Pakistan, its "no objection for placing the services of Dr. Arsalan Iftikhar (Health/B-17) at the disposal of Ministry of Interior for posting in FIA. While this letter was either in the mail or had not reached the "right" hands, the Ministry of Interior sent a reminder on 16 August 2005.

9. On 5 September 2005 a notification was issued by the Ministry of Interior, Government of Pakistan Dr. Arsalan Iftikhar was transferred and his services were placed at the disposal of FIA for posting as "Assistant Director (BS-17) in FIA, on deputation basis for a period of three years, in his own pay and scale, with immediate effect and until further order.:

10. On 9 September 2005 the Secretary S&GAD brought the matter to the attention of the Chief Secretary, Balochistan. On 13 September 2005 the Chief Secretary Balochistan onbehalf of S&GAD issued a notification pursua to the notification of the Government of Pakistan. On 30 September 2005 Arsalan Iftikhar received charge of the office of Assistant Director, FIA at Islamabad. This was notified on 24 October 2005.

11. Within four months of his appointment as Medical Offic/Demonstrator in the Institute of Public Health, Quetta, Dr. Arsalan as BS-17 Officer, who had no even completed the mandatory period of his probation, was transferred and posted first as a Section Officer in the Government of Balochistan against a nonexisting vacan- cy And then send on deputation as Assistant Director, FI to the Ministry of Interior, Government of Pakistan, for a period of three yea all in the public interest. And this for a person who had appeared thrice in th CSS competitive examinations and failed each time.

12. Under Rule 8 of the Health Department, Govern- ment of Balochistan, Services Rules, 1984, a person appointed to the service against a substanti vacancy remains on probation for a period of two years if appoint- ed by initi recruitment. Dr. Arsalan, having been so appointed, on 22 June 2005, his period of probation would have been complete on 21 June 2007.

13. On 22 November 2005, the S&GAD, Government of Balochistan moved a summary to the Chief Minister, Balochistan, proposing confirmation in services of Dr. Arsalan Iftikhar "with immediate effect against the substantive post of Medical Officer in the Provincial Health Department by relaxing Rule of the Balochistan Health Department (Basic Pay Scale 16 and above) Service Rules 1984 for completion of probation period of 2 years. On 5 December 2005 the S&GAD, Government of Balochistan issued a notificat whereby the services of Dr. Arsalan Iftikhar were confirmed.

14. On 22 March 2006 in continuation of its notificati- on of 5 September 2005 Ministry of Interior issued yet another notification. Barely within 5 months of having assumed the charge of Assistant Director FIA in BS-17; Dr. Arsalan Iftikhar (BS-17) Health Department Govern- ment of Balochistan Quetta is transferred and his servi- ces are placed at the disposal of Director General, Federal Investigation Agency for posting as Deputy Director (BS-18) in FIA deputation basis for a period of three years - [Emphasis supplied].

On 7 April 2006 it was notified that he had assumed the charge of the office Dy. Director (BS-18) FIA on 22 March 2006. On 9 May 2006 by a letter issu by the Office of the Director General Federal Investigation Agency it was clarified as follows: Now he has been upgraded as Deputy Director in BPS-1 with retrospective effect. i.e. from the date of initial joining as per notification dated 22-03-2006.

On 9 May 2006 the Ministry of Interior issued yet another notification in part modification of its notifica- tion of 22 March 2006. It was stated: Dr. Arsalan Iftikhar had assumed the charge of the post of Deputy Direct/BS-18, FIA on 30th September 2005 with retrospective effect.

15. This done, a campaign was launched to induct Dr. Arsalan Iftikhar in the Police Service of Pakistan. As a BS-17 officer, Dr. Arsalan Iftikhar could hav joined the Police Service only through the competitive services examinatio conducted by the Federal Public Service Commission but being in BS-18 made induction possible and the FPSC route could be avoided. As a first s he was to be sent to the Police Academy for training with PSP officers all of Whom had been selected by the Federal Public Services Commision. The training was exclusive to PSP officers.

16. On 19 May 2006, the Ministry of Interior addressed a letter to Commanden National Police Academy, Islamabad stating that Dr. Arsalan Iftikhar, Depu Director, FIA was attached with the National Police Academy for training wit CTP Batch. The commandant was requested to attach the said officer for fi training along with under training ASPs to cover each aspect of the required training.

17. On 24 May 2006, the Ministry of Interior again issued a letter to Command National Police Academy Islamabad, stating that after the completion of th specialised training programme at the National Police Academy, the serivc of Dr. Arsalan Iftikhar be placed at the disposal of Punjab Police for further posting at Lahore for his District Attachment Training.

18. Persuant to the letter of 24 May 2006, the National Police Academy, Islamabad on 27 June 2006 relieved Dr. Arsalan Iftikhar, "for completion of remaining training programme of 32nd CTP, and directed to report to Elite Police Training School, Bedian Lahore on 02-07-2006 for six weeks Orientation Course." After completion of the course he to "report to CPO, Punjab, Lahore for Phase III part of training which is six months Field Attachment".

19. In the meantime, the Prime Minister's Secretariat was approached for the permanent induction of Dr. Arsalan Iftikhar in the Police Service of Pakistar BS-18 On 16 May 2006 the Prime Minister's Secretariat sought the views o the Establishment Division in the regard.

20. The U.O note of the Prime Minister's Secretariat was also circulated to FIA. On 3 June 2006 the office of the Director General, FIA stated that, "neither FIA requisitioned his services, nor was involved at any stage for his deputation or district attachment etc." FIA, therefore expressed its inability t offer any views / recommendations on the U.O Note.

21. On 23 May 2006 the Establishment Division noted that as per the PSP (Composition, Cadre and Seniority), rules, 1985, "the request of the office fo induction in PSP in BS-18 is not feasible," In a separate note the Establishment Division observed that Dr. Arsalan Iftikhar could not be inducted in the Police Services of Pakistan without an amendment in the P (Composition, Cadre and Seniority) Rules, 1985. Such an amendment cou only be made with the approval of the President.

22. On 31 May 2006 the Secretary Establishment was called by the learned jud for a meeting at his residence. The meeting too place at 2100 hours. The

observa- tion of the Establishment Division were also communicated to hi
The learned judge appreciated the aforementioned reservations but the meeting ended with the learned judge insisting on:
(a) the induction of Dr. Arsalan Iftikhar in FIA prefer- able in BS-18 (b) hi subsequent deputation to the Pun- jab Government without their specifically mentioning the post against which he will be posted and (c) simultane- ous initiation of proposed to amend the rules to prove for induction of FIA officer the Police Service of Pakistan and sought his son's permanent induction in (BS-18) in the Police Service of Pakistan.
The Secretary, Establishment, Communicated these demands to the Prin Secretary to the Prime Minister, around midnight the same evening. Soon thereafter the Secretary Establishment received a call from the learned judg saying that he had found a number of precedent of induction into various groups. On 1 June 2006 the papers were received from the learned judge. Later, the learned judge called the Secretary Establishment on the Green Line to enquire if the papers sent by him had been examined. The Secretar Establishment stated that it would take some time. The leaned judge state that ordrs of the Prime Minister be obtained by referring would be made to Prime Minister's Secretary giving the precedents as well as the legal positio The learned judge responded that a written reference would "jeopar- dize th case and that this was part of a package and reference to the rules need not be made."

23. The learned judge continued to "insist that all concerned make the necessa changes and warned of "consequences" if his desires were not met. Due to rel- entless pressure and the campaign of intimidation and harassment launched by him, ultimately summary was prepared and submitted by the Establishment Secretary on 23 June 2006 to the Prime Minister for additior new "Rule 7-C" in the Police service of Pakistan (Composition Cadre and Seniority) Rule, 1985. The amendment was tailor made for Dr. Arsalan Iftikhar.

24. Since then the learned judge had almost on daily basis exerted all kinds of pressure on the Prime Minis- ter's Secretariat to secure the approval of the summary afornentioned and for the consequent induction of Dr. Arsalan Iftikhar as an officer in the Police Service of Pakistan as a BS-18 officer.

25. He also used his influence and authority to have Dr. Arsalan Iftikhar nominated at attend the 2nd Training Course in Combating International Terrorism and Organi- zed Crime from 30 October 2006 to 3 November 20 in Istanbul. He was the only non PSP officer and the only under training person to attend this course.

26. The learned judge is entitled to one 1600 CC car, but he has contrary to th norms and rules on subject secured the use of the following cars for himself at Islamabad: (i) Mercedes Benz 3000cc, (ii) IDJ-166 Toyota Corolla Mode 1993 1300cc, (iii) ODF 6828 Toyota Corona Model 1993-2000cc, (iv) CIA-9 Toyota Corolla Model 2002 1300cc, (v) GP-8695 Toyota Corolla Model 20

1300cc, (vi) IDM-7976 Corolla Model 2003 1300cc, (vii) IDM-7977 Corolla Model 2003 1300cc.

Besides these the learned judge has the use of a fleet of cars at Islamabad, Lahore and Quetta.

28. On more than one ocassion demands have been made to the Chief Minist or Governor of the province which the learned judge is visiting to provide the cars for their own official use to the learned judge during the period of his sta in the province.

Protocol over and above entitlement.

29. The learned judge insists on being provided pro- tocol which has neither be ever sought by or provided to a Chief Justice. Besides an outrider to lead th caval- cade the demand is for a number of police vehicles to follow him. Th men have to be from elite units at times specific demands have been mad for an officer not below a particular rank to act as an outrider. Traffic has to b diverted or stopped while the convoy travels from one point in the city to another at high speed. Such actions are completely unprecedented for a Chief Justice.

30. Demands have made for senior bureacrates not below a particular rank to receive him at airport when he arrives in a provincial capital.

Use of Planes and helicopters.

31. The learned judge frequently demands the use of the plane or aircraft of a Governor or a Chief Minister to travel from one place to another or for a private visit to offer condolences or to attend a function.

The learned judge is well aware that he is not entitled to the use of these aircraft and helicopter but is in the habit of making these demands frequent and secures these by insisting on these.

Para 32 deleted.

33. For some time BMW car Registration No. "RAZIA-A" remained in the use c the learned judge and members of his family. The story hit the press and when it refused to die down the car was quietly moved else- where.

Judicial Conduct.

34. There are complaints of orders being verbally announced in open court in favour of one party and sub- sequently a written order at variance from the order ann- ounced in court being delivered. Two such cases have acquired particular notoriety. In one of these two cases it is alleged that amount as large as Rs. 55 million may have been involved.

Reports

35. These matters have been the subject of general and uncontradicted public comment, press reports, magazine articles, media comments by senior and res- pected members of the bar and former members of the superior judicia

Entitlements

36. The learned judge used the influence of his posi- tion to gain undue advantage by "insisting" on an increa- se and enhancement in his entitlements or in securing the relaxation of the rules in that respect.

III. In the light of, inter alia, the foregoing facts and circumstances, and afte thorough consideration of the matter the Prime Minister of Pakistan advised the Pre- sident of the Islamic Republic of Pakistan to refer to the Council, for its report, the question whether the conduct of Mr. Justice Iftikhar Muhammad Chaudhry, Chief Justi- ce of Pakistan in following matters namely:-

(a) in using his position, office, influence and authori- ty as a judge of the Supreme Court and Chief Justice of Pakistan to:

(i) secure the appointment of his son Arsalan Iftikhar as a Section Office in the Health Department, Govern- ment of Balochistan.

(ii) to have his son Arsalan Iftikhar swent on deputa- tion by the Government of Balochistan to the Ministry of Interior, Government of Pakistan as Assistant Director, FIA in BS-17;

(iii) to have his son Arsalan Iftikhar confirmed in the service of the Health Department, Government of Balo- chistan, much before the expirty o the mandatory period of probation in violation of the applicable rules;

(iv) to have his son Arsalan Iftikhar upgraded as Dy. Director, FIA, in BS-18 with retrospective effect;

(v) to make efforts to have his son Arsalan Iftikhar inducted in the Police Service of Pakistan in violation of the rules and to seek an amendment of the applicable rules;

(b) in seeking and securing official vehicles and tra- nsport for his use much beyond the sanctioned and per- missible limits;

(c) In insisting on protocol to which he was not enti- tled;

(d) in demanding and securing use of helicopters and planes to the use of whic he was not entitled;

(e) in accepting accomodation with a litigant before the Supreme Court;

(f) in using the BMW car "Razia 1";

(h) in insisting on entitlemtnts or having rules relaxed for such entitlements; constitutes a ground of miscon- duct on which the learned judge ought to be removed from the office of a judge of the Supreme Court of Pakis- tan .

IV. The President of the Islamic Republic of Pakistan is of the opinion that the learned judge may have been guilty of misconduct and therefore, is pleased to refer the question aformentioned to the Council for the purposes of conducting an inquiry into the matter and after such inquiry as it may deem report to the President its opinion whether the learned judge has commited mis- conduct and whether he should be removed from the office of a judge o the Supreme Court and the Chief Justice of Pakistan.

V. That the Prime Minister was further pleased to advise the President that besides making the reference to the Council the President may simultaneously, in exer- cise of his constitutional and inherent powers under the Constitution of Pakistan and all other powers enabling him in that beha direct that as a reference would be pending against the learned judge before the Council it would be neither in the public interest nor in consonance with

the norms of judicial propriety that he continues to perform the functions of h office as a judge of the Sup- reme Court or as the Chief Justice of Pakistan. This would be in consonance with past practice as well. For these reasons, t such time that the reference has been disposed off by the Council and final orders in the matter have been passed, the most senior of the other judges the Supreme Court shall act as the Acting Chief Justice. The President has been pleased to pass orders accordingly.

VI. It is requested that this reference may please be taken up as soon as it may be convient, an inquiry into the matter be commenced and the reference be disposed off as expeditiously as may be possible for the Council.

General Pervez Musharraf President,
Islamic Republic of Pakistan
Through Mr. Justice (Retd) Mansoor Ahmed
Secretary, Ministry of Law, Justice and
Parliamentary Affairs, Islamabad.
Date 9 March 2007.



جیو پر نشر ہونے والا صدر کا انٹرویو

EXCERPTS FROM MUSHARRAF'S INTERVIEW TO GEO

Following are excerpts of President General Pervez Musharraf's interview to G television's programme 'Aaj Kamran Khan Ke Saath' on Monday.

To a question as to whether he knew about the mag- nitude of reaction to t incident, President Pervez Musharraf said the reaction was above expectations.

"I will also say that some exaggeration is being made. In fact the reaction was as severe as being shown," he said.

When told that the nation was taken aback on the sudden presidential referer against the chief justice and this reflected that the action was taken in hurry, t president made it clear that the reference was never pre- pared in a hurry.

"All legal formalities were completed. Complaints were coming against the c justice. Newspapers also quoted these incidents. There were also talk abroad a complaints were being sent to me but such things are to be kept confiden because it was a big issue. If the complaints are against a chief justice, it is neve trivial matter. Because of the secrecy, people did not know anything. But there we lots of complaints and everyone knew about that," the president said.

The president was told that besides complaints, the newspapers also took up case about his (chief justice) son. However, what the media highly appreciated wa an impression about the chief justice when he took up hearing of cases of pub importance including the case of missing persons. The president was also told t one impression is that the case of missing persons was one of the reasons behi filing the presidential reference.

The president said in categorical terms that such an impression was tota wrong.

"If he is providing relief to the aggrieved persons as chief justice, I will persona appreciate that to a great extent. This has to be done. Insofar as the case of mi

ing persons is concerned, I was personally very pertur- bed about them becau human rights bodies have been criticising the government on that count. I was m worried as, like the past political governments, our government does not believe political victimisation. It was a fact that weapons were concealed in the boot someone's car and he was sent behind the bars for three years. But we have n agenda of political victimization, neither is my tamper of that kind that I pick people and disappear them. We were greatly perturbed by the issue (of missi persons) and as I had said in my speeches on many occasions that the persons h themselves gone underground. These people had left their parents and joi different organisations. I don't know about these people and such organisatio

should be asked about them. These organisations have themselves become so-called champions of Islam. They deceive people, prepare suicide bombers take them for Jihad across the world. These (missing) people have gone there know it because I have watched a number of films of the suicide bombers in whi they themselves tell their legal heirs not to worry about them; they are executing job with their own will."

The president recalled that a school student disappe- ared and his father wrote him to locate the boy. "Alhamdo Lillah we searched him. He too had left his pare and joined an organisation. Whatever the num- ber of missing persons, this is should be looked into that perspective. Those talking of human rights should understand this background. They should understand our government. We are no favour of such activities to pick up people. I will be the last person to go f vengeance."

The president said those instigating people for Jihad are creating disturbance the society.

"I have asked the people in each and every speech to stop this practice a advise their children to desist from such activities. Taking people away in the na of Jihad is in fact an issue. The chief justice could know about this from all source the president said.

General Musharraf was asked that the president had the authority under Artic 209(5) of the Constitution to file a reference against the chief justice, but people the impression that you were sitting in the Army House in military uniform and chief justice was seated in front of you. After this the chief justice remained in you office for several hours. During this period, the oath taking ceremony of the acti chief justice took place. Please tell the nation as to what transcribed during this f hours because the government drew the brunt of criticism for this very reason.

President General Pervez Musharraf said that he would like to give a detai answer and tell the nation the truth because I know that questions were being rais in this regard. "Some bad impressions are also being created and also there is l of information." The first thing is its perspective about which the president said th the chief justice once himself came to the Army House to meet him along with spouse. He added that the CJ has been meeting him earlier also and it was not thing.

"Once he came to me himself and showed concern that there were repor against him in the newspapers and sought my cooperation in this regard. I told that I would inquire as to what is its background and as to whether there had be any plot behind the same. After that the contacts continued.

"Finally came the state that the Ministry of Law began to prepare a referen against the chief justice and after that the Prime Minister Secretariat sent it to When he (CJ) last met me, I had already received the reference. The chief jus conveyed his with through my military secretary to meet me. It was probab saturday...... no, Friday. He (CJ) said that court proceedings would conclude at 11 hours after which he would like to come to the president's camp office. To which said that he is most welcome.

"The first thing is that the chief justice came on his own request. The seco thing is that I was not in the Army House but working as usual in the camp offi The offices of ZA Bhutto and Ziaul Haq were also over there. It is that camp offi where I am working.

"The question as to why I was in uniform is that should I have been in waistcoat. It is not a new thing. I mostly remain in uniform. Today I wore a suit for Geo interview.

"On his query, I told him that a reference has been filed against him. The c justice pulled out a letter from the file regarding a judge of the Peshawar High C in which he had levelled some allegations against the chief justice and deman that a reference against him should be sent to the Supreme Judicial Cour otherwise he would submit his resignation. I brought this to show it to me himself a I told him what has to be done. I told him that a reference containing allegat against him has also been sent to him. Should I sent it to the Supreme Ju Council forthwith? I also have to satisfy myself whether or not the reference i correct. Should I send it to the SJC? I have to ask the person against whom reference has been filed. The prime minister was not with us in the picture as at t time he had not arrived. When the chief justice finished his talk, and I began to about the reference, I called the prime minister. He also sat with us and I told about the references. I wanted his (PM's) explanation to decide whether it can sent to the SJC?

"Through I had personal interaction with Justice Iftikhar but after all I am president of Pakistan and he the chief justice of Pakistan. It is something ab friendship. A reference has come and because of its offi- cial status it is abov personal things. I hold responsibi- lity to the nation and also under the constitu and have to fulfil responsibilities.

"When a reference has come to me from the prime minister, it is my obligatio assess and initiate action on it. On this I wanted to take the opinion of the conc ned person. I think these activities took around two hours because there we question and answers. May be some two and a half hours spent because the CJ h come at 11.30 am and at 2.00 pm it was Juma prayers time. At 2.00pm both prime minister and me left for prayers.

"On return I told the CJ that I have conveyed you about the contents allegations of the reference and handed him over the bundle of papers. I told him that th were supported by evidences and if you see and assess them as these contain th proofs.

"After this I had to leave for Karachi and realised that I had fulfilled r responsibility by telling him in detail and provided the supporting evidence. I v already late by half an hour, the chief justice had been going through the pap along with the staff and so he spent two and a half hours with me. Though I did r note the time but over one hour might have been taken by us again. Might b would have taken four or four and a quarter hours.

"I thought that I met all the obligations because the allegations had been lev against a very important and senior personality. It was my duty to know the facts.

"I made a decision according to my conscience which was an honest decisi and in national interest. All legal and constitutional aspects of the reference we taken care of and I sent the reference to the Supreme Judicial Council."

Asked as to whether he told the chief justice a way out, or there had been ar other option in his mind or had made up his mind to send the reference to the while informing the chief justice of the allegations, Presi- dent General Per Musharraf said he just communica- ted the same to the CJ who had to decide ab it."

"I could not tell him anything more because he was the chief justice and co

take a decision to do what. He himself had to chose a way out. Whether he wo resign or contest the reference to defend himself. It was his choice and I did not him anything more what to do or what not to do. The prsident said he did not tell chief justice about defending the reference. It was his option."

When asked that the chief justice was restrained from his official obligations a an acting chief justice appointed and as such the act of making him dysfunctio was challenged on a larger scale as not under the law and the allegations we levelled just for no reason, the president said, "See, I am not a legal man. I am ju simple soldier and do not know about the law. I just acted on the advice, which w a legal advice. Under the legal advice given to me, I had the right and so I issued order to make him non-functional and the Supreme Judicial Council on the first of its hearing upheld it."

When told that there was no controversy over his sending of the reference to th SJC under article 209 of the Constitution but constitutional experts, the nation public opinion object to the restrictions imposed on the chief justice immediately a he left for his home, disconnection of his telephone, restraining him from meeting people and stopping his children from going outside. These were acts that ca forth as a consequ- ence and perturbed the nation.

The president said, "first, they had the concern where the chief justice was livin that there should be no media trial and the issue not politicised. Second, there wa security concern about the said area. A meeting over there is arranged o permission. Consent of the person is sought prior to meeting of any person.

"Insofar as I am concerned, I am not dealing with the procedure to say that daughter should be allowed to go but son stopped. I would not involve myself in su trivial things. If any restriction was imposed or undue steps taken because procedural lacunas that should not have happened. When such things came to notice, we took notice of the same. I personally gave ins- tructions and rectified t situation. If at the preliminary stage, anything happened that was not in my notice.

When asked whether it was on his instructions that now people were meeting th chief justice as usual and the situation was normal, the president said, "Yes. I pe sonally intervened because I noticed that these were issues that unnecessari created confusion in the mind. Mine is a behaviour of freedom and believe in right of expression and free media. These should be no restric- tion and so intervened as to what was all this hapenn- ing? What are the rules over there? I sa he should go whereover he wants. Why he is being stopped and who is doing tha To whomever he wants, he should meet and say what he wants. I am happ practical steps have been taken to improve the situation. Today The News show his door closed and people going back. Now I will not involve myself in such thin whether the door is closed or open. The chief justice may himself control it fro inside. If there is talk on whether the doors are closed or open, and a policeman peeing from inside, push the policeman outside. I have no concern with whether close or open the door."

The president said insofar as emergency was concer- ned, army would never b allowed to be used.

"There is no such situation and I will not use the army. It is not their job and t will perform their profe- ssional duties. There is neither a situation of emergency the country nor emergency will be imposed."

As regards Iran, he said there should be no use of force against that country.

"Pakistan is opposed to any use of force against Tehran."

He said there could be no prediction if there would be any attack on Iran. " have made our studies and thought about our safety. We will go ahead with elect that will be held on completion of five years of the prese- nt assembly. It is r determination and I will accomplish it."

When asked that a common man was not concerned about his working as ch of army staff, the president said he would not comment on it but fulfil his constitut nal responsibilities.

"You read the constitution as to how long I can work, and I will not speak beyo that. I will abide by and up- hold the constitution and it is enough for the nation."

He said internationally the world has to be told that democracy in Pakistan w not purely based on the Bri- tish or American democratic systems.

"We have our own constitution and we will abide by that. Every Pakistani sho believe in that and forcefully told the world about that."



نعیم بخاری کا اختلاف ذاتی تھا یا اصولی؟

کیا جناب نعیم بخاری کا اختلاف ذاتی تھا یا اصولی؟

پنجاب بار کونسل نے ''جسٹس'' نعیم بخاری کی رکنیت معطل کر دی ہے، یعنی اب وہ عدالت میں جادو نہیں جگا سکتے، البتہ پاکستان بار کونسل سے رجوع کر سکتے ہیں کہ پنجاب شاخ کا فیصلہ معطل کر دے۔ پاکستان بار کونسل کیا کرے گی یہ تو اس کے معزز عہدیدار ہی جانتے ہیں لیکن نعیم بخاری کچھ زیادہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوئے ان کا اندازہ غلط نکلا۔

چیف جسٹس کے نام اپنے خط میں انہوں نے لکھا کہ ''اس سے پہلے کہ آپ کے برادر ججوں میں آپ کے خلاف بغاوت اٹھے، جیسی کہ جسٹس سجاد علی شاہ کے خلاف اٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ بار متحد ہو کر آپ کے خلاف اٹھ کھڑی ہو اور اس سے پہلے کہ معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل کے سامنے رکھا جائے، شاید کچھ وقت موجود ہے کہ آپ خود کو بدل لیں اور اپنا رویہ تبدیل کر لیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے اندر جرأت اور دانائی موجود ہے جو تبدیلی کے لئے درکار ہوتی ہے۔''

''مائی لارڈ! ہم سب وقت کے رحم میں زندہ رہتے ہیں اور وہ ہمارے بارے میں فیصلہ صادر کرتا ہے......گزرتا ہوا وقت اور تاریخ......آپ کے بارے میں گزرتے ہوئے وقت کا فیصلہ انتہائی منفی ہے۔''

جسٹس افتخار محمد چودھری کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ کچھ بھی ہو لیکن ان کے عہد کا فیصلہ ان کی حمایت میں صادر ہوا ہے اور نقاد نعیم بخاری کے خلاف۔ نعیم بخاری نے چیف جسٹس کے خلاف مہم کا آغاز کیوں کیا؟......''مہم'' اس لئے کہ ان کا خط لاکھوں لوگوں تک پہنچا اور نتیجہ خیز ثابت ہو۔ صرف وہی جانتے ہیں لیکن عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہوئے، جو چیف جسٹس کے خلاف کارروائی کے آرزومند تھے اور ظاہر ہے کہ بخوشی استعمال ہوئے۔ جیسا کہ انہوں نے خود کہا وہ ایک سینئر وکیل ہیں اور خط کے لب و لہجے سے ظاہر ہے کہ وہ کردار کو اگر قابل فخر نہیں تو اطمینان بخش ضرور سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ بیشتر وکلاء اور ججوں سے زیادہ ٹیکس ادا کرتے ہیں......یقیناً کرتے ہوں گے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ وہ چیف جسٹس کو اپنا احسان یاد دلاتے ہیں کہ انہیں اس منصب تک پہنچانے کیلئے انہوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا؟ اگرچہ انہی کے بقول یہ اثر محدود ہے......اگر محدود ہے تو ذکر کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا یہ کسر نفسی ہے یا کچھ اور؟

ذاتی معاملات الگ کہ ان کے ذکر پر ''جسٹس'' نعیم بخاری کو زیادہ سے زیادہ بدذوقی کا مرتکب ٹھہرایا جا سکتا ہے اور کوئی قانون نہیں ہے، جس کے تحت سزا تجویز کی جا سکے ورنہ ان کے عائد کردہ الزامات سنگین ہیں۔ خط کا لب و لہجہ شدید ہے۔ یہ ایک ایسے آدمی کا طرز گفتگو ہے جو طاقت اور اختیار کا احساس رکھتا ہو اور جس کا گمان یہ ہو کہ اس کے الفاظ رائیگاں نہ رہیں گے......اس عوامی تاثر سے قطع نظر کہ جناب نعیم بخاری مقتدر حلقوں سے راہ و رسم رکھتے ہیں ان کے لب و لہجے میں یہ یقین کہاں سے آ گیا۔ کیا وہ برسراقتدار لوگوں کے قریب ہیں اور کیا وہ ایک سازش کا حصہ ہیں، جس کا جال بہت دنوں سے بنا جا رہا تھا؟ کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا، اس لئے کہ قطعی رائے دینے سے پہلے، دوسروں کے علاوہ نعیم بخاری کا موقف جاننا ضروری ہے۔ فریقین کا موقف سنے بغیر فیصلہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ اخبار تو لیس انہیں ڈھونڈ رہے ہیں لیکن وہ دستیاب نہیں۔ چیف جسٹس کے نام اپنے خط میں جناب نعیم بخاری خود پہ ناز کرتے نظر آتے ہیں لیکن جب زندگی کے سب سے بڑے مقدمے سے واسطہ پڑا تو انہوں نے راہ فرار

اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ عدالت نہیں، انہیں یہ مقدمہ رائے عامہ کے سامنے پیش کرنا تھا...... ٹیلی ویژن پر...... ممکن ہے چیف جسٹس کے نام اپنے خط میں ایک وکیل کی حیثیت سے، وہ خودستائی کے مرتکب ہوئے ہوں لیکن ان کے ٹی وی سٹار ہونے میں تو مخالفین کو بھی شبہ نہیں۔ زندگی بھر وہ دوسروں کے انٹرویو کرتے رہے۔ پہلی بار انٹرویو دینے کا موقعہ آیا انہوں نے راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھی...... آخر کیوں؟ کیا وہ ایک کمزور مقدمے کے وکیل تھے، جس کا دفاع کرنا انہیں مشکل نظر آیا؟...... ان کا خط تو یہ نہیں...... خط تو یہ کہتا ہے کہ انہیں اپنے قلم سے نکلنے والے ایک ایک لفظ پر یقین ہے۔

ایک عام سے اخبار نویس کے مقابلے میں قانون دان نعیم بخاری زیادہ جانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت زیادہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ انصاف وہ ہوتا جو ہوتا نظر بھی آجائے۔ کیا جسٹس افتخار محمد چودھری کے معاملے میں ایسا ہوا ہے؟...... بدقسمتی سے اس سوال کا جواب نفی میں ہے...... جیسا کہ جناب نعیم بخاری نے کہا زمانہ اپنا فیصلہ صادر کرے گا اور تاریخ بھی...... نعیم بخاری کے عہد نے اپنا فیصلہ ان کے خلاف صادر کیا ہے اور اغلب یہ ہے کہ تاریخ بھی ایسا ہی کرے گی......

کیا پاکستان کی ناقابل رشک عدالتی تاریخ نعیم بخاری کو یاد رکھے گی؟ شاید...... شاید ایک ایسے شخص کے طور پر جس نے پنڈورا باکس کھولنے کا کارنامہ انجام دیا...... شاید نہیں بلکہ ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے پنڈورا باکس کھولنے والوں کی معاونت کی...... انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ ذاتی رنج سے مغلوب ہو کر؟...... ایک ایسے جج سے ناراض ہو جانے والا وکیل، جس نے حصول منصب کیلئے چیف جسٹس کی مدد کی تھی، جیسا کہ خود ان کا دعویٰ ہے یا بالکل برعکس ایک ایسا اصول پسند آدمی، جس کی رائے کو ان کے ہم نفسوں نے مسترد کر دیا...... رہا تاریخ کا فیصلہ تو شاید ہمیں تعجیل سے کام نہ لینا چاہیے، اگرچہ ''جسٹس''، نعیم بخاری نے اپنے خط میں جس تشبیہ پہ انحصار کیا ہے، وہ ان کے خلاف جاتی ہے۔ کیا خط لکھنے کے بعد انہوں نے اس کا بغور مطالعہ کیا تھا؟ یقیناً کیا ہوگا اگر حسن ظن سے کام لے کر یہ کہنے سے گریز کیا جائے کہ بہت سے باخبر اور اہم لوگوں نے بھی کم از کم ان کے کچھ دوستوں نے تو ضرور اس پر نگاہ ڈالی ہوگی...... کیا ان میں کوئی ایک بھی دانا شخص نہیں تھا جو انہیں بتاتا کہ وہ ایک ہی عبارت میں جسٹس سجاد علی شاہ کے بارے میں دو بالکل مختلف تناظر اختیار نہیں کر سکتے۔ اول تو وہ انہیں ایک مظلوم کے طور پر پیش کرتے ہیں، جن کے خلاف حکومت وقت بھی سرگرم تھی اور دوسری بار وہ چیف جسٹس کو ان کے انجام سے ڈراتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ برادر جج ان کے خلاف اسی طرح بغاوت کر دیں گے، جیسے جسٹس سید سجاد علی شاہ کے عہد میں، گویا وہ انہیں مورد الزام ٹھہراتے ہیں...... وہ ایک ایسے شخص کو کیسے مورد الزام ٹھہرا سکتے ہیں، جس کے خلاف اہل اقتدار حرکت میں آئے ہوں۔

کچھ بھی ہو، حقیقت یہ ہے کہ 9 مارچ کے فیصلے نے پنڈورا باکس کھول دیا ہے۔ ایک مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں، اس سے بڑا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ نعیم بخاری اس معرکے میں، جس گروہ کا حصہ ہیں، اسے عوامی پسندیدگی نصیب نہیں ہوئی...... کیا وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہیں یا انہیں اس پر فخر ہے...... یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کے سامنے آئیں اور اپنا مؤقف بیان کریں...... زندگی میں بہت کم ہوتا ہے اور بہت کم لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑے ہوں...... پھر وہ معصوم قرار دیئے جائیں یا قصوروار...... جناب نعیم بخاری کے ساتھ ایسا ہو چکا اور ان کے لئے فرار کی کوئی راہ نہیں...... اگر وہ ایسا کریں گے تو وقت بہرحال اپنا فیصلہ صادر کرے گا...... میں انہیں کے الفاظ دہراتا ہوں:

WE ALL LIVE IN THE WOMB OF TIME AND ARE JUDGED, BOTH BY T
PRESENT AND HISTORY

برائے کرم نعیم بخاری بتائیں کہ ان کا اختلاف ذاتی یا اصولی؟...... اصولی تھا تو وہ غائب کیوں ہیں؟

(بشکریہ ہارون الرشید)



سپریم جوڈیشنل کونسل کی آئینی حیثیت

The Supreme Judicial Council:

Constitutional provisions

The Supreme Judicial Council Article 209 of the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1973, provides for a Supreme Judicial Council of Pakistan. The Article Says:

209. Supreme Judicial Council. -

(1) There shall be a Supreme Judicial Council of Pakistan, in this Chapter referred to as the Council.

(2) The Council shall consist of - (a) The Chief Justice of Pakistan, (b) The two next most senior Chief Judges of the Supreme Court and (c) The two most senior Chief Justices of High Courts.

Explanation: For the purpose of this clause, the inter se seniority of the Chief Justices of the High Courts shall be determined with reference to their dates of appoint- ment as Chief Justice, and in case the dates of such appointme are the same, with reference to their dates of appointment as Judges of any of the High Courts.

(3) If at any time the Council is inquiring into the capacity of conduct of a Judge who is a member of the Council, or a member of the Council is absent or is unable to act due illness or any other cause, then -

(a) If such member is a Judge of the Supreme Court, the Judge of the Supreme Court who is next in seniority below the Judges referred to in paragraph (b) of clause (2), and

(b) If such member is the Judge of the High Court, the Chief Justice of another High Court who is next in seniority amongst the Chief Justices of th remaining High Courts, shall act as a member of the Council in his place.

(4) If, upon any matter inquired into by the Council, there is a difference of opinion of the majority shall pre- vail, and the report of the Council to the President shall be expressed in terms of the view of the majority.

(5) If, on information from any source, the Council or the President is of the opinion that a Judge of the Supreme Court or of a High Court-

(a) May be incapable of properly performing the duties of his office by reason of physical or mental incapacity; or

(b) May have been guilty of misconduct, the President shall direct the Council to, or the Council may, on its own motion, inquire into the matter.

(6) If, after inquiring into the matter, the Council reports to the President that it of the opinion-

(a) That the Judge is incapable of performing the duties of his office or has been guilty of misconduct and

(b) That he should be removed from office, the Presi- dent may remove the Judge from office.

(7) A Judge of the Supreme Court or of a High Court shall not be removed from office except a s provided by this Article.

(8) The Council shall issue a code of conduct to be observed by Judges of the Supreme Court and of the High Courts.

210. Power of Council to enforce attendance of persons, etc.-

(1) For the purpose of inquiring into any matter, the Council shall have the same power as the Supreme Court has to issue directions or orders for securing the attendance of any person or the discovery of production of any document; and any such direction or order shall be enforceable as if it had been issued by the Supreme Court.

(2) The provisions of Article 204 shall apply to the Council as they apply to the Supreme Court and a High Court.

211. Bar or Jurisdiction: The proceedings before the Council, its report to the President and the removal of a judge under clause (6) or Article 209 shall not be called in question in any court.

Code of Conduct for Judges of the Supreme Court and the High Courts

(Framed by the Supreme Judicial Council under Arti- cle 128 (4) of the 1962 Constitution as amended up to date under Article 209 (8) of the 1973 Constitution)

(First printed in the PLD 1967 Jour. 97)

The prime duty of a Judge as an individual is to present before the public an image of justice of the nation. As a member of his court, that duty is brought within the disciplines appropriate to a corporate body.

The Constitution, by declaring that all authority exer- ciseable by the people is a sacred trust from Almighty Allah, makes it plain that the justice of this nation is of Divine origin. It cannotes full implementation of the high principles, which are woven into the Constitution, as well as the universal requirements of natural justice. The oath of a Judge implies complete submission to the Constitu- tion and under the Constitution to the law. Subject to these governing obligations, his function of interpreta- tion and application of the Constitution and the Law is to be discharged for the maintenance of the Rule of law over the whole range of human activities within the nation.

To be a living embodiment of the powers, functions and obligations calls for possession of the highest quali- ties of intellect and character. Equally, it imposes patterns of behavior, which are the hall-mark of distinc- tion of a Judge among his fellow-men.

In this Code, an attempt is made to indicate certain traditional requirements of behavior in the Judges of the Superior Courts, conductive to the achievement of a standard of justice worthy of the nation.

ARTICLE 1

On equiponderance stand the heavens and the earth. By equiponderance, oppression meaning unjust and unequal burdens is removed. The Judge's task is to ensure that such equality should prevail in all things.

ARTICLE II

A Judge should be God-fearing, law-abiding, abste- miious, truthful of tong wise in opinion, cautious and forbearing, blameless, and untouched by gree While dispensing justice, he should be strong without being rough, polite without being weak, awe inspires in his warnings and faithful to his word, always preserving calmness, balance and complete detachment, for the formation of correct conclusions in all matters coming before him.

In the matter of taking his seat and of rising from his seat, he shall be punctilious in point of time, mindful of the courtesies, careful to preserve the dignity of the Court, while maintaining an equal aspect towards all litigants a well as lawyers appearing before him.

ARTICLE III

To be above reproach, and for this purpose to keep his conduct in all things official and private, free from impropriety is expected of a Judge.

ARTICLE IV

A Judge must decline resolutely to act in a case in- volving his own interest, including those of persons whom he regards and treats as near relatives or close friends.

A Judge must rigidly refrain from entering into or continuing any business dealing, howsoever unimpor- tant it may be, with any party to a case before him. Should the dealing be unavoidable, he must discontinue his connecti with the case forthwith. A judge must refuse to deal with any case in which he has a connec- tion with one party or its lawyer more than the other, or even with both parties and their lawyers.

To ensure that justice is not only done, but is also seen to be done, a Judge must avoid all possibility of his opinion or action in any case being swayed b any con- sideration or personal advantage, either direct or indirect.

ARTICLE V

Functioning as he does in full view of the public, a Judge gets thereby all th publicity that is good for him. He should not seek more. In particular, he should not engage in any public controversy, lest of all on a political questio notwithstanding that it involves a question of law.

ARCITLE VI

A Judge should endeavor to avoid, as far as possible; being involved, either on ha own behalf or on behalf of others in litigation or in matters which are liable to lead to litigation such as industry, trade or speculative tran- sactions To employ the influence of his position to gain undue advantage, whether immediate or future, is a grave fault.

A Judge must avoid incurring financial or other obligations to private institutions or persons such as may embarrass him in the performance of his functions.

ARTICLE VII

Extra-judicial duties or responsibilities, official or private, should be generally avoided. He should equally avoid being a candidates, for arty elective office any organization whatsoever.

ARTICLE VIII

Gifts are to be received only from near relatives and close friends, and only

such as are customary. Every- thing in the way of favours in consequence of the office must be refused. In accepting any entertainment offered, whether general or particular, care should be taken that its real purpose does not conflict with a Judge's duty to maintain detachment from likely litigants, and from partisan activity.

ARTICLE IX

In his judicial work, and his relations with other Judges, a Judge should act always for the maintenance of harmony within his own Court, as well as among all Courts and for the integrity of the institution of justice.

Disagreement with the opinion of any Judge, whether of equal or of inferior status, should invariably be express- ed in terms of courtesy and restraint.

ARTICLE X

In his judicial work a Judge shall take all steps to decide cases within the shortest time, controlling effec- tively efforts made to prevent early disposal of cases and make every endeavor to minimize suffering of litigants by deciding cases expenditiously through proper written judgements. A Judge who is unmindful or indifferent towards this aspect of his duty is not faithful to his work, which is a grave fault.

Inquiry Procedure

The 17th Amendment to the Constitution brought a significant change in Article 209 of The Constitution. Prior to the Amendment, the Council could process only such matters as were referred to it by the President. Under the amended Article 209, the Council, besides a reference from the President, may, also on its own account inquire into the conduct or capacity of a Judge of a Supreme Court in Pakistan.

Soon after the assumption of office, the Chief Justice of Pakistan, convened meetings of the Council wherein the following decisions were taken:-

(1) The council will be institutionalized and made an effective functional forum of accountability;

(2) A committee comprising Mr. Justice Rana Bhag- wandas, Mr. Justice Javed Iqbal and Dr. Faqir Hussain, Registrar, Supreme Court was constituted to prepare draft rules/procedure for initiating adieu and conducting investigation/inquiry.

(3) The Chief Justice, Lahore High Court will prepare a draft to make the Code of Conduct more elaborate and objective;

(4) The Registrar, Supreme Court will send a copy of the Code of Conduct to the Hon'ble Judges of the Supreme Court arid the High Courts for compliance.

Persuant to the above decisions, the committee pre- pared a draft of the Supreme Judicial Council procedure of Enquiry 2005, which was approved by the Council. It was duly notified and gazetted. Thus, the Council has become fully functional and is entertaining complaints as per the prescribed procedure. The Gazette of Pakistan containing the Procedure of Enquiry reads as follows:-

THE GAZETTE OF PAKISTAN

Extraordinary, Karachi,
November 29, 2005

PART III

SUPREME COURT OF PAKISTAN

(SUPREME JUDICIAL COUNCIL) NOTIFICATION

No. P. Reg. 11/32005-SJC:-

(SUPREME JUDICIAL COUNCIL PROCEDURE OF ENQUIRY 2005)

Pursuant to the decision taken by the Supreme Judicial Council, in its Mee on 24th Sept- tember 2005, the Supreme Judicial Council is pleased to lay down the following procedure for effective perfor- mance of functions vested in it under Article 209 of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan.

1. Title and application:

(1) The procedure of enquiry shall be called "The Supreme Judicial Counci Procedure of Enquiry 2005".

(2) It shall only apply to the Supreme Judicial Council and its proceedings.

2. Scope:

The procedure shall provide for effective implementa- tion of Article 209 of t Constitution and regulate all inquiries required to be undertaken and all oth matters which need to be addressed there under.

3. Definitions:

In the present procedure, unless the context provides otherwise, the followin expressions used in the Procedure will have the meanings as assigned to them hereunder;

(a) "Any matter", includes all matters and facts associated with the enquiry that the Council may carry out

(b) "Any other source", includes all sources through which information is receive in respect of the conduct of ajudge.

(c) "Code of conduct", means the code of conduct issued by the Supreme Judicila Council in terms of Article 209(8) of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan.

(d) "Chairman", means and includes the Chief Justice of Pakistan.

(e) "Incapacity", will include all forms of physical or mental incapacity howsoeve described or narrated, which render the judge incapable of performing the duties of his office.

(l) "Conduct", will include series of facts associated with the matter being inquired into by the Council including the facts which are attributed to the person of the Judge.

(g) "guilty", will include arriving at an opinion by the Council that a Judge has b guilty of misconduct.

(h) "Opinion", will include arriving at a conclusion by the Council that miscondu has or has not taken place.

(i) "Information", includes any material, facts, documentation, photographs, video or audio tapes, affi-davits, letters or any other reasonable evidence tha has come to the knowledge of any Member of the Council itself sufficient to initiate an enquiry.

(j) "Enquiry", means the consideration of any matter, in relation to conduct of a judge, by the Council or any Member or the Council

(k) "Member", means Member of the Supreme Judicial Council.

(i) "Misconduct", includes,

(i) Conduct unbecoming of a judge,

(ii) is in disregard of the Code of Conduct issued under Article 209(8) of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan,

(iii) is found to be inefficient or has ceased to be efficient.

(m) "Report or the Council", includes the findings of the enquiry proceedings carried out by the Council including rcommendations for the President of Pakistan for removal of the judge or otherwise.

(n) "Secretary", means the Registrar, Supreme Court or any person appointed the Council.

(o) "Supreme Judicial Council", means the Supreme Judicial Council as constituted by Article 209 of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan

4. The Headquarters of the Council shall be at Islamabad, but the Council ma hold its meeting or enquiry into reference or a complaint at any other place Pakistan, as the Chairman may deem convenient.

5. Receiving of information:-

(1) Any member of public may bring to for notice of the Council or any of its Members or the Secretary, information alleging incapacity or misconduct of Judge.

(2) The allegation may be supported by material which is sufficient in the opini of the Council to commence enquiry.

(3) The person providing the said information shall identify himself properly.

(4) The information may be received through any mode by the Council or any Member of the Council, without being restricted to any of the following sources such as;

(a) Print or electronic media;

(b) Written Complaint

(5) Information received under sub-para (4) shall be entered in the Register maintained by the Secretary.

6. Congnizance by the Council:- Without prejudice to the general requirement receiving information in the manner provided for above, nothing in this Procedure shall be read to curtail or limit the jurisdiction of the Council to initiate an enquiry against a Judge.

7. Procedure for scruitinizing information:- (1) Once any information in respect enquiry into the conduct of a Judge is received by any Member of the Coun it shall be presented to the Chairman of the Council, who; shall

(a) refer the same to any Member of the Council to look into the said information

(b) If the Council is satisfied that the information and to express his opintion is relation to sufficieney or othervise of the information prima facie discloses sufficient material for an enquiry, it shall proceed to consider the same.

(2) The Member, to whom the Chairman has referred the information, will examine the same and ascertain if the information so received discloses specific particulars of misconduct, and provides factual details necessary to form prima facie opinion in respect of the guilt of the Judge.

(3) If the Member forms an opinion that the information does reveal sufficient material to commence enquiry, he shall inform the Council accordingly and the information shall be placed before the Council.

(4) If the Member comes to a conclusion that the information is false frivolous, concocted or untrue, he shall inform the Council accordingly and may recommend action against the person who initialed the information.

8. Enquiuy by the Council:-

(1) The chairman may, call the meeting of the Council, for discussion and enq into the information received.

(2) The information in respect of the conduct of a Judge shall be placed before the Council for examination.

(3) If the Council is of the view that before forming an opinion, it should also he the Judges under enquiry, it shall require the said Judge to present himself before the Council. The Council shall provide him the information and mat received against him.

(4) If the Council is of the opinion that it requires more material or seeks additional information before it can form any opinion, it shall direct accordingly.

(5) The Council may, if necessary, secure the attendance of the person who has provided the information, for enquiry into any aspect of the information provided.

(6) The Council may summon any expert, where the enquiry is in respect of the incapacity of a Judge and may order any medical investigating by local foreign expert.

(7) Without prejudice to the foregoing, the Council shall have inherent powers adopt any procedure specific to the enquiry which is considered by the Council to be just and proper in the circumstances.

9. (1) If the Council decides to proceed against a Judge, a show cause notice shall be issued to him along with supporting material calling upon hi to explain his conduct within 14 days.

(2) On receipt of reply from the Judge, Council shall convent its meeting proceed further with the matter.

10. (1) The Attorney-General for Pakistan and in his absence a senior couns of the Supreme Court instructed by him, shall conduct a reference.

(2) The Council may require the Attorney-General for Pakistan or any other counsel to appear and assist the Council in relation to smooth and efficient conduct of its proceedings.

11. Procedure of Council:-

(1) In the event of a difference of opinion amongst the members of the Council regarding, further enquiry, granting right of hearing to the Judge concerned, securing attendance of the person providing information and related matter opinion of the majority shall prevail.

(2) In the event of a difference of opinion amongst the members of the Council whether the Judge concerned is guilty of misconduct, opinion of the majority shall prevail.

12. Report to the President of Pakistan:-

If the Council in its meeting, on conclusion of the proceedings forms an opinion, that the Judge concerned has been guilty of misconduct or incapacitated in the performance of his duties properly, it shall express its views accordingly and the same shall be
communicated by the Chairman to the President as a Report of the Counc for action under Article 209(5) of the constitution of Islamic Republic of Pakistan.

13. Proceedings of the Council not to be reported:-

(1) Proceedings of the Council shall be conducted in camera and shall not be open to public.

(2) Only the findings of the proceedings shall be allowed to be reported.

(3) Proceedings of the meetings of the Council or any other steps that Council may take shall not be reported, unless directed otherwise.

14. Punishment for frivolous information:-

(1) Whenever the Council finds that the information or evidence provided to it was false in material particulars or wit the sole intention to malign a Judge, scandalizing the Court or to undermine it in any form whatsoever, it may dir action against all those who are found to have provided the said informatior or evidence as the case may be.

(2) For this purpose, the Council may direct the Secretary of the Council to persue the course of action against the offender.

15. Council Secretariat:-

(1) The Council shall have a permanent secretariat and in order to carry out the affairs and functions, the Council may appoint such officials and staff as deemed fit and proper.

(2) The Council shall have a perpetual seal which shall be retained in the custo of the Secretary.

(3) The Secretary of the Council shall be the custodian of the record and proceedings of the Council.

16. Powers to issue directions:-

The Council shall have the power to issue any directive, pass any order and prescribe the procedure for achieving the objects of the Council.

17. This procedure shall mutatis mutandis, apply to proceedings against other offic holders, who can be removed from office in the manner prescribed by Article 209 of to Constitution.

By Order of HCJ/Chairman,
Sd/-
(Dr. Faqir Hussain)
Secretary
(Supreme Court Report Golden Jubilee Edition 2006.)



آئین کی دفعہ 209

جس کے تحت چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیا گیا

دفعہ 209 عدالتی کونسل

-1 پاکستان کی ایک اعلیٰ عدالتی کونسل ہوگی، جس کا حوالہ اس بابت میں کونسل کے طور پر دیا گیا ہے۔

-2 کونسل مندرجہ ذیل پر مشتمل ہوگی۔

(الف) چیف جسٹس آف پاکستان

(ب) عدالت عظمیٰ دو مقدم ترین جج اور

(ج) عدالت ہائے عالیہ کے دو مقدم ترین چیف جسٹس

تشریح:

اس شق کی غرض کے لیے عدالت ہائے عالیہ کے چیف جسٹسوں کا باہم دیگر تقدیم چیف جسٹس کے طور پر (بجز بہ حیثیت قائم مقام چیف جسٹس) ان کے تقرر کی تاریخوں کے حوالے سے اور اگر ایسے تقرر کی تاریخیں ایک ہی ہوں تو کسی عدالت عالیہ میں ججوں کے طور پر ان کی تقرر کی تاریخوں کے حوالے سے متعین کیا جائے گا۔

-3 اگر کسی وقت کونسل کسی ایسے جج کی اہلیت یا طرز عمل کی تحقیقات کر رہی ہو، جو کونسل کا رکن ہو یا کونسل کا کوئی رکن حاضر نہ ہو یا بوجہ علالت یا کسی دوسری وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ ہو تو

(الف) اگر ایسا رکن عدالت عظمیٰ کا ہو تو عدالت عظمیٰ کا وہ جج جو شق (2) کے پیرا (ب) میں محولہ ججوں کے بعد مقدم ترین ہو اور

(ب) اگر ایسا رکن کسی عدالت عالیہ کا چیف جسٹس ہو تو کسی دوسری عدالت عالیہ کا اس کی بجائے کونسل کے رکن کی حیثیت سے کام کرے گا۔

-4 اگر کسی ایسے معاملے پر جس کی تحقیق کونسل نے کی ہو، اس کے ارکان میں کوئی اختلاف رائے ہو تو اکثریت کی رائے غالب رہے گی اور صدر کو کونسل کی رپورٹ اکثریت کے نقطہ نظر کے اعتبار سے پیش کی جائے گی۔

-5 اگر کونسل کی طرف سے یا کسی اور ذریعے سے موصول شدہ اطلاع پر صدر کی یہ رائے ہو کہ ممکن ہے کہ عدالتِ عظمیٰ یا کسی عدالت عالیہ کا کوئی جج

(الف) جسمانی یا دماغی معذوری کی وجوہ سے اپنے عہدے کے فرائض منصبی کی مناسب انجام دہی کے قابل نہ رہا ہو، یا

(ب) بدعنوانی کا مرتکب ہوا ہو!

تو صدر کونسل کو ہدایت کرے گا کہ وہ معاملے کی تحقیقات کرے۔

-6 اگر معاملے کی تحقیقات کرنے کے بعد کونسل صدر کو رپورٹ پیش کرے کہ اس کی رائے یہ ہے۔

(الف) کہ وہ جج اپنے عہدے میں فرائض منصبی کے نا قابل ہے یا بدعنوانی کا مرتکب ہوا ہے، اور

(ب) کہ اسے عہدے سے برطرف کر دینا چاہیے۔
تو صدر اس جج کو عہدے سے برطرف کر سکے گا۔

-7 عدالت عظمیٰ یا کسی عدالت عالیہ کے کسی جج کو، بجز جس طرح اس آرٹیکل میں قرار دیا گیا ہے، عہدے سے برطرف نہیں کیا جائے گا۔

-8 کونسل ایک ضابطۂ اخلاق جاری کرے گی، جس کو عدالت عظمیٰ اور عدالت ہائے عالیہ کے جج ملحوظ رکھیں گے۔

شرح

اعلیٰ عدالتی کونسل چیف جسٹس آف پاکستان، عدالت عظمیٰ کے دو مقدم ترین ججوں اور عدالت ہائے حالیہ کے دو مقدم ترین چیف جسٹسوں پر مشتمل ہے اور اس کے دو طرح کے فرائض ہیں۔

(الف) عدالت عظمیٰ اور عدالت ہائے عالیہ کے ججوں کے لیے ضابطہ اخلاق تیار کرنا۔

(ب) عدالت عظمیٰ یا عدالت عالیہ کے کسی جج جسمانی یا دماغی معذوری یا بدعنوانی کے الزام پر مشتمل صدارتی ریفرنس ملنے پر اس معاملے کی تحقیقات کرنا۔

اگر صدر مملکت کو کونسل کی جانب سے یا کسی اور ذریعے سے یہ اطلاع ملے کہ عدالت عظمیٰ یا کسی عدالت عالیہ کا کوئی جج جسمانی یا ذہنی طور پر معذور ہونے کی صورت میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے قابل نہیں رہا، یا وہ بدعنوانی کا مرتکب ہوا ہے تو صدر اس کی تحقیقات کے لیے کونسل کو حکم دیگا۔ ایسے تحقیقات کے نتیجے میں الزام ثابت ہو جانے پر صدر مملکت ایسے جج کو برطرف کر سکے گا۔ عدالت عظمیٰ یا عدالت عالیہ کے کسی جج کو صرف اس آرٹیکل میں بیان کردہ طریقۂ کار کے مطابق ہی برطرف کیا جا سکتا ہے۔

اگر اس آرٹیکل کے مطابق ریفرنس کسی رکن کونسل کے بارے میں ہو تو کسی دیگر مقدم ترین جج کو اس کونسل کا رکن مقرر کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر ریفرنس کسی رکن چیف جسٹس عدالت عالیہ کے بارے میں ہو تو اس کی جگہ پر کسی دوسری عدالت عالیہ کے جج کو جو دوسرے پر مقدم ہو رکن مقرر کیا جائے گا۔

نوٹ: یہ متن کتاب ''شرح اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور'' سے لیا گیا ہے، جس کا مفہومی ترجمہ جسٹس (ر) محمد منیر، سابق چیف جسٹس آف پاکستان نے کیا ہے)



''سپریم جوڈیشل کونسل'' میں
چیف جسٹس کی پہلی پیشی

غیر فعال چیف جسٹس آف پاکستان' افتخار محمد چودھری نے اپنے خلاف قائم سپریم جوڈیشل کونسل کی آئینی حیثیت کو چیلنج کیا ہے اور اس پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کونسل کی تشکیل نو کا مطالبہ کیا ہے۔ منگل (۱۳ مارچ 2007ء) کے روز افتخار چودھری کے خلاف سپریم جوڈشل کونسل میں صدارتی ریفرنس کی سماعت ہونے والی تھی' لیکن ابتدائی نوعیت کی گفتگو کے بعد ہی کونسل کا اجلاس جمعتہ المبارک (۱۶ مارچ) تک ملتوی کر دیا گیا۔

جسٹس افتخار محمد چودھری کے حوالے سے سپریم جوڈیشل کونسل کے اجلاس کے پہلے روز اسلام آباد کی سڑکوں پر بعض تحیر خیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ جسٹس چودھری نے اپنے گھر سے نکلنے کے بعد سرکاری گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور پیدل سپریم کورٹ تک جانے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس موقع پر ان کی اہلیہ محترمہ اور دو بیٹیاں بھی ساتھ آ گئیں۔ پولیس کا بھی ہجوم تھا اور وکلاء بھی بڑی تعداد میں جمع تھے۔ پیدل سفر کے دوران چیف جسٹس کو پولیس کی سخت رکاوٹ کا سامنا رہا' کوئی ایک کلو میٹر چلنے کے بعد وہ بلوچستان ہاؤس میں چلے گئے جہاں کچھ دیر آرام کے بعد انہیں گاڑی میں بیٹھنے پر آمادہ کر لیا گیا۔ انکے اردگرد سکیورٹی فورس کا اژدہام تھا۔ چیف جسٹس جب سپریم کورٹ کے سامنے پہنچے تو وکلاء کی کثیر تعداد نے جو وہاں پہلے سے موجود تھی' انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وکلاء ان کے ہاتھ اور منہ چومتے رہے۔ ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں اور حکومت کے خلاف زبردست نعرہ بازی بھی کی گئی۔ اپنے گھر سے نکلنے کے بعد جس طرح سکیورٹی فورس کے اہلکاروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی اور انہوں نے مزاحمت کی' اس سے چودھری صاحب کا کوٹ پھٹ گیا اور ان کے چہرے پر خراشیں بھی آ ئیں۔ وہ نڈھال سے ہو گئے۔ چنانچہ سپریم کورٹ کی حدود میں واقع ڈسپنسری میں انہیں طبی امداد فراہم کرنا پڑی۔ انکے جسم میں پانی کی کمی کو دور کرنے کیلئے انہیں پانی اور جوس بھی پیش کیے گئے۔

جسٹس چودھری کو گزشتہ جمعہ کے روز 9 مارچ 2007ء غیر فعال (یا معطل) کیا گیا تھا۔ اس کے بعد منگل کے روز یہ پہلا موقع تھا کہ وہ عوام کے سامنے آئے۔ اللہ اللہ یہ کیسا موقع اور کیسا منظر تھا! ایک چیف جسٹس کو انہی کی اپنی عدالت میں لایا جا رہا تھا' مگر ان کے اردگرد پولیس کا حصار تھا۔ اسلام آباد کے تمام بیرونی راستے بند کر دیئے گئے تھے اور عدالت کو پولیس نے علی الصبح ہی گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ کے اردگرد بھی بھاری نفری متعین تھی اور تمام سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی تھیں' مگر جب جسٹس چودھری کار میں سپریم کورٹ کے سامنے پہنچے' وکلا بے قابو ہو کر ان کی کار کی طرف بڑھے تو سرکاری کار کا ڈرائیور اتر کر فرار ہو گیا۔ وکلاء نے ہی چیف جسٹس کو کار سے اتارا۔ اس موقع پر پولیس کے دستوں نے' شاید عقل مندی سے کام لیتے ہوئے' کوئی مزاحمت نہ کی' بلکہ پولیس والے پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سپریم کورٹ کے سامنے یہ عجیب اور تاریخی نظارا تھا۔ وکلاء کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ قاضی حسین احمد' مولانا فضل الرحمٰن' راجہ ظفر الحق اور عمران خان کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ ن اور پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کا بھی ہجوم تھا۔ چیف جسٹس کی کار پر بھی کچھ لوگ چڑھ گئے' جس سے کار کو نقصان پہنچا اور شیشے ٹوٹ گئے۔ مسٹر چودھری سپریم کورٹ کے احاطے میں داخل ہوئے تو بعض اہلکاروں نے انہیں پروٹوکول پیش کرنا چاہا' مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

گزشتہ روز جو کچھ پیش آیا' حکومت کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ افتخار چودھری کو جنہیں حکومتی زعماء ''اب بھی چیف جسٹس'' قرار

دیتے نہیں تھکتے' جس سلوک کا نشانہ بنایا گیا اسے کسی طور درست یا مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کا کوٹ پھٹ گیا اور چہرے پر خراشیں آئیں۔ اس کے نہایت تلخ بلکہ تباہ کن نتائج ہو سکتے ہیں' جن کو سنبھالنا محال ہو گا۔ حکومت کے اقدامات سے' سرکاری ذرائع انہیں خواہ کتنا ہی آئینی اور قانونی قرار دیں' جو کچھ سامنے آیا ہے' اس کے حوالے سے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ عدلیہ پورے ملک میں مرجع خلائق بن چکی ہے اور سرکاری ذرائع کی باتوں پر یقین کرنے کیلئے کوئی ایک فرد بھی تیار نہیں۔ لوگوں کے جذبات میں بھی شدت پیدا ہو رہی ہے۔ حکومت کو اپنے رویہ کی اصلاح کرنی چاہئے۔ چیف جسٹس سے اس طرح کا سلوک نہیں ہونا چاہئے اور جو کچھ ہوا ہے' جمعہ سے لے کر منگل تک' اس پر حکومت کو عوام سے' قوم سے معذرت کرنی چاہے۔ چیف جسٹس کے کیس میں عدلیہ پر جو گزری ہے' گزر رہی ہے اور اگر حالات کو درست نہ کیا گیا تو جو کچھ پیش آ سکتا ہے' اس کے تصور سے ہی دل دھل جاتا ہے۔ حکومت کو بھی اس کا ادراک اور احساس کرنا چاہئے اور حالات کو بدلنے' بہتر بنانے اور عوام کی تشویش اور مایوسی دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہی دانش مندی کا تقاضا ہے۔

غیر فعال چیف جسٹس نے سپریم جوڈیشل کونسل میں جو درخواست پیش کی ہے' اس میں انہوں نے قائم مقام چیف جسٹس کے تقرر پر اعتراض کیا ہے اور کونسل کے دو ارکان چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ افتخار حسین چودھری اور سپریم کورٹ کے سینئر جسٹس عبدالحمید ڈوگر پر بھی اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے پاس ان حضرات کے خلاف ریفرنس زیر تفتیش تھے۔ کونسل میں پیش ہونے کیلئے جسٹس چودھری نے پانچ وکلاء اعتزاز احسن چودھری' منیر اے ملک صدر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن' علی احمد کرد نائب صدر پاکستان بار کونسل' طارق محمود اور حامد خاں کو اپنی نمائندگی اور وکالت کیلئے مقرر کیا ہے' مگر بعض حکومتی ذمہ دار اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ سبھی وکلاء کی طرف سے چودھری اعتزاز احسن ہی نمائندگی کریں گے۔ دوسرے وکلاء صرف مشاورت کیلئے ہونگے۔ درخواست میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسٹر چودھری کو ان کے خاندان سمیت محبوس رکھا گیا ہے' جن میں ان کا سات سالہ بچہ بھی شامل ہے۔ ان کے گھر کے گرد پولیس اور ایجنسیوں کے ارکان کا گھیرا ہے اور ان کی گاڑیاں لفٹر کے ذریعے اٹھالی گئی ہیں۔ یہ صورتحال حکومت مخالف جذبات کو ہوا دے رہی ہے' جو نازک حالات پیدا ہونے کا موجب ہو سکتے ہیں۔

سرکاری ذرائع اور زعماء کا فرمانا ہے کہ جو کچھ بھی ہو گا' آئین اور قانون کے مطابق ہو گا' لیکن جو حالات درپیش ہیں' ان میں سرکاری یقین دہانیوں پر اعتماد آسان نہیں۔ حکومت کو باقاعدہ سوچ سمجھ کر مناسب فیصلے کرنے چاہئیں' ایسا نہ ہو کہ ہاتھوں سے لگائی گئی گرہیں دانتوں سے بھی نہ کھول سکیں۔

(اداریہ روزنامہ 15 مارچ 2007ء)



صدارتی ریفرنس کے خلاف
چیف جسٹس کی آئینی درخواست کے اہم نکات

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے صدارتی ریفرنس کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں مختلف اعتراضات داخل کیے ہیں لیکن انہوں نے سپریم جوڈیشل کونسل میں داخل کیے گئے مختلف اعتراضات پر سماعت ہونے کے دوران ہی ریلیف حاصل کرنے کے لیے سپریم کورٹ میں بھی آئینی درخواست دائر کی جس میں صدارتی ریفرنس، سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل، ہیئت اور جانبداری کے ایشو سمیت متعدد نکات کو چیلنج کیا ہے۔

سپریم کورٹ میں اس وقت تک صدارتی ریفرنس کے خلاف تقریباً 24 آئینی درخواستیں دائر کی جا چکی ہیں جن میں انفرادی درخواستوں کے علاوہ پاکستان بار کونسل اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن سمیت دیگر وکلاء تنظیموں نے بھی آئینی درخواستیں دائر کر رکھی ہیں۔

صدارتی ریفرنس کے خلاف دائر کی جانے والی آئینی درخواستوں میں تقریباً یکساں نوعیت کے نکات بیان کیے گئے ہیں اور فاضل عدالت سے استدعا کی گئی ہے کہ چیف جسٹس کے خلاف صدر مملکت جنرل پرویز مشرف کی جانب سے دائر کیے جانے والے ریفرنس کو غیر آئینی اور بدنیتی پر مبنی قرار دیا جائے۔ صدر مملکت نے 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر کیا اور چیف جسٹس نے 18 اپریل کو ایک آئینی درخواست کے ذریعے صدارتی ریفرنس کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا جس میں 16 نکاتی ریلیف کی استدعا کی ہے جن میں چیف جسٹس نے کہا کہ

1- سپریم کورٹ یہ قرار دے کہ آئین کے آرٹیکل 209 کے تحت نہ تو صدر مملکت کو چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف ریفرنس دائر کرنے کا اختیار حاصل ہے اور نہ ہی سپریم جوڈیشل کونسل صدر کی جانب سے بھجوائے گئے ریفرنس پر کارروائی کر سکتی ہے اور نہ ہی کونسل اس سلسلے میں انکوائری کر سکتی ہے۔

2- جب کہ چیف جسٹس آف پاکستان کی عدم موجودگی میں سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل مکمل نہیں ہوتی اور نہ ہی قائم مقام چیف جسٹس کونسل کی سربراہی کر سکتے ہیں

3- اور تشکیل دی جانے والی سپریم جوڈیشل کونسل غیر آئینی ہے۔

4- چیف جسٹس کے خلاف دائر کیا جانے والا ریفرنس بدنیتی پر مبنی ہے اور اس کو کثیر المقاصد حصول کے لیے دائر کیا گیا ہے۔

5- چیف جسٹس کو غیر فعال کرنا اور جبری رخصت پر بھجوانا غیر قانونی ہے اور اس لحاظ سے غیر مؤثر ہے۔

6- درخواست گزار اب بھی چیف جسٹس آف پاکستان ہے اس کو کام کرنے سے روکا نہیں جا سکتا۔

7- اور کسی بھی دوسرے جج کی قائم مقام چیف جسٹس کے عہدے پر تقرری غیر قانونی ہے۔

8- اور جلد بازی میں کی گئی تمام کارروائی بدنیتی پر مبنی ہے اور غیر قانونی ہے۔

9- اور چیف جسٹس کو اختیارات استعمال کرنے سے روکنے سے متعلق تمام احکامات غیر قانونی ہیں۔

10- کونسل اور دیگر متعلقہ جواب گزار متنازع ریفرنس کی سماعت نہ کرے۔

11- اور جن ممبران کے خلاف درخواست گزار کے پاس ان کے جانبدار ہونے سے متعلق کافی مواد موجود ہے وہ سپریم جوڈیشل کونسل کے ممبران نہیں بن سکتے۔

12- سپریم جوڈیشل کونسل کے تین ممبران ریفرنس کی سماعت نہیں کر سکتے۔

13- اور تین مذکورہ ممبران کو کونسل میں بیٹھ کر سماعت کرنے سے روکا جائے۔

14- صدارتی ریفرنس کا ان کیمرہ ٹرائل آئین سے متصادم ہے جو کہ درخواست گزار کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

15- سپریم جوڈیشل کونسل کو ریفرنس کی ان کیمرہ جلد بازی میں سماعت سے روکا جائے۔

16- اس کے علاوہ دیگر ریلیف بھی درخواست کو فراہم کیا جائے جس کا وہ حق دار ہے۔

چیف جسٹس نے بیرسٹر اعتزاز احسن کی وساطت سے اس آئینی درخواست کو دائر کیا ہے جس میں صدر مملکت، وفاق پاکستان سپریم جوڈیشل کونسل، رجسٹرار سپریم کورٹ، رجسٹرار سندھ ہائی کورٹ اور رجسٹرار لاہور ہائی کورٹ کو فریق بنایا ہے۔ آئینی درخواست کو آئین کے آرٹیکل 164(3) کے تحت دائر کیا گیا جس میں کل 132 نکات کو اٹھایا گیا ہے۔ چیف جسٹس نے صدارتی ریفرنس سمیت صدر اور سپریم جوڈیشل کونسل کی جانب سے ان کو غیر فعال کرنے اور جبری رخصت پر بھجوانے سے متعلق احکامات اور نوٹیفکیشن کو بھی چیلنج کیا گیا ہے۔ چیف جسٹس نے درخواست کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جس میں سیکشن نمبر 1 میں (132) نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ سیکشن کے حصہ A میں 14 نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ جس میں سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل اور اتھارٹی کو چیلنج کیا گیا ہے۔ حصہ B میں جانبداری کے معاملے کو اٹھایا گیا ہے جس میں مختلف 38 نکات بیان کیے گئے ہیں۔ حصہ C میں ریفرنس کے بدنیتی پر مبنی ہونے اور کثیر المقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔ جس میں سوال کیا گیا ہے کہ کیا سپریم کورٹ کے اسٹیل ملز کیس کی روشنی میں ریفرنس کو فائل کرنے کے لیے وزیر اعظم کی ایڈوائس بدنیتی پر مبنی نہیں ہے جس فیصلے نے وزیر اعظم کو واضح طور پر ہراساں کیا ہے۔ کیا چیف جسٹس کی سربراہی میں جاری احکامات اور گوادر زمین کی الاٹمنٹ، پارک کو کمرشل پلازہ میں تبدیل کرنے، نیومری پروجیکٹ کیس، صدر کے عرصہ صدارت کے دوران لا پتہ افراد کے کیس میں ایکشن لینے کی روشنی میں ریفرنس بدنیتی پر مبنی نہیں ہے اور کیا چیف جسٹس نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا اور صدر نے اس حوالے سے آپشن دیے تو اس صورت میں یہ ریفرنس اس ردعمل کے نتیجے میں بدنیتی پر مبنی نہیں ہے۔ کیا کسی کو حراست میں لے کر استعفیٰ دینے پر مجبور کرنا قانونی طور پر درست اقدام ہے اور اس کے علاوہ ان کے ٹیلی فون کاٹ ڈالنا ٹی وی کنکشن کاٹ دینا اور بدسلوکی وغیرہ کرنا درست اقدام ہیں۔ حصہ D میں غیر ضروری جلد بازی کے متعلق مختلف سوالات اٹھائے گئے ہیں حصہ E میں غیر قانونی معطلی، کام سے روکنے اور جبری رخصت پر بھجوانے سے متعلق سوالات سامنے آتے ہیں۔ حصہ F میں قائم مقام چیف جسٹس کے غیر قانونی طور پر عہدہ سنبھالنے جب کہ حصہ G میں عدلیہ کی آزادی اور اختیارات کی تقسیم جب کہ حصہ H میں ان کیمرہ سماعت اور حصہ J میں مزید اثرات سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ درخواست کے سیکشن (2) میں حقائق کو بیان کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ چیف جسٹس نے اپنی مدت ملازمت کے دوران یقینی طور پر صدر مملکت، وزیر اعظم اور ان کے دیگر قریبی رفقائے کار کی ناراضگی حاصل کی۔ کیوں کہ درخواست گزار نے انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے متعلق 6 ہزار درخواستوں پر از خود نوٹس لیے۔ چیف جسٹس نے دیگر متعدد مقدمات اور نوٹس کے علاوہ منوبھیل خاندان کے اغوا کے خلاف نوٹس لیا جس میں پیر پگاڑا کے قریبی ساتھی عبدالرحمٰن مری کو گرفتار کیا گیا۔ سپریم کورٹ نے اہم مقدمات کو نمٹایا اور کچھ زیر التوا ہیں۔ ان مقدمات میں صدر کی وردی اور صدر کے عہدے سے متعلق درخواستیں شامل ہیں جن کی مارچ کے مہینے میں سماعت ہونی تھی اور حکومت اس سے اچھی طرح واقف تھی۔ صدر نے

درخواست گزار کو 9 مارچ کو راولپنڈی میں واقع اپنے دفتر میں بلایا جہاں پر وزیراعظم بھی موجود تھے۔ اس موقع پر وہاں پر کچھ افراد بھی موجود تھے۔ چیف جسٹس نے کہا صدر اور وزیراعظم کے علاوہ جو دیگر افراد صدارتی کیمپ آفس میں موجود تھے کسی مناسب وقت پر بیان حلفی کے ساتھ ان کے ناموں کا انکشاف کیا جائے گا۔ جہاں پر چیف جسٹس کے خلاف بے بنیاد الزامات لگائے گئے جن کو پہلے ہی ایک وکیل نے خط کے ذریعے بیان کیا تھا چیف جسٹس کو وہاں پر آپشن دیئے گئے اور استعفیٰ دینے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس موقع پر ہر قسم کی آفرز کی گئیں۔ جب چیف جسٹس نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا تو صدر مملکت شدید تذبذب کا شکار ہو گئے۔ چیف جسٹس کو جسمانی طور پر شام 5 بجے تک صدارتی کیمپ آفس میں روکا گیا۔ ان کی کیمپ آفس میں موجودگی کے دوران قائم مقام چیف جسٹس نے حلف اٹھا لیا اور شام کو سپریم جوڈیشل کونسل کا غیر شیڈولڈ اجلاس منعقد ہوا جس میں اٹارنی جنرل نے اجلاس میں شرکت کی۔ سوال ابھرتا ہے کہ اٹارنی جنرل کیسے اور کب اجلاس میں شرکت کے لیے پہنچ گئے۔ درخواست میں مختلف گراؤنڈ بیان کرتے ہوئے سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل، سپریم جوڈیشل کونسل میں تین فاضل ممبران کے جانبدار ہونے، ریفرنس کے بدنیتی پر مبنی ہونے اور کثیر المقاصد استعمال کے لیے دائر کرنے سمیت دیگر گراؤنڈز کو بیان کیا گیا ہے۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ وزیراعظم کے مشورے سے چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیا گیا جب کہ اسٹیل ملز کیس میں چیف جسٹس نے فیصلہ تحریر کیا تھا جس میں وزیراعظم کو (Serious Omission and Commission میں ملوث قرار دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وزیراعظم کو قومی اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک کا سامنا کرنا پڑا۔ جب کہ نیب اور دیگر اتھارٹیز وزیراعظم کے خلاف ایکشن لینے میں ناکام رہیں۔ چیف جسٹس نے اپنی درخواست میں یہ بھی کہا کہ ان کو غیر قانونی طور پر معطل کیا گیا اور جبری رخصت پر بھجوانا اور قائم مقام چیف جسٹس کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ان کیمرہ ٹرائل مکمل طور پر غیر قانونی ہے جس سے درخواست گزار کے بنیادی حقوق کی نفی ہوئی ہے۔



چیف جسٹس کی آئینی درخواست پر صدر کا جواب

چیف جسٹس چودھری محمد افتخار کی جانب سے سپریم کورٹ میں دائر آئینی درخواست کے جواب میں صدر مملکت اور وفاق کی جانب سے جواب داخل کر لیا گیا جس میں مختلف حقائق اور موقف کو بیان کرتے ہوئے فاضل عدالت سے استدعا کی گئی کہ حکومت کے جواب میں عبارت کیے گئے حقائق کی روشنی میں چیف جسٹس کی آئینی درخواست کو ناقابلِ سماعت دے کر خارج کر دیا جائے۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ آئین کے آرٹیکل (184)(3) کے تحت چیف جسٹس اپنی درخواست دائر نہیں کر سکتے تھے۔ چیف جسٹس کی اپنی درخواست میں پریس رپورٹ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پریس رپورٹس کوئی شہادت نہیں اور پٹیشن میں کسی بھی مقصد کے لیے استعمال نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ چیف جسٹس نے اپنی آئینی درخواست میں ان کو نظر بند کرنے، سہولتوں کو واپس لینے، وکلاء سمیت دیگر شخصیات کو ان سے ملاقات کی اجازت نہ دینے سے متعلق حقائق کو مختلف اخبارات کی خبروں کے تراشوں کے ثبوت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ صدر نے کہا کہ چیف جسٹس نے اپنی آئینی درخواست میں جو اعتراضات اٹھائے ہیں اسی طرح کے اعتراضات کو انہوں نے سپریم جوڈیشل کونسل میں بھی چیلنج کیا ہے جو کہ پہلے ہی کونسل کی زیر سماعت ہیں اس لیے آئینی درخواست قابل سماعت نہیں۔ صدر نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس دائر کیا۔ قبل ازیں مسٹر جسٹس جاوید اقبال کی قائم مقام چیف جسٹس جبکہ پاکستان واپسی پر مسٹر جسٹس رانا بھگوان داس کی قائم مقام چیف جسٹس کے عہدے پر تقرری مکمل طور پر آئین اور قانون کے مطابق ہے۔

سپریم جوڈیشل کونسل مناسب طور پر تشکیل دی گئی ہے درخواست گزار کے خلاف ریفرنس میں سماعت کرنا اس کے اختیار میں ہے اور کونسل میں ریفرنس پر قانون اور آئین کے مطابق کارروائی جاری ہے۔ چیف جسٹس نے اپنی آئینی پٹیشن میں 132 نام نہاد قانونی نکات بیان کیے ہیں لیکن سرسری جائزہ لینے کے بعد ان کو یک نکاتی نکتے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ 132 نقاط کا مقصد صرف عدلیہ پر بوجھ بڑھانے کے مترادف ہے۔ جس میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ اس میں غیر معمولی نوعیت کے متعدد ایشوز ملوث ہیں لیکن یہ کیس نہیں ہے۔ معیار کو مقدار میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مزید کہا ہے کہ چیف جسٹس صاحب کے خلاف آرٹیکل 209 کے تحت مکمل طور پر درست اختیارات کے تحت صدارتی ریفرنس دائر کیا گیا ہے، جو کہ آئین کے آرٹیکل 209 کی خلاف ورزی نہیں ہے اور قائم مقام چیف جسٹس کی آئین کے مطابق تقرری کی گئی تھی۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری قانون سے بالاتر نہیں اور نہ ہی وہ احتساب سے بالاتر ہیں۔ چیف جسٹس بھی سپریم کورٹس کے ایک جج ہیں اور آرٹیکل 209 کے تحت ان کے کنڈکٹ کے بارے میں انکوائری ہو سکتی ہے۔ جب چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیا گیا تو اس صورت میں وہ انتظامی امور سرانجام نہیں دے سکتے۔ ریفرنس دائر ہونے کے بعد چیف جسٹس نے سیاسی ریلیاں منعقد کیں اور سیاسی نوعیت کی تقریریں کیں اور عدالتی آداب کی مخالفت کرتے رہے، بڑی تعداد میں سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں بھی کی ہیں، چیف جسٹس سمیت سپریم کورٹ کے تمام جج صاحبان کے کنڈکٹ کے بارے میں صرف سپریم جوڈیشل کونسل ہی کارروائی کر سکتی ہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل کے علاوہ کسی بھی فورم کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی جج کے کنڈکٹ کے خلاف کارروائی کرے۔ کونسل کو آئین اور قانون کے مطابق تشکیل دیا گیا ہے۔ کونسل چیف جسٹس کے خلاف ٹرائل نہیں کر رہی جس طرح کہ تجویز کیا جا رہا ہے بلکہ صرف انکوائری کر رہی ہے جو کہ آرٹیکل 209 کے تحت ہے۔ کونسل میں ریفرنس دائر کرنا مکمل طور پر آئینی ہے، صدر کی جانب سے ججوں کی جانب داری سے متعلق

جواب دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ درخواست گزار کے ہٹائے جانے کی صورت میں کونسل کا کوئی بھی جج براہ راست مستفید نہیں ہوگا۔ آئین کونسل کے ممبران کی آٹومیٹک یا درخواست گزار کی خواہشات کے مطابق تبدیلی کی بات نہیں کرتا اور اس بات کو بھی مسترد کیا جاتا ہے کہ کونسل میں شریک کوئی بھی جج چیف جسٹس کے خلاف ذاتی عناد رکھتا ہے یا پھر وہ جانب دار ہے، یہ صرف کونسل کے ممبران پر ہی منحصر ہے کہ وہ کونسل میں بیٹھ کر سماعت کرنا چاہتے ہیں یا نہیں، اور اس بات کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ کونسل میں کسی بھی ممبر کو کوئی مفاد ہے۔ صدر نے اپنے جواب میں اس بات کی تردید کی ہے کہ چیف جسٹس کے خلاف کسی بھی بدنیتی پر مبنی ریفرنس دائر کیا گیا ہے بلکہ چیف جسٹس کے خلاف دائر کیا جانے والا ریفرنس مکمل طور پر آئینی ہے اور اس بات کی بھی تردید کی گئی ہے کہ سپریم کورٹ کے اسٹیل ملز کیس کے نتیجے میں وزیراعظم کی ریفرنس کا مشورہ دینے میں کوئی بدنیتی شامل تھی۔ وزیراعظم کے مشورے سے سٹیل ملز کیس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ریفرنس کسی بھی ردعمل کا نتیجہ نہیں ہے جبکہ چیف جسٹس کی جانب سے ان کو حراست میں رکھ کر استعفیٰ کے لیے مجبور کرنا، گھر کے ٹیلیفون کنکشن کاٹنا یا ٹی وی کے کنکشن منقطع کرنے سمیت دیگر الزامات درست نہیں ہیں۔ جواب میں اس بات کو بھی رد کیا جاتا ہے کہ اس حوالے سے کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے، نہ تو قائم مقام چیف جسٹس نے کسی جلد بازی میں حلف لیا اور نہ ہی ان کو کسی طرح جسمانی طور پر روکا گیا۔ صدر نے چیف جسٹس کے خلاف جبری رخصت سمیت دیگر احکامات کو جاری کرتے ہوئے آئین اور قانون کے مطابق اختیارات کو استعمال کیا اور ریفرنس سے متعلقہ تمام اقدامات قانونی ہیں۔ صدر کے جواب میں چیف جسٹس کے دیگر الزامات کو بھی مسترد کر دیا گیا ہے۔ صدر کی جانب سے سپریم کورٹ کیس کی پیروی حکومت کے سینئر مشیر سید شریف الدین پیرزادہ کر رہے ہیں۔ جب کہ ان کے ساتھ حکومتی پینل میں راجہ محمد ابراہیم ستی، ملک محمد قیوم، احمد رضا خان قصوری اور دیگر وکلاء شامل ہیں۔ واضح رہے کہ صدر کے وکلاء نے قبل ازیں 5 رکنی لارجر بنچ کی تشکیل کے خلاف بھی اعتراضات داخل کیے تھے جن میں فاضل جج صاحبان کی سنیارٹی کے بارے میں اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔



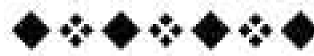
چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا بیان حلفی

(اُردو)

''میں مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری چیف جسٹس آف پاکستان حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میں نے آئین کے آرٹیکل (3)184 کے تحت 9 مارچ کو دائر کئے گئے ریفرنس نمبر 43/2007 اور نوٹیفکیشن نمبر F.1(2)/2005 کے خلاف درخواست دائر کی ہے کیونکہ مجھے غیر قانونی طور پر فاضل عدالت کے جج اور چیف جسٹس آف پاکستان کی حیثیت سے آئینی ذمہ داریاں ادا کرنے سے روکا گیا ہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل نے آرڈر جاری کیا 15 مارچ کو مجھے جبری رخصت پر بھیج دیا گیا جس سے سپریم جوڈیشل کی ساکھ، آئینی امور اور کونسل کی سماعت پر منفی اثرات پڑے۔ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ اس میں دی گئی معلومات میرے علم کے مطابق درست ہیں اور کچھ نہیں چھپایا گیا۔ میں نے 9 مارچ کو بطور چیف جسٹس آف پاکستان دن ساڑھے دس بجے تک کئی مقدمات کی سماعت کی۔ جس کے بعد میں کام ادھورا چھوڑ کر صدر پاکستان سے ملاقات کے لئے آرمی ہاؤس چلا گیا اور باقی بنچ نے دوبارہ ان کے بغیر کام کیا۔ میں تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اپنے سٹاف/ پروٹوکول سٹاف کے ساتھ آرمی ہاؤس پہنچا۔ وزٹر روم میں انتظار کیا جس کے 5 منٹ بعد صدر وردی میں اپنے ایم ایس اور اے ڈی سی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ جونہی صدر اپنی کرسی پر بیٹھے متعدد ٹی وی کیمرہ مین کمرے میں داخل ہو گئے جنہوں نے موی بنائی اور تصاویر اتاریں۔ صدر نے سارک لاء کانفرنس، سارک چیف جسٹس کانفرنس اور سپریم کورٹ کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں تقریب کے اختتامی سیشن کی بات کرتے ہوئے یہ کہا کہ ان کو پشاور ہائی کورٹ کے ایک جج کی جانب سے میرے خلاف ایک شکایت موصول ہوئی ہے جس پر میں نے بتایا کہ یہ شکایت درست حقائق پر مبنی نہیں ہے کیونکہ اس فاضل جج صاحب کے کیس کا دو رکنی بنچ نے فیصلہ کیا ہے اور اس بنچ کے دوسرے جج کو بھی اس میں ملوث کرنے کے لئے کوششیں کی گئی تھیں۔ جس پر صدر نے کہا کہ ان کے پاس اس کے علاوہ بھی ان کے خلاف کئی شکایات ہیں جس کے بعد صدر نے اپنے سٹاف کو دوسرے لوگوں کو بلانے کے لئے کہا۔ صدر کی ہدایت پر وزیراعظم، ڈی جی ایم آئی، ڈی جی آئی ایس آئی، ڈی جی آئی بی، سی او ایس اور دوسرے افسران کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈی جی آئی بی اور سی ایس کے علاوہ تمام یونیفارم میں ملبوس تھے۔ صدر نے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے کاغذوں سے پڑھنا شروع کیا جو کہ ان کے ہاتھ میں تھے۔ جو الزامات لگائے جا رہے تھے ان کو ایڈووکیٹ نعیم بخاری کے بے بنیاد خط سے لیا گیا تھا جس پر میں نے ان الزامات کی سختی سے تردید کرتے ہوئے کہا کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں اور چیف جسٹس کو ذاتی طور پر اور عدلیہ کو بدنام کرنے کے لئے لگائے گئے ہیں۔ جس کے بعد صدر نے کہا کہ آپ نے اپنے خاندان کے استعمال کے لئے سپریم کورٹ سے کار حاصل کی ہے جس کی میں نے سختی سے تردید کی۔ جب صدر نے چیف جسٹس کے زیر استعمال مرسڈیز گاڑی کا تذکرہ کیا تو میں نے جواب دیا کہ ''یہ کار وزیراعظم نے خود ان کو بھجوائی ہے وزیراعظم یہاں موجود ہیں ان سے پوچھ لیں'' لیکن وزیراعظم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کو اپنے رویئے سے ظاہر کیا۔ صدر نے مزید کہا کہ آپ نے لاہور ہائی کورٹ کے امور میں مداخلت کی ہے اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی اکثر سفارشات کو منظور نہیں کیا۔ صدر اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ آپ کو استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ اگر آپ استعفیٰ دے دیتے ہیں تو آپ کو اکاموڈیٹ کر لیں گے اگر انکار کیا تو ریفرنس داخل کیا جائے گا اور ان کے لئے بہت زیادہ پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ''میں استعفیٰ نہیں دوں گا اور کسی بھی قسم کے ریفرنس کا سامنا کروں گا کیونکہ میں بے قصور ہوں میں نے کسی کوڈ آف کنڈکٹ یا قانون

کی خلاف ورزی نہیں کی ۔ مجھ کو یقین ہے کہ میں قانون کا محافظ ہوں میرا اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین ہے جو کہ میری مدد کرے گا۔'' جس سے صدر مشتعل ہو گئے ۔صدر غصہ سے اٹھے اور وزیراعظم اپنے ایم ایس اور سی او ایس کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے کہ اب دوسرے لوگ شواہد دکھائیں گے ۔ان کی صدر کے ساتھ تقریباً 30 منٹ ملاقات جاری رہی ۔چیف جسٹس نے کہا کہ صدر کے جانے کے بعد ڈی جی ایم آئی ، ڈی جی آئی ایس آئی اور ڈی جی آئی بی ان کے ساتھ موجود رہے ۔انہوں نے ایک بھی شہادت نہ دکھائی ۔حقیقت میں ڈی جی آئی ایس آئی کے علاوہ کسی کے پاس بھی کوئی ڈاکومنٹس موجود نہیں تھے ۔تاہم انہوں نے کہا کہ جب آپ بلوچستان ہائی کورٹ کے جج بنے تھے تو انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے بولان میڈیکل کالج میں ایک سیٹ حاصل کی ۔ڈی جی آئی بی کے علاوہ باقی نے اصرار کیا کہ ان کو استعفیٰ دے دینا چاہئے جب کہ میں نے سختی سے کہا کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں ۔بعد کے گھنٹوں میں مجھے کمرے میں رکنے پر مجبور کیا گیا کچھ وقت تمام افراد نے کمرے کو چھوڑ دیا لیکن ان کو جانے کی اجازت نہ دی ۔یہ بات عیاں تھی کہ ان کو ایک کلوز سرکٹ کیمرے کی مدد سے دیکھا جا رہا تھا ۔جونہی میں نے باہر جانے کے لئے دروازہ کھولنے کی کوشش کی ایک آفیسر سامنے آ گیا اور اس نے باہر جانے سے روکا ۔میں نے باہر جانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر ملٹری افسران نے ان کو رکنے کے لئے کہا ۔ایک مرتبہ بتایا گیا کہ صدر ان سے دوبارہ ملاقات کریں گے ۔ایک مرتبہ میں نے درخواست کی کہ کم از کم میرے پروٹوکول آفیسر کو کمرے میں بلا دیں کیونکہ وہ اس سے بات کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بتایا گیا کہ وہ اندر نہیں آ سکتے ۔جس کے بعد میں نے درخواست کی کہ ان کے پروٹوکول سٹاف کو یہ بتا دیا جائے کہ وہ میرے گھر یہ اطلاع دے دیں کہ وہ آرمی ہاؤس میں ہیں اور ان کا لاہور جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا ہے ۔کمرے اور آرمی ہاؤس کو چھوڑنے کی متعدد بار کوششیں کرنے کے باوجود مجھے مختلف حیلوں بہانوں سے وہاں روکا گیا اور چیف جسٹس کی کار کو پورچ میں لانے کی درخواست کو بھی مسترد کر دیا گیا ۔صدر سے 30 منٹ کی ملاقات کے بعد مجھے مرضی کے برعکس شام 5 بجے تک آرمی ہاؤس میں رکھا گیا ۔5 بجے کے بعد ڈی جی ایم آئی نے بتایا کہ گھر جانے کے لئے ان کی کار باہر موجود ہے ۔ڈی جی ایم آئی باہر آئے اور بتایا کہ ''یہ ایک برا دن ہے اب آپ کے راستے جدا ہیں اور آپ کے لئے یہ اطلاع ہیں کہ آپ کو بطور جج اور چیف جسٹس آف پاکستان کام کرنے سے روک دیا گیا ہے ۔'' ان کی چیف جسٹس کی گاڑی سے دونوں جھنڈے اتار لئے گئے تھے ۔سٹاف آفیسر نے ان کو بتایا کہ مسٹر جسٹس جاوید اقبال نے قائم مقام چیف جسٹس کے عہدے کا حلف اٹھا لیا ہے جو ٹی وی پر دکھایا گیا ہے اور ڈرائیور نے کہا کہ اس کو کہا گیا ہے کہ چیف جسٹس کو سپریم کورٹ نہ لے جایا جائے بلکہ گھر لے جایا جائے ۔راستے میں میں نے ڈرائیور کو سپریم کورٹ جانے کے لئے کہا لیکن ایک آرمی آفیسر نے ان کی گاڑی کو سپورٹس کمپلیکس کے نزدیک روک لیا اس موقع پر ایس پی طارق مسعود یٰسین آ گئے ۔اس نے ڈرائیور اور گن مین کو گاڑی سے باہر آنے کا حکم دیا تا کہ وہ چیف جسٹس کی گاڑی کو خود چلائے ۔میں نے اس پر جواب دیا ''او کے میں سپریم کورٹ نہیں جاؤں گا لیکن میرا ڈرائیور میری گاڑی چلائے گا اور میرا گن مین مجھ کو گھر تک اسکارٹ کرے گا'' جس پر ایس پی راضی ہو گئے کہ ان کی گاڑی ان کا ڈرائیور ہی چلائے گا ۔میں 5 بج کر 45 منٹ پر گھر پہنچا اور اپنے گھر میں پولیس افسران اور یونیفارم کے بغیر ایجنسیوں کے افراد کو دیکھ کر حیران رہ گیا ۔میرے فون کو پہلے ہی منقطع کر دیا گیا تھا موبائل فون ، ٹی وی کیبل اور ڈی ایس ایل کو جام اور منقطع کر دیا گیا تھا ۔میرے اور میرے خاندان کا کئی روز تک باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع کر دیا گیا ۔رات 9 بجے کے قریب میری مرسڈیز گاڑی سمیت سرکاری استعمال کے لئے گاڑیوں کو ایک لفٹر کے ذریعے اٹھا لیا گیا ۔اسی رات ایک کار کو واپس بھی لایا گیا لیکن کسی کو بھی کار کی چابی نہ دی گئی ۔10 مارچ کو مجھے سپریم جوڈیشل کونسل کی جانب سے ایک نوٹس موصول ہوا جس پر پتہ چلا کہ صدر نے میرے خلاف ایک ریفرنس فائل کیا ہے اور کونسل کی جانب سے مجھے کام سے روکنے کے حکم کی کاپی بھی منسلک تھی ۔میرے لئے حیران کن بات تھی کہ 9 مارچ کو 6 بجے کے بعد میرے خلاف ریفرنس کی جلد بازی میں سماعت کی گئی ۔دو ممبران کو سپیشل فلائٹ سے لاہور اور کراچی سے لایا گیا ، حقیقت میں سیکرٹری کونسل ڈاکٹر فقیر حسین نے کونسل کے اجلاس کو کال نہیں کیا تھا اور کسی نے بھی اجلاس کے ایجنڈے کو جاری نہیں کیا تھا ۔میرے سات سالہ بچے اور خاندان کے ہمراہ 9 مارچ کی شام سے 13 مارچ تک محبوس رکھا گیا ۔وہ کوئی گاڑی استعمال نہ کر سکے کیونکہ استعمال کے لئے کوئی گاڑی موجود نہ تھی ۔مجھے پیدل سڑک کی دوسری جانب جانا پڑا ۔پولیس افسران

میرے سامنے آئے اور میرے ساتھ بدسلوکی کی جو کہ جوڈیشل انکوائری میں بھی ثابت ہو چکی ہے۔ سپریم کورٹ سٹاف اکثر لاپتہ رہا اور ان کو نامعلوم مقام پر رکھا گیا۔ اور ان پر جبری ہتھکنڈے استعمال کر کے میرے خلاف جھوٹی شہادتیں تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور میرے گھر میں کام کرنے والے ملازمین کو لے جایا گیا اور ایجنسیوں کے افسران کے سامنے ان کو پیش کیا گیا اور گھریلو استعمال کی اشیاء لانے والے آدمی کو چیزیں لانے کیلئے جانے کی اجازت نہ دی۔ اس کو بھی اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا جب تک کوئی ایجنسی آفیسر اس کے ساتھ مارکیٹ نہ جاتا اور پھر اس کو اپنے ساتھ واپس نہ لے آتا۔ میرے سپریم کورٹ میں چیمبر کو سیل کر دیا گیا اور وہاں سے کچھ فائلوں کو ہٹا لیا گیا اور نئے مقرر ہونے والے رجسٹرار کی سربراہی میں کچھ فائلوں کو آئی ایس آئی کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ طریقہ عدالتی آداب کے منافی تھا۔ بھاری نفری کو تعینات کر دیا گیا۔ کسی کو بھی آزادانہ ان سے ملاقات کی اجازت نہ دی گئی۔ سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج جسٹس (ر) منیر اے شیخ کو بھی ملاقات کی اجازت نہ دی گئی۔ میرے بچوں کو سکول اور یونیورسٹی جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ میری فیملی سمیت بنیادی ضروریات زندگی، دوا اور ڈاکٹر وغیرہ سے محروم کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ کونسل کے آڈر کے باوجود ان کے اپنے وکلاء کی ملاقات سے محروم رکھا گیا۔ مجھے اور میرے خاندان کو ذہنی وجسمانی وجذباتی کرب، ٹارچر اور پریشانی کا سامنا کرنے پر مجبور کیا گیا یہ الفاظ ان واقعات کا احاطہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ استعفیٰ کی خاطر دباؤ ڈالنے کیلئے تمام حربے استعمال کئے گئے لیکن تیرہ مارچ کے بعد جب میں کونسل کے روبرو اپنے وکلاء کی ٹیم کے ساتھ کچھ روابط قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور سولہ مارچ کے بعد استعفیٰ کے لئے دباؤ کچھ حد تک کم کر دیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے تمام گھر کی جاسوسی ہو رہی ہے اور گھر کے سامنے سندھ ہاؤس میں پولیس کے علاوہ ایجنسیوں کے افراد نے ایک ایسی جگہ بنالی ہے جہاں سے میرے گھر ملاقات کیلئے آنے اور جانے والوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔ ان واقعات کی وجہ سے میرے بچے سخت ڈرے ہوئے ہیں اور سکول یا یونیورسٹی بھی نہیں جا سکتے۔ نتیجے کے طور پر میری ایک بیٹی امتحانات نہیں دے سکی۔ جبکہ میری دوسری بیٹی کو حاضری کی کمی کی وجہ سے امتحانات کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ میں جن حالات سے گزر رہا ہوں ان کی وجہ سے میرا چھوٹا بیٹا بھی اس پوزیشن میں نہیں کہ سکول جا سکے۔''



Text of Chief Justice's Affidavit

Following is the text of affidavit filed by Chief Justice Iftikhar Muhammad Chaud in the SupremeCourt on Tuesday.

Text begins:

"IN THE SUPREME COURT OF PAKISTAN (Orginal Jurisdiction)

In Re: Constitutional Orginal Petition No: _________ /2007 Chief Justice Pakistan, Justice Iftikhar Muhammad Chaudhry, Chief Justice House, Islamabad Petitioner

VERSUS

The President of Pakistan, The Referring Authority, Presidency, Islamabad! OTHERS

Respondents

AFFIDAVIT OF THE PETITIONER,

Chaudhry,

Chief Justice of Pakistan,

I, Mr. Justice Iftikhar Muhammad Chaudhry, The Chief Justice of Paks (hereinafter referred to as the "deponent") do hereby solemnly affirm and state oath as follows:

That the deponent has filed the titled petition in this Hon'ble Court under Ar 184(3) of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan 1973, inter alia, assa the Reference No. 43/2007; 3-9-2007 Notification No. F.1 (2)/2005.A.II da 09-03-2007, whereby the deponent was illegally and unlawfully restrained to perfor his constitutional funcitons as a judge of this Hon'ble Court and as Chief Justice Pakistan; Order dated March 09, 2007passed by the Supreme Judicial Cou Notification No.F.1(2)2005.A.II dated 15-03-2007 whereby the deponent was sent compulsory leave with retrospective effect and the constitution and competence the Supreme Judicial Council as well as the mode and manner of the proceedi before the Council.

This affidavit is being filed in support of the contentions, assertions and ple raised in the above titled petition. The deponent verifies that the contents of the ti affidavit are true and correct to the best of his knowledge, information and belief a nothing has been concealed. In addition to the facts narrated in the titled petition; deponent states that:

On March 09, 2007, the deponent headed Bench No.1 of this Hon'ble Court Chief Justice of Pakistan and heard several cases till about 10.30 am. The Be rose briefly and had to reassemble for the day except the deponent who left for th Army House, Rawalpindi to meet the President of Pakistan (hereinafter referred to "Respondent").

The deponent arrived at Army House, Rawalpindi about 11:30 am along with staff/protocol staff. The deponent was shown to a waiting room/visitors room. Afte

five minutes of his arrival, the Respondent, wearing his Military Uniform came the room along with his MS and ADC. As soon as the Respondent took his sea number of TV cameramen and photographers were also ushered into the roc They took several pictures and made movie footage.

While discussing the SAARC Law Conference, SAARC Chief Justice Conference and the concluding session of the Golden Jubilee ceremony of Supreme Court, the Respondent said that a complaint against the deponent been received by his (Respondent) from a Judge of the Peshawar High Court. T deponent replied that it was not based on true facts as his case had been decided a two member bench and that attempts were being made to maliciously involve other member of the Bench as well. On this the Respondent said that there are a f more complaints against the deponent as well. After saying so, he directed his st to call the other persons.

On the direction of the Respondent, the 'other persons' entered the room. Th included the Prime Minister, DG MI, DG ISI, DG IB, COS and another officia officials (except DG, IB and COS) were in uniform.

The Respondent started reading from small pieces of paper with notes on th which he had in his hand. There was no single consolidated document. T allegations which were being put to the deponent had been taken from the conte of a notorious letter written by Mr. Naeem Bukhari with absolutely no substance them. The deponent strongly refuted these allegations as being baseless a engineered to defame him personally and the judiciary as a whole. The depon promptly denied the veracity and credibility of these allegations as well.

On this the Respondent said that the deponent had obtained cars from Supreme Court for his family. The allegation was vehemently denied by deponent. The Respondent went on to say that the deponent wasinbe driven in a Mercedes, to which the deponent promptly replied 'here is the Prime Minister, him, he has sent the Car himself'. The PM did not reply to this answer even gesture. Surprisingly the Respondent went on to say that the deponent h interfered in the affairs of Lahore High Court and had not accepted and taken he of most of the recommendations of the Chief Justice of Lahore High Court.

The Respondent insisted that the deponent should resign. The Respondent said that in case of deponent's resignation, he (the Respondent) wou 'accommodate' him (the deponent). He also said in case of refusal to resign, deponent will have to face the reference which could be a bigger embarrassment the deponent. The deponent finally and more resolutely said 'I wouldn't resign would face any reference since I am innocent; I have not violated any code conduct or any law, rule or regulation; I believe that I am myself the guardian of lav strongly believe in God who will help me. This ignited the fury of the Respondent; stood up angrily and left the room along with his MS, COS and the Prime Ministe Pakistan, saying that other would show evidence to the deponent. (This has no been admitted by the Respondent in his interview given to AAJ TV). The mee continued for not more that 30 minutes.

The DG MI, DG ISI and DG IB remained behind and continued to sit with deponent. They did not show the deponent a single piece of evidence. In fact, official except DG ISI had some document with him but he also did not show thing to the deponent. They, however, said that the deponent had secured a seat his son in Bolan Medical College when the deponent was serving as a Judge Balochistan High Court. They (except DG, IB) insisted that deponent resign while

deponent continued to assert strongly that the allegations were baseless and fo collateral purpose.

During the subsequent hours the deponent was forced to stay in that roo Sometimes, all persons would leave the deponent alone in that room but would allow the deponent to leave it. It was obvious that the deponent was being watch by a close circuit camera because whenever he tried to open the door to go out, was confronted by an officer who prevented the exit of the deponent; several time the deponent expressed the desire to leave but was told by military officials stay/wait. Once the deponent was even told that respondent would be seeing h again. At one point, the deponent requested at least his staff/protocol officer called inside the room as the deponent wanted to talk to him but was told that could not come inside. The deponent then requested that that his staff/proto officer be told to pass on the message to the deponent's family that he was at Ar House, Rawalpindi and that his programme to go to Lahore had been cancelled.

Despite several attempts to leave the room and the Army House, the depon was made to stay there on one pretext or the other. His request to bring his car to t porch for departure was also denied. After the first meeting with the Responde which lasted for not more tha 30 minutes, the deponent was kept there 'absolute against his will' till past 5 pm.

After 5 pm, DG MI came in again and told the deponent that his car was outsi to drive him 'home'. DG, IMcame out of the room and once outside told th deponent, 'this is a bad day, now you are taking a separate way and you a informed that you have been "restrained to work as a judge of the Supreme Court Chief Justice of Pakistan".

When the deponent saw the car of the Chief Justice of Pakistan, he discover that his car had been stripped of both the flag of Pakistan and emblem flag. The s officer of the deponent informed him that Mr. Justice Javed Iqbal has taken oath Acting Chief Justice and it had been shown on TV. The driver also informed deponent that he has been instructed not to take the deponent to the Supreme C while way to the resident of the deponent.

While on the way, the deponent directed the driver to go to Supreme Court an Army official prevented the deponent's car near the Sports Complex fr proceeding further. In the meanwhile Mr. Tariq Masood Yasin, SP, also appea He ordered the driver to come out of car so that he could drive the deponent a also asked the deponent's gunman to come out of the car as well. The depon said 'okay, I will not go to the Supreme Court but my driver will drive my car and gunman will escort me home'. Only the did Mr. Tariq Masood Yasin, SP agree let the car be driven by deponent's driver.

The deponent got home at about 5.45 pm and was shocked to see police offic and agencies personnel without uniform all over his residence. The deponent a discovered that landline phones had already been disconnected; Cell phones, Cables and DSL had been jammed or disconnected. The deponent and his fa were completely cut off for several days from the outside world.

By 9 pm, March 09, 2007, the vehicles which were in official use of the depone including the Mercedes had been taken away by means of a lifter. Latter on, same night, one vehicle was brought back but the key was not handed over to deponent or someone on his behalf.

On March 10, 2007, the deponent received a 'Notice' from Supreme Judi Council ("Council") whereby the deponent came to know that a Reference (N

43/2007) had been filed by the Respondent before the Council. There was als copy of the Order passed by the Council whereby deponent had been restrained function as a Judge of the Supreme Court and or Chief Justice of Pakistan. The c of the foresaid Reference had also been appended with the Notice with out a annexure or supporting documents for perusal of the deponent.

It was also surprising for the deponent to note that the aforesaid reference car up for hearing on March 9, 2007 after 7 pm in indecent haste. Two members of Council as was evident from news published in daily Nawa-i-waqt dated March 1 2007, had been flown to Islamabad in special flights, from Lahore and Karachi sir to participate in a meeting of the Council. In fact, no meeting had been called by Secretary of the Council namely Mr. Faqir Hussain. No one had issued either age for the meeting or notice thereof.

The Council rather than merely scrutinizing the material, if at all and serv notice on the deponent (without prejudice to the rights and interest of the depon as averred in the titled petition), went ahead and passed an order very detrimental the interests of the deponent as wells the interests of the institution. The deponer was restrained to perform his function as a Judge of the Supreme Court and or Ch Justice of Pakistan.

The deponent further states that he had been detained along with his fam members including his infant child of seven years from the evening of March 9, 20 till March 13, 2007. The personal and private life of the deponent and his fa suffered a great shock and the concept of privacy appeared as if it was an impote word. The deponent could not use any vehicle since there was none. The depone had to walk till the other send of the road when the police officer confronted him a manhandled him as has now been established by a judicial enquiry.

The Supreme Court staff attached to the deponent was reportedly missing a had been kept at an unknown place. An attempt was being made to fabricate evidence through them by coercive means against the deponent. Even ot employees working at the residence of the deponent were taken and made appear before some agency officials. They were releasedftar 2/3 days. The grocery man was not allowed to collect grocery; he was made to wait till an agency offici accompanied him to the market and back.

The chamber of the deponent was sealed and certain files lying therein we removed and some of them had been handed over to the ISI under the supervi of the newly appointed Registrar. Such an act was contrary to all norms ar practices of judiciary. The deponent being the CJP was entitled to occupy t chamber along with his staff.

On account of deployment of heavy contingents, no one was allowed to meet t deponent freely, in as much as his colleagues were not allowed access to meet hi Even a retired judge of this Hon'ble Court Mr. Justice (R) Munir A Sheikh was allowed to meet the deponent.

The deponent was not all alone to suffer this agony. Even his children were r allowed to go to school, college and university. The deponent and his fam members were deprived of basic amenities of life, i.e. medicines and Doctors, etc.

Even when ordered by the Council, the deponent was deprived of the assistan of his counsels to seek legal assistance regarding legal and factual issues involv in the reference. The deponent and his family have been made to go through a lo mental, physical and emotional agony, torture and embarrassment, and words co never be enough to properly and adequately express that.

All these tactics were used to put pressure on the deponent so that he m tender his resignation from the office of the Chief Justice of Pakistan. But after Ma 13, 2007 when the deponent succeeded in establishing at least some contact w his lawyers team during a brief appearance before the Council and after March 2007, the on going pressure to 'resign the office' was released to some extent.

The deponent now believes that his entire house has been bugged and at Sing House which is located right opposite the residence of the deponent, t officials of the agencies other than police have established a place therein to ke an eye on those who come and visit me, etc.

On account of the facts stated hereinabove, the children of the deponent are scared that they could not go to school or university. As a result thereof, one of n daughters failed to appear in her exams (1st year, Federal Board) whereas my oth daughter who is a student of Bahria university is not being allowed to take h examination (1st semester) due to lack of attendance in internal studies. My youn son is also not in a position to attend his school because of circumstances throu which I am passing.

Deponent

Verification:

Verified on oath this day of 2007 at Islamabad that the contents of the above affida are true and correct to the best of my knowledge, belief and information and noth has been concealed therein from the Hon'ble Court"



چیف جسٹس کے بیانِ حلفی پر ردِ عمل

سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر اور صدارتی ریفرنس میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکیل جناب منیر اے ملک نے گزشتہ دنوں اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا: ''پاکستانی عدلیہ ہمیشہ فوج کی بی ٹیم رہی ہے۔ اگر پاکستان کی عدالتیں عوام کی اے ٹیم بنی رہیں تو پاکستان میں کسی انقلاب کی ضرورت نہیں ہے۔'' آپ نے مزید کہا تھا: ''اب عدلیہ کے پاس (جناب افتخار محمد چودھری کے کیس کے حوالے سے) ایک سنہری موقع آیا ہے، اس سے (فائدہ اٹھا کر) وہ ماضی میں عدلیہ پر لگنے والے داغوں کو دھو بھی سکتی ہے اور ملک وعوام کے سامنے خود کر سرخرو بھی کر سکتی ہے۔''

لگتا ہے چیف جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چودھری اپنے عمل و کردار سے گزشتہ کچھ عشروں کے دوران عدلیہ کے چہرے پر لگنے والے سارے داغوں کو دھونے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لاریب طاقتوروں کے سامنے سر جھکانے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے سے یہ داغ لگے جو گزشتہ ساٹھ برسوں سے اپنی ''بہار'' دکھاتے چلے آ رہے ہیں۔ گزشتہ روز جناب افتخار محمد چودھری نے اپنے بیان حلفی (Affidavit) میں جو حقائق بیان کئے ہیں، انہیں پڑھ کر ہمیں تو شرم آ رہی ہے۔ چیف جسٹس صاحب نے (بہ امر مجبور اور تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق) اپنے حلفیہ بیان میں قوم کو جو آئینہ دکھایا ہے، اس میں تو ایسے چہرے دکھائی دے رہے ہیں جو اس سے قبل بھی ہمیں نظر آتے تو رہے ہیں لیکن مقتدر ترین اور باجبروت چہرے موہوم اور مبہم سے نظر آتے تھے، باریک چلمن اور پردے کے پیچھے چھپے ہوئے لیکن جناب چیف جسٹس نے ایک ہی جھٹکے سے یہ نقاب نوچ ڈالے ہیں۔ اب یہ چہرے بے نقاب اور برہنہ ہوئے ہیں تو ہمیں نظر آیا ہے کہ 9 مارچ کو پاکستان کی تاریخ کا وہ سیاہ دن تھا، جب سینئر جرنیل چیف جسٹس آف پاکستان کو ''کول'' کر دھمکیاں دے رہے تھے کہ استعفا دے کر گھر چلے جاؤ ورنہ پھر ریفرنس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریفرنس ابھی تیار نہیں تھا اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو محض اس کا ڈراوا دے کر استعفے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ کیسا جابرانہ اور قاہرانہ لمحہ ہوگا، جب کندھوں پر چمکتے دمکتے ستاروں والے جرنیل (ڈی جی ملٹری انٹیلی جنس، ڈی جی آئی ایس آئی اور چیف آف سٹاف) اور آئی بی کے سربراہ اپنے کمانڈ وصدر کی موجودگی میں اکیلے سویلین چیف جسٹس کو دھمکا رہے تھے۔

گزشتہ تقریباً پونے تین ماہ کے دوران ہم دائیں بائیں سے یہ تو سن رہے تھے کہ جس وقت باوردی صدر مملکت جنرل پرویز مشرف نے چیف جسٹس صاحب کو کیمپ آفس بلایا تھا اس وقت وہاں چند جرنیل اور بھی موجود تھے لیکن اس کی تصدیق یا تردید نہیں ہو رہی تھی۔ ان سینئر فوجی افسروں کی موجودگی کا سب سے پہلا انکشاف برادرم انصار عباسی (ایک انگریزی معاصر کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر) نے اپنی ڈائری میں کیا تھا، لیکن سرکاری حلقے اس کی بار بار تردید اور تکذیب کر رہے تھے، لیکن اب ان دہشت انگیز لمحوں کی تصدیق جناب افتخار محمد چودھری نے گزشتہ روز اپنے بیان حلفی میں کر دی ہے۔ یہ تصدیق ایسے لمحوں میں کی گئی ہے، جب صدر پاکستان اپنے خطاب اور خطبوں میں بار بار ارشاد فرما رہے تھے کہ اگر عدالت میں (چیف جسٹس کے ریفرنس کے حوالے سے) جھوٹ جیت گیا تو یہ رونے کا مقام ہوگا۔

اس سے قبل بھی صدر جنرل پرویز مشرف سے ایک انٹرویو میں جب استفسار کیا گیا تھا کہ آپ نے چیف جسٹس کو اپنے ہاں بلایا تھا تو وہاں جرنیل کیا کر رہے تھے؟ تو جناب صدر نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا: انہیں بعد میں بلایا گیا تھا...... لیکن اب تصویر کا دوسرا رخ سامنے آیا ہے تو بات واضح

ہوئی ہے کہ یہ باوردی اور باکمال صاحبان پہلے سے جناب صدر کے ساتھ موجود تھے، انہیں بعد میں صدر صاحب کے کیمپ آفس میں نہیں بلایا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی میڈیا میں ایک خبر آئی تھی کہ جب چیف جسٹس صاحب کیمپ آفس میں تھے تو وہاں موجود ایک جرنیل نے چیف جسٹس صاحب کو صرف ''افتخار'' کے نام سے بلایا تھا۔ اس غیر پارلیمانی، غیر قانونی اور پروٹوکول سے ماورا انداز تخاطب پر چیف جسٹس نے احتجاج کرتے ہوئے متعلقہ جنرل صاحب سے کہا تھا: ''آپ احتیاط کیجئے، میں اب بھی پاکستان کا چیف جسٹس ہوں۔''

گزشتہ روز 29 مئی 2007ء کو چیف جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چودھری نے اپنے بیان حلفی میں کہا: ''9 مارچ کو جب مجھے آرمی ہاؤس کے کیمپ آفس میں صدر جنرل پرویز مشرف نے بلایا تو مجھے کہا گیا کہ مستعفی ہو جاؤ، ہم آپ کو کہیں اور اکاموڈیٹ کر دیں گے۔ 9 مارچ کو صدر سے ملاقات کے وقت وزیر اعظم شوکت عزیز، ملٹری انٹیلی جنس، آئی ایس آئی، اور آئی بی کے سربراہوں کے علاوہ صدر کے چیف آف سٹاف بھی وہاں موجود تھے، جو استعفے کے لئے دباؤ ڈالتے رہے۔ صدر نے مجھے اہل خانہ کے لئے کاریں لینے، لاہور ہائی کے معاملات میں مداخلت اور چیف جسٹس کی سفارشات قبول نہ کرنے کا الزام لگایا اور استعفاد ینے کو کہا۔ میرے انکار پر وہ غصے میں کمرے سے نکل گئے۔ صدر سے ملاقات 30 منٹ جاری رہی۔ اس کے بعد مجھے پانچ گھنٹے زبردستی وہاں بٹھائے رکھا گیا۔ میں وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا تو مجھے بیٹھنے اور انتظار کرنے کو کہا جاتا رہا۔ پانچ بجے ڈائریکٹر جنرل ملٹری انٹیلی جنس آئے اور مجھے کہا کہ آپ گھر جا سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ یہ دن بہت برا تھا۔ اب آپ کا راستہ الگ ہو چکا، آپ بطور چیف جسٹس کام نہیں کر سکتے، کیونکہ نئے چیف جسٹس حلف لے چکے ہیں۔''

لمبے صبر کے بعد اب چیف جسٹس صاحب نے جو حلفیہ بیان دیا ہے اس کے مندرجات سے عیاں ہو گیا ہے کہ پاکستان کے مقتدر ترین اشخاص، طبقات اور ادارے پاکستان کے سب سے بڑے منصف کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی نظروں میں چیف جسٹس آف پاکستان کی کیا حیثیت ہے، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مقتدر ترین ادارے کے یہ اشخاص اور افراد اگر چیف جسٹس کی یہ تحقیر اور بے توقیری کر سکتے ہیں تو ان کی نظر میں باقی ''بلڈی سویلینز'' کی کیا قدر، حیثیت اور اوقات ہوگی۔ جناب افتخار محمد چودھری کو جو حلفیہ بیان دینا پڑا ہے، یہ اپنی نوعیت کا منفرد ترین واقعہ ہے۔ اس کی نظیر ہمیں نہ جنوبی ایشیا کی عدالتی تاریخ میں ملے گی، نہ ہی مغربی اور شمالی امریکہ کی عدالتوں میں ایسی کوئی مثال ہمیں ڈھونڈنے سے مل سکے گی کہ جب کسی ملک کے چیف جسٹس کو بہ امرِ مجبوری، محض حصولِ انصاف کی خاطر یہ بیان دینا پڑا ہو کہ اسے محبوس اور محصور کر کے کس طرح بے توقیر اور بے حرمت کرنے کی کوشش کی گئی! یہ بیان حلفی دینا مشکل کام تھا، لیکن مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری اس مشکل ترین مہم کو بھی بحسن وخوبی سر کر گئے ہیں......لیکن سوال یہ ہے کہ اب اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ صدرِ پاکستان جنرل پرویز مشرف، جو گزشتہ چند ہفتوں کے دوران کہتے چلے آ رہے ہیں کہ میں اپوزیشن کی سیاست کا جواب سیاست سے دوں گا، اب جناب افتخار محمد چودھری کے اس حلفیہ بیان کا کیا جواب دیں گے؟ چیف جسٹس صاحب نے اپنی ایفی ڈیوٹ میں جن توہین آمیز لمحوں کا حقائق نامہ بیان کیا ہے، ان تکلیف دہ لمحات کا صدر پاکستان کے پاس کیا جواب ہوگا؟

کہا جاتا ہے کہ جن عمارتوں کو اونچے درجے کے ریکٹر سکیل کا زلزلہ ایک بار ہلا دے وہ بیرونی طور پر مضبوط نظر آنے کے باوجود اندر سے کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ سندھ ہائی کورٹ کے سابق جسٹس جناب شائق عثمانی کا کہنا ہے کہ جناب افتخار محمد چودھری کا ریفرنس سننے والے فل کورٹ کے سامنے چیف جسٹس صاحب کا حلفیہ بیان اہم ترین دستاویز ہوگا، اس کی اثر پذیری سے کوئی نہیں بچ سکے گا۔ شائق عثمانی صاحب نے گزشتہ شب ایک نجی ٹی وی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: ''چیف جسٹس کے حلفیہ بیان کے مندرجات پڑھے ہیں تو یہ کہنا بجا سمجھتا ہوں کہ ان کے خلاف یہ بڑی ہی شرمناک حرکت کی گئی ہے۔ اس حلفیہ بیان کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ 9 مارچ کو جب چیف جسٹس کو صدارتی کیمپ آفس میں بلایا گیا تھا، ان کے خلاف کوئی ریفرنس تیار ہی نہیں تھا۔ یہ باقاعدہ اقدام بعد میں کیا گیا۔ اصل میں حکمرانوں نے باوردی ہو کر افتخار صاحب کو اپنے ہاں بلایا تھا اور توقع کی تھی وہ وردی سے ڈر جائیں گے، ان کے رعب میں آ جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اب یہ تفصیلات سامنے آئی ہیں تو یہ یقیناً صدارتی ریفرنس میں حکمرانوں کے مؤقف کو سخت نقصان پہنچائیں گی۔'' چیف جسٹس کے مذکورہ حلفیہ بیان کے حوالے سے سابق جسٹس جناب شائق عثمانی

نے یہ بھی کہا کہ چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے ساتھی جرنیلوں نے چیف جسٹس آف پاکستان کو اپنے پاس بلانے سے قبل ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ ان سے استعفالینا ہے!

اقتدار کے قلعے اور اس کے وابستگان پر لرزہ طاری ہے۔ایسے میں ہمیں مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین کا ایک تاریخی جملہ یاد آتا ہے۔9 مارچ کو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو صدر کی طرف سے بلانے اور ان کے خلاف ریفرنس لائے جانے کا واقعہ پیش آیا تو چودھری شجاعت حسین امریکہ میں تھے۔ان سے جب دریافت کیا گیا کہ اس واقعہ پر آپ کے کیا تاثرات ہیں تو چودھری شجاعت نے کہا تھا: ''یہ فوج اور عدالت کا معاملہ ہے۔''لوگوں نے اس بیان کو سادہ لوحی اور جان چھڑانے سے محمول کیا تھا،لیکن اب چیف جسٹس کے حلفیہ بیان کے بعد دھند چھٹی ہے تو ساری بات سامنے آ گئی ہے۔

شکریہ

(تنویر قیصر شاہد)



اعلیٰ حکومتی حکام کے بیان حلفی

دوپہر ایک بجے بیان دہندہ اور انٹیلی جنس اداروں کے سربراہ ملاقات میں شریک ہوگئے۔ 22- ریفرنس کی تفصیلات اور چیف جسٹس آف پاکستان کی درخواست پر انٹیلی جنس اداروں کی چھان بین کی خاص خاص باتوں پر بعد میں تبادلہ خیال ہوا۔ انٹیلی جنس اداروں کی تحقیقات اور دوسرے ذرائع سے وفاقی حکومت کو حاصل ہونے والی ابتدائی معلومات سے متعلق بعد میں ہونے والی چھان بین درست ثابت ہوئی جس کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) کراچی میں پلاٹ کی الاٹمنٹ

(i) اعلیٰ عدالتوں کے جج، وفاقی حکومت کے ملازمین کی ہاؤسنگ اسکیم میں پلاٹوں کی الاٹمنٹ کے اہل نہیں ہیں۔ فیز II کراچی جو فروری 1999ء میں شروع کیا گیا وفاقی حکومت کے ایسے ملازمین کے لیے تھا جن کی یکم جنوری 1999ء کو وفاقی حکومت کے تحت کم سے کم دس سال باقاعدہ ملازمت بنتی ہو۔ وفاقی حکومت کے ملازمین سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس میں صرف ایسے سول ملازمین شامل ہیں جو سول ملازمین کے ایکٹ مجریہ 1973ء کی تشریح کے تحت آتے ہیں جن میں دفاعی بجٹ سے تنخواہ حاصل کرنے والے سویلین ملازمین اور خود مختار اور نیم خود مختار اداروں اور سرکاری شعبے کی ان کارپوریشنوں کے ملازمین شامل ہیں جو وفاقی حکومت کے انتظام کنٹرول میں آتی ہیں ان میں وفاقی حکومت کے ملازمین کی ہاؤسنگ فاؤنڈیشن میں کام کرنے والے ملازمین بھی شامل ہیں۔ چیف جسٹس آف پاکستان واضح طور پر وفاقی حکومت کے ملازم نہیں ہیں (دیکھا جائے ایف جی ای ایچ ایف برائے کراچی ہاؤسنگ سکیم فیز II کے بروشر کی کاپی)۔

(ii) اہلیت کے اس معیار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان نے جو یکم جنوری 1999ء کو سپریم کورٹ کے جج بھی نہیں تھے اس اسکیم کے لیے درخواست دی اور اس میں پلاٹ حاصل کرلیا (دیکھیے (i) پلاٹ کی الاٹمنٹ کے لیے چیف جسٹس آف پاکستان کی درخواست اور (ii) الاٹمنٹ کا ثبوت)۔

(iii) یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ انہیں جج کی حیثیت سے اسلام آباد میں بھی ایک پلاٹ پہلے ہی الاٹ ہو چکا تھا۔

(ب) پٹرول کی قیمت کی وصولی

(i) چیف جسٹس آف پاکستان نے متعدد کلیم بھیجے اور کار نمبر CIA-9 کے لیے لاکھوں روپے کی پٹرول کی قیمت وصول کی۔ انہوں یہ وصولی ان پر رسیدوں کی بنیاد پر کی جو سمنگلی روڈ کوئٹہ پر عبداللہ اینڈ سنز کے شیل پمپ کی جانب سے جاری کی گئیں۔ یہ تمام رسیدیں جعلی ہیں کیونکہ اس عرصہ کے دوران یہ پمپ صرف ڈیزل فروخت کرتا تھا نہ کہ پٹرول۔ یہ رقم چیف جسٹس آف پاکستان نے ان جعلی رسیدوں کی بنیاد پر وصول کی (دیکھیے عبداللہ اینڈ سنز کے منیجر حبیب اللہ کا حلف نامہ اور نمونے کی رسیدیں اور کلیم)۔

(ii) کار نمبر CIA-9 ہنڈا اکارڈ دراصل کوئٹہ میں نہیں بلکہ اسلام آباد میں چیف جسٹس آف پاکستان کی فیملی کار کے طور پر زیر استعمال تھی۔

(iii) چیف جسٹس آف پاکستان کے بیٹے ڈاکٹر ارسلان افتخار جو خود سرکاری ملازم ہیں ایک اور ہنڈا اکارڈ کار نمبر CIA-2 لاہور میں استعمال کر

رہے تھے۔ اس گاڑی کے لیے بھی پٹرول کی رقم سپریم کورٹ کی جانب سے ادا کی جارہی تھی۔ ڈاکٹر ارسلان کوئنز روڈ لاہور پر واقع کال ٹیکس پمپ (کاکیشین آٹوز) سے سپریم کورٹ کے کوپن برائے گاڑی نمبر IDL-9966 پر کار نمبر CIA-2 کے لیے پٹرول حاصل کرتے تھے۔ (دیکھیے کاکیشن آٹوز کے منیجر علی احمد کا حلف نامہ اور نمونے کے بل)

(ج) ٹی اے کلیمز میں بے قاعدگی

(i) چیف جسٹس آف پاکستان نے متعلقہ قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے اہل خانہ کے لیے لاکھوں روپے بطور ٹی اے/ ڈی اے وصول کیے۔ کئی موقعوں پر فضائی ٹکٹ بھی اہلیہ اور بچوں کے لیے وصول کیا گیا جبکہ وہ سرکاری طور پر اس کے حقدار نہیں تھے۔ چیف جسٹس آف پاکستان کی اہلیہ صرف اسی صورت میں ٹی اے کی حقدار ہیں جب چیف جسٹس آف پاکستان ان کے ساتھ ہوں اور ان کے قیام کی مدت پانچ دن سے زیادہ ہو۔ قواعد کے تحت بچوں کو ٹی اے دینے کی اجازت نہیں ہے چاہے چیف جسٹس آف پاکستان ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

(ii) چیف جسٹس آف پاکستان نے جون 2006ء میں نتھیا گلی کے نجی دورے کے لیے اپنے لیے ڈی اے وصول کیا۔

(iii) یہ کلیم چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنے دستخط سے بھیجے اور اپنے ہی دستخط سے ان کی رقم وصول کی۔ (دیکھیے (i) اے جی پی آر کا سرٹیفکیٹ۔ (ii) چیف جسٹس آف پاکستان کے اہل خانہ کا ٹی اے بل۔ (iii) نتھیا گلی کے دورے کے لیے چیف جسٹس آف پاکستان کا ٹی اے بل۔ (iv) چیف جسٹس آف پاکستان اور اہلیہ کا ٹی اے بل اور (v) سمری)

(د) نتھیا گلی کا دورہ

(i) نتھیا گلی کے نجی دورے میں چیف جسٹس آف پاکستان اور ان کے اہل خانہ نے 17 جون 2006ء کو کسی ریزرویشن کے بغیر گورنر ہاؤس میں قیام کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہاؤس سابق گورنر کے ایم اظہر کے لیے 17 جون 2006ء سے پہلے سے بک تھا اور چیف جسٹس آف پاکستان کے پرسنل سٹاف آفیسر کو ایک دن پہلے یعنی 16 جون 2006ء کو یہ بات بتادی گئی تھی۔ سابق گورنر سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی آمد میں ایک دن کی تاخیر کردیں۔

(ii) چیف جسٹس آف پاکستان اور ان کے اہل خانہ نے اگلے دن بھی گورنر ہاؤس چھوڑنے سے انکار کردیا یہاں تک کہ جب سابق گورنر اور دوسری ممتاز شخصیات وہاں پہنچیں اور انہیں غسل خانہ بھی استعمال نہیں کردیا۔

(iii) اس سب کے باوجود چیف جسٹس آف پاکستان اور ان کے اہل خانہ وہاں سے ناخوش ہوکر گئے (دیکھیے صوبہ سرحد کے گورنر کے ایم ایس لیفٹیننٹ کرنل سعید الہ کا حلف نامہ)

(ہ) ججوں کو ہراساں کرنا

(i) چیف جسٹس آف پاکستان نے لاہور ہائیکورٹ کے جناب اختر شبیر اور جناب جسٹس شیخ عبدالرشید کو زبانی حکم دیا کہ وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک عدالت نہ آئیں۔ جناب جسٹس شیخ عبدالرشید اس پر عمل کرتے ہوئے اپنے ریٹائرمنٹ تک دفتر میں نہیں آئے۔

(ii) چیف جسٹس آف پاکستانے ہائیکورٹوں کے بہت سے ججوں کے خلاف بلاامتیاز کردار کشی کی ایک مہم شروع کی۔

(iii) چیف جسٹس آف پاکستان' لاہور ہائیکورٹ' سندھ ہائیکورٹ اور پشاور ہائیکورٹ کے بہت سے ججوں کے خلاف غلط طرز عمل کے لیے سپریم جوڈیشل کونسل میں کارروائی شروع کرنا چاہتے تھے تاہم وفاقی حکومت کو ان سے کوئی شکایت نہیں تھی ان کے ججوں کے نام یہ ہیں۔

لاہور ہائیکورٹ:

(i) جناب جسٹس عبدالشکور پراچہ

(ii) جناب جسٹس شبر رضا رضوی

(iii) جناب جسٹس اختر شبیر

(iv) جناب جسٹس شیخ عبدالرشید

سندھ ہائیکورٹ:

(i) جناب جسٹس سرمد جلال عثمانی

(ii) جناب جسٹس مشیر عالم

(iii) جناب جسٹس عارف حسین خلجی

(iv) جناب جسٹس امیر ہانی مسلم

(v) جناب جسٹس افضل سومرو

پشاور ہائیکورٹ:

(i) جناب جسٹس شاہ جہان خان

(ii) جناب جسٹس اعجاز الحسن خان

(iii) جناب جسٹس جہانزیب رحیم

(د) ججوں کے تقرر میں ذاتی تعصب:

(i) دوسرے آئینی مشیروں کی سفارشات سے قطع نظر اپنی پسند کے ججوں کے تقرر پر چیف جسٹس آف پاکستان کے اصرار کرنے سے ایک تعطل پیدا ہوگیا جس سے پنجاب اور بلوچستان ہائیکورٹس میں بہت سی پوسٹیں خالی رہ گئیں اور اس سے ان عدالتوں کے کام میں حرج ہوا۔ اس کی وجہ سے لاہور ہائیکورٹ میں 17 اور بلوچستان میں 3 ججوں کی کمی ہے۔ سندھ ہائیکورٹ کے لیے 7 تقرریاں چیف جسٹس آف پاکستان کے پاس زیر التواء تھیں۔

(ii) انہوں نے گورنر بلوچستان اور چیف جسٹس آف بلوچستان ہائیکورٹ (آئینی مشیروں) سے اپنی ملاقاتوں میں بلوچستان ہائیکورٹ کے لیے بعض ججوں کے تقرر سے اتفاق کیا لیکن بعد میں اس باہمی افہام وتفہیم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ گورنر نے 10 فروری 2007ء کے اپنے خط میں صدر کو اس بات سے آگاہ کیا (دیکھیے گورنر بلوچستان کا خط)

(ز) اختیارات کا ناجائز استعمال:

(i) چیف جسٹس آف پاکستان نے اس بات پر اصرار کیا کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب جسٹس چودھری اعجاز یوسف کو ریٹائر کیا جائے۔ بعد میں انہوں نے لاہور ہائیکورٹ کے جج جناب جسٹس نسیم سکندر پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی نامزدگی واپس لیں جبکہ فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر تعیناتی کا ان کا نوٹیفکیشن جاری ہو چکا تھا نتیجتاً فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ کافی عرصے تک خالی رہا۔

(ii) فیڈرل شریعت کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس جناب جسٹس حاذق الخیر کے تقرر کے بعد چیف جسٹس آف پاکستان نے ان پر اپنی پسند کے ججوں کے تقرر کے لیے دباؤ ڈالا۔ فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا اور مستعفی ہونے کی دھمکی دی۔ اس طرح چیف جسٹس آف پاکستان نے ایک تعطل پیدا کیا جس کے نتیجے میں وفاقی شرعی عدالت کئی ماہ تک نامکمل رہی۔

(ح) سول ملازمین کو ہراساں کرنا:

چیف جسٹس آف پاکستان نے ایڈیشنل چیف سیکرٹری جناب خوشنود لاشاری اور بعد میں چیف سیکرٹری جناب کامران رسول کو پرانے ماڈل کی مرسڈیز بینز کار فراہم کرنے پر طلب کیا اور انہیں گھنٹوں انتظار کرایا۔ دونوں افسروں پر ملازمت سے فوری معطلی کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ ڈی جی پروٹوکول پنجاب جناب مشتاق ہمدانی پر ان کی مبینہ کوتاہی پر دباؤ ڈالا گیا۔ جناب ہمدانی نے غیر مشروط معافی طلب کر کے خود کو بچایا (دیکھیے لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) مشتاق حسین ہمدانی ڈی جی پروٹوکول پنجاب کا غیر مشروط معافی نامہ اور جناب خوشنود اختر لاشاری سابق ایڈیشنل چیف سیکرٹری پنجاب کا حلف نامہ)

(ط) پولیس افسروں کو ہراساں کرنا:

(i) چیف جسٹس آف پاکستان سکھر جاتے ہوئے حیدر آباد سے گزرتے وقت ڈی پی او حیدر آباد جناب علی احمد جونیجو پر سخت ناراض ہوئے کیونکہ وہ ان کے اسکارٹ کے لیے ذاتی طور پر موجود نہیں تھے۔

(ii) ڈی پی او نے معافی مانگی اور وضاحت کی کہ وہ سرکاری میٹنگ کے لیے اسلام آباد گئے تھے لیکن چیف جسٹس اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور مذکورہ افسر کو ہدایت کی کہ وہ فوری طور پر انہیں سکھر میں ملیں۔ ڈی پی او نے اس ہدایت پر عمل کیا لیکن انہیں ملاقات کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ یہ حکم دیا گیا کہ وہ حیدر آباد واپس جائیں اور کچھ دنوں بعد اسلام آباد آ کر ملیں۔ (دیکھیے علی احمد جونیجو ڈی پی او حیدر آباد کا حلف نامہ)

(ی) انتظامیہ میں مداخلت:

چیف جسٹس نے اپنی فیملی کے ہمراہ پشین کے اپنے ایک نجی دورے کے دوران ڈی پی او مسٹر عامل شمیم وآئیں کو حکم دیا کہ وہ ان کے ذاتی اردلی کانسٹیبل عبدالرحمٰن کو فوری طور پر ترقی دیں۔ ڈی پی او نے بتایا کہ کانسٹیبل مقررہ معیار پر پورا نہیں اترتا اس لیے قواعد کے تحت اسے ترقی نہیں دی جا سکتی۔ تاہم چیف جسٹس نے اس بات پر اصرار کیا کہ دن ختم ہونے سے پہلے پہلے ان کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ آخر کار ڈی پی او کو چیف جسٹس کے دباؤ پر ان کا حکم ماننا پڑا۔ (دیکھیے مسٹر عامل شمیم دائیں، سابق ڈی پی او پشین کا بیان حلفی)

(ک) ذاتی تشہیر

میڈیا پر نمایاں نظر آنے کی خواہش:

(i) پاکستان کے سابق چیف جسٹس صاحبان کے برعکس جو عموماً اپنے فیصلوں کے ذریعے بولتے تھے، چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ذاتی تشہیر کی بہت خواہش رکھتے تھے اور انہوں نے میڈیا پر اپنی تشہیر کے لیے ایک آفیسر تعینات کر رکھا تھا۔ پی آر او کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ تمام اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا پر چیف جسٹس کی سرگرمیوں کو نمایاں کوریج کا انتظام کریں۔

(ii) پی ٹی وی کو حکم دیا گیا تھا کہ چیف جسٹس کو روزانہ خبروں میں نمایاں طور پر کوریج دی جائے۔ (دیکھیے مسٹر خالد بلال، سابق پی آر او سپریم کورٹ آف پاکستان کا بیان حلفی)۔

پروٹوکول کا شوق:

(iii) چیف جسٹس Hood پہنے ہوئے مسلح سیکورٹی گارڈز استعمال کرتے تھے جن کی موجودگی سے ہوائی اڈوں اور پبلک مقامات پر چیف جسٹس کی آمد پر لوگوں میں خوف وہراس پھیل جاتا تھا۔

(iv) چیف جسٹس کو پروٹوکول کا اتنا خیال ہوتا تھا کہ وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ جب وہ کسی جگہ کا دورہ کرنے جائیں تو انہیں ان کی من پسند کاریں (مرسڈیز یا BMW) مہیا کی جائیں۔ پروٹوکول کے معاملے میں وہ اس حد تک آگے چلے جاتے تھے کہ ان کا حکم تھا کہ پولیس اسکارٹ کے لیے وہ اہلکار مقرر کیے جائیں جنہیں وہ خود نامزد کریں۔ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ اسلام آباد اور دوسرے شہروں میں ان کی آمدورفت کے دوران تمام ٹریفک روک دی جایا کرے۔ (دیکھئے ان افراد کے حلفی بیانات۔ (i) مسٹر مدثر اقبال' ڈی جی (پروٹوکول) سندھ۔ (ii) مسٹر ضیاء الحسن خان' سابق آئی جی پی پنجاب)۔ (iii) مسٹر مشتاق حسین ہمدانی' ڈی جی (پروٹوکول) پنجاب۔ (iv) سپریم کورٹ کے خطوط مورخہ 20 اگست 2005ء اور 22 مارچ' 20 اپریل' 21 اکتوبر اور 7 دسمبر 2006ء)۔

(v) چیف جسٹس کے کراچی کے دوروں میں آئی جی سندھ مسٹر جہانگیر مرزا کو تحریری طور پر کہا گیا کہ 3 پولیس موبائلز، 2 پولیس جیپ' ایلیٹ فورس کا دستہ اور ایس پی رانا پرویز کو اسکارٹ ڈیوٹی' انسپکٹر جعفر عباس کو پائلٹ ڈیوٹی اور اے ایس آئی وقار عظیم کو واکی ٹاکی اور 9mm پسٹل کے ساتھ گن مین کو ڈیوٹی پر تعینات کیا جائے۔ آئی جی نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن پھر ایسا موقع آیا جب ڈی آئی جی Block-17 کے رینک کے آفیسر کو چیف جسٹس کے اسکارٹ کے لیے طلب کیا گیا تو اس پر آئی جی نے معذرت کی کیونکہ ایسا صدر اور وزیراعظم کے لیے بھی نہیں ہوتا۔ (دیکھئے مسٹر جہانگیر مرزا' سابق آئی جی سندھ کا بیان حلفی)

مہنگی کاروں کا شوق

(vi) ایک دو روزہ کانفرس کے موقع پر پروٹوکول ڈیوٹی کے لیے 60 لاکھ روپے کی لاگت سے دو ہنڈا ایکارڈ کاریں سرکاری فنڈز سے خریدی گئیں' اس مقصد کے لیے قواعد میں نرمی کی گئی بعد میں یہ کاریں اسلام آباد اور لاہور میں چیف جسٹس کی فیملی اور بیٹے نے خالصتاً پرائیوٹ اور ذاتی مقصد کے لیے استعمال کرنا شروع کردیں۔ چیف جسٹس کا بیٹا ڈاکٹر ارسلام افتخار جوان میں سے ایک کار (CIA-2) لاہور میں استعمال کرتا تھا اور اس کے لیے رجسٹریشن نمبر IDL-9966 پر سپریم کورٹ کے اکاؤنٹ سے پٹرول لیتا تھا۔ (دیکھئے مندرجہ ذیل افراد کے حلفی بیانات: (i) مسٹر صفدر علی' کانسٹیبل (ii) مسٹر محمد نعیم' اسسٹنٹ انچارج (سیکیورٹی گارڈ)' (iii) مسٹر مروت باری' انچارج سیکورٹی اور (iv) مسٹر علی احمد منیجر Kaskasian آٹوز لاہور)

23- مندرجہ بالا معلومات کے علاوہ وفاقی حکومت کو چیف جسٹس کے خلاف اور بھی بہت سی شکایات موصول ہوئیں۔

24- چیف جسٹس نے اپنے بیان حلفی میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے زیر استعمال مرسیڈیز کار وزیراعظم نے اپنی خوشی سے انہیں بھیجی تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ چیف جسٹس نے یہ کار زبردست دباؤ ڈال کر حاصل کی تھی۔

25- سپریم کورٹ کے ججوں کی رخصت' پنشن اور استحقاق کے آرڈر مجریہ 1997ء کے تحت ایک جج کو 1600 CC کی صرف ایک سرکاری کار استعمال کرنے کی اجازت ہے اور اس کے لیے پٹرول ماہانہ حد 400 لٹر مقرر ہے۔ (آرٹیکل 21) (دیکھئے وزارت قانون' انصاف اور انسانی حقوق کا بیان)

26- 1997ء میں اس وقت کے چیف جسٹس آف پاکستان کے زیر استعمال مرسیڈیز کار' ان کے جانشین مسٹر جسٹس اجمل میاں نے مارچ 1998ء میں واپس کردی تھی اور ججوں کے لیے یہ رہنما اصول بھی مقرر کیا تھا کہ سپریم کورٹ کار پول میں کاروں کی کمی کی صورت میں جج صاحبان' دستیاب کاریں مل جل کر استعمال کریں گے لیکن کسی بھی صورت میں عدالت عظمٰی کا بینہ ڈویژن سے یہ درخواست نہیں کریں گے کہ

اسلام آباد میں سپریم کورٹ کے کسی جج کو کار فراہم کی جائے۔ (دیکھئے سرکاری ٹرانسپورٹ کے استعمال بارے سپریم کورٹ کا حکم)

27- مندرجہ بالا قواعد وضوابط کے برعکس مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری نے وزیر اعظم کے پرنسپل سیکرٹری مسٹر جاوید صادق ملک پر دباؤ ڈالا کہ انہیں کابینہ ڈویژن کے پول سے مرسیڈیز کار دی جائے جو جولائی 2005ء کو انہیں دے دی گئی۔

28- چیف جسٹس 1993ء ماڈل کی کار سے مطمئن نہیں تھے اور جلد ہی انہوں نے اس کی جگہ 2004ء ماڈل کی مرسڈیز بینز کار فراہم کرنے کا تقاضا شروع کر دیا۔ انہوں یہ تقاضا فروری 2006ء میں وزیر اعظم کے متبادل کار کی فراہمی کی منظوری دینے تک جاری رکھا (دیکھئے جناب جاوید صادق ملک' سابق ایس ایم کا بیان حلفی)

29- چیف جسٹس نے جو یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ میٹنگ کا واحد مقصد ان سے استعفیٰ لینا تھا' درست نہیں ہے۔ یہ میٹنگ چیف جسٹس کی درخواست پر ہوئی تھی اور اس میں خود انہوں نے پشاور ہائیکورٹ کے ایک جج کی طرف سے دائر کردہ شکایت کا معاملہ اٹھایا تھا۔ اس میٹنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیف جسٹس کو بتایا گیا کہ ان کے خلاف ایک ریفرنس تیار کیا گیا ہے جو ایک دن پہلے صدر کو موصول ہوا ہے اور جو صدر' چیف جسٹس سے اچھے تعلقات کے باوجود سپریم جوڈیشل کونسل میں بھیجنے کے پابند ہیں۔ اس میٹنگ میں چیف جسٹس کو ان تحقیقات کے نتائج سے بھی آگاہ کیا گیا۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہوں کو چیف جسٹس کی خواہش پر میٹنگ میں بلایا گیا تھا۔

30- بیان حلفی کے ذریعے یہ تاثر پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ چیف جسٹس کو ان کی مرضی کے خلاف پریذیڈنٹ سیکرٹریٹ کیمپ آفس' راولپنڈی میں رکنے پر مجبور کیا گیا' چیف جسٹس کے بیان حلفی کا مواد اپنی تردید خود کر رہا ہے۔ چیف جسٹس ایک طرف کہتے ہیں کہ ایک افسر نے انہیں روانہ ہونے سے روکا اور دوسری طرف وہ کہتے ہیں کہ کسی نہ کسی بہانے کیمپ آفس میں رکھا گیا۔

31- سکیورٹی کے معمول کے طریق کار کے مطابق صدر سے ملاقات کے لیے آنے والے لوگوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ موبائل فون لے کر نہ جائیں تاہم چیف جسٹس نے میٹنگ والے دن اپنے اسٹاف آفیسر کو پیغام بھجوایا کہ ان کی فیملی کو بتا دیا جائے کہ ان کا لاہور جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا ہے۔ یہ پیغام سٹاف آفیسر نے باقاعدہ طور پر پہنچایا' لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ چیف جسٹس کا رابطہ بیرونی دنیا سے منقطع تھا اور انہیں ان کی مرضی کے خلاف کیمپ آفس میں رکھا گیا۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر اور قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے ایک گمراہ کن تصویر پیش کی گئی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

32- حقیقت یہ ہے کہ چیف جسٹس خود درخواست کر کے صدر سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ انہوں نے ڈی جی ایم آئی سے بھی کہا کہ وہ ان کی مدد کے لیے میٹنگ کے موقع پر موجود رہیں' اس سے پہلے انہوں نے ڈی جی آئی بی اور ڈی جی آئی ایس آئی سے ملاقات کی اور ان سے مدد طلب کی۔ چیف جسٹس کے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے تمام سربراہوں سے خوشگوار تعلقات تھے جو وہاں موجود تھے۔ ان میں سے کوئی بھی چیف جسٹس سے ذاتی عناد نہیں رکھتا تھا۔ چیف جسٹس اور ان کی فیملی کا ڈی جی آئی بی کے گھر آنا جانا تھا۔ ڈی جی ایم آئی اور چیف جسٹس اکثر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہتے تھے اور ڈی جی ایم آئی اکثر چیف جسٹس سے ان کی رہائش گاہ پر ملنے جاتے تھے۔ میٹنگ والے دن تمام وقت ماحول شائستہ رہا اور ادب آداب کا پورا خیال رکھا گیا۔ کسی نے چیف جسٹس کو دھمکی نہیں دی' کسی نے ان پر استعفیٰ دینے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا' اس طرح کی صورت حال میں استعفیٰ ایک آپشن ضرور ہوتا ہے تاہم چیف جسٹس نے ریفرنس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ (دیکھئے ریٹائرڈ بریگیڈیئر اعجاز احمد شاہ ڈی جی آئی کا بیان حلفی)

33- جہاں تک ذاتی تعلقات کا تعلق ہے' چیف جسٹس کے صدر سمیت تمام اہم شخصیات سے بڑے اچھے تعلقات تھے تاہم صدر آئین کے تحت اس بات کے پابند تھے کہ وہ ریفرنس بھیجیں جس کا انہیں مشورہ دیا گیا تھا۔

34- جب چیف جسٹس نے میٹنگ میں اٹھائے جانے والے نکات کی تفصیلات جاننا چاہیں تو ان ہی کی درخواست پر انٹیلی جنس کے سربراہوں کو

بھی طلب کیا گیا۔ صدر/ وزیر اعظم کے چیف آف سٹاف اور ملٹری سیکرٹری دن دو بجے میٹنگ سے چلے گئے اور چیف جسٹس انٹیلی جنس کے سربراہوں سے بات چیت کے لیے جن کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھا' رک گئے۔ ریفرنس کی پوری فائل' دوسری متعلقہ دستاویزات اور کئی فولڈرز پر مشتمل انٹلی جنس معلومات موجود تھیں اور بات چیت میں کافی وقت صرف ہوا کیونکہ چیف جسٹس نے وہاں موجود لوگوں سے اس معاملے پر تفصیلی بات چیت کی۔ ڈی جی آئی بی اور ڈی جی آئی ایس آئی بھی تین بجے سہ پہر چلے گئے۔ چیف جسٹس روانگی تک ڈی جی ایم آئی کے ساتھ رہے جنہوں نے چیف جسٹس کو کار میں رخصت کیا۔ ڈی جی ایم آئی کے ساتھ چیف جسٹس ریفرنس کے بارے میں اور صدر سے ایک اور ملاقات کے امکان پر بات کرتے رہے تاہم اس ملاقات کا انتظام نہ ہو سکا۔ (دیکھئے میجر جنرل میاں ندیم اعجاز احمد' ڈی جی ایم آئی کا بیان حلفی)

35- بیان حلفی میں چیف جسٹس کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کو خصوصی طیارہ فراہم کیا گیا۔

36- یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ صدر عام طور پر وردی میں رہتے ہیں' چیف جسٹس آف پاکستان سے ملاقات ان کے اصرار پر 9 مارچ 2007ء کو مقرر کی گئی جس کے لیے صدر کے پروگرام میں تبدیلی کی گئی اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے یہ تبدیلی 8 مارچ 2007ء کو کی گئی۔

37- چیف جسٹس آف پاکستان نے یہ تاثر بھی دیا ہے کہ انہیں کئی دن تک ان کی رہائش گاہ پر اس حالت میں رکھا گیا کہ ان کا باہر کی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں رہا' ان کی ٹیلیفون لائنیں کاٹ دی گئیں اور ان کے اہلخانہ کے موبائل فون جام کر دیئے گئے' یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ 9 مارچ 2007ء کو شام 5 بجے سے 13 مارچ تک ان کے بیٹے کے موبائل فون پر ساڑھے تین سو سے زیادہ کالیں بھیجی اور وصول کی گئیں۔ دوسروں کے علاوہ میاں محمد نواز شریف نے بھی اس موبائل لائن پر انہیں کال کی۔ (دیکھئے دی نیوز کا تراشہ) لینڈ لائن بھی استعمال میں تھی اور لوکل کالوں کے علاوہ جنہیں ایکسچینج میں ریکارڈ نہیں کیا جاتا دوسروں شہروں کے لیے بھی سی کالیں اور موبائل فون کالیں بھی کی گئیں۔ (دیکھئے فون کمپنیوں کا ٹال ڈیٹا)

38- چیف جسٹس آف پاکستان کے اعلیٰ عہدے کے وقار اور عدلیہ کے احترام کو دیکھتے ہوئے بادل نخواستہ ان حقائق کو سامنے لایا گیا ہے۔ یہ راستہ بادل نخواستہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ حقائق کو ریکارڈ پر لایا جائے۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ چیف جسٹس آف پاکستان نے ایک حلف نامہ داخل کیا ہے جو اپنے متن کے حوالے سے غلط اور چیف جسٹس آف پاکستان کے وکیل نے عدالت میں اور باہر یہ بیانات دیئے ہیں' چونکہ چیف جسٹس آف پاکستان کے بیان حلفی کی تردید نہیں کی گئی اس لیے اسے درست سمجھا جائے۔

II- مندرجہ بالا تمام بیانات حق و صداقت پر مبنی ہیں۔

بیان دہندہ

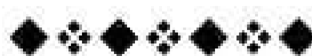
تصدیق

بتاریخ...... جون 2007ء بمقام اسلام آباد' اس بات کی حلفاً تصدیق کی جاتی ہے کہ مندرجہ بالا بیان حلفی کا مواد میرے بہترین علم' اعتماد اور معلومات کے مطابق حق و صداقت پر مبنی ہے اور عدالت سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی گئی۔

بیان دہندہ

بتاریخ...... جون 2007ء بمقام اسلام آباد بیان دہندہ نے جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں' حلفاً اس بیان کا میرے روبرو اقرار کیا۔

کمشنر بیان حلفی



اظہار یکجہتی کے لیے ججوں کے استعفے

لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس جواد ایس خواجہ، ڈپٹی اٹارنی جنرل آف پاکستان ناصر سعید شیخ اور ماتحت عدلیہ کے 6 ججوں نے چیف جسٹس آف پاکستان کو غیر فعال کرنے، ان کے خلاف صدارتی ریفرنس، انہیں جبری رخصت پر بھجوانے اور وکلاء پر پولیس تشدد کے خلاف بطور احتجاج استعفے دے دیئے ہیں۔ ججوں کے استعفوں سے ملک میں جاری عدلیہ کا بحران مزید شدت اختیار کر گیا ہے۔ جسٹس جواد ایس خواجہ اعلیٰ عدلیہ کے مستعفی ہونے والے پہلے جج ہیں جبکہ ماتحت عدلیہ کے ایک جج بہاولپور سے سعید خورشید چند روز پہلے اپنا عہدہ چھوڑ چکے ہیں۔ ماتحت عدلیہ کے گزشتہ روز مستعفی ہونے والے تمام ججوں کا تعلق سندھ سے ہے۔ ان ججوں میں جوڈیشل مجسٹریٹ سنٹرل اشرف یار خان' سندھ ہائی کورٹ وفیڈرل شریعت کورٹ کے سابق جج عبادت یار خان کے صاحبزادے ہیں جبکہ مجسٹریٹ فرسٹ کلاس پنو عاقل راجیش چندر راجپوت جسٹس افتخار محمد چودھری کے بعد سپریم کورٹ کے سینئر ترین جج جسٹس بھگوان داس کے عزیز ہیں، ان کی ہمشیرہ جسٹس بھگوان داس کے صاحبزادے کے عقد میں ہے۔ صدارتی ریفرنس کے خلاف وکلا نے احتجاج کا سلسلہ شروع کیا تھا جو ہنوز جاری ہے اور وکلا صدارتی ریفرنس کی واپسی تک احتجاج ختم کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ اپوزیشن جماعتوں نے وکلاء کے احتجاج میں شرکت کی تو حکومت نے اسے سازش قرار دیا۔ اب اتنی تعداد میں ججوں کے استعفوں کو حکومت کیا کہے گی؟ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس جواد ایس خواجہ نے آئین کے آرٹیکل 195 کے تحت صدر مملکت کو جو استعفیٰ بھجوایا ہے اس میں وہ رقم طراز ہیں ''گزشتہ دس روز سے عدلیہ کے بارے میں ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں جن کی تفصیل میں وہ اس لیے نہیں جائیں گے کہ سب کچھ عوام کے علم میں ہے، گزشتہ ایک ہفتے کے دوران ذاتی طور پر انہیں عدالتی فرائض سرانجام دینے میں دشواری ہے۔ آپ سے رجوع کرنے سے پہلے چند روز اس امید کے ساتھ انتظار کیا کہ عدلیہ کو پہنچائے گئے نقصان کی تلافی کے لئے کچھ کیا جائے گا مگر ایسا محسوس ہوتا ہے یہ انتظار بے سود ثابت ہوا۔ ان حالات میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے آئین کے آرٹیکل 195 کے تحت اپنا استعفیٰ بھجوا رہا ہوں'' استعفے کی ایک نقل چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کو بھی بھجوا دی گئی ہے۔ ماتحت عدلیہ کے ججوں نے بھی اپنے استعفوں میں اسی قسم کی وجوہات بیان کی ہیں۔

حکومت کی طرف سے یہ دعوے کیے جا رہے تھے کہ بحران پر کافی حد تک قابو پایا جا چکا ہے مگر ججوں کے استعفوں نے ثابت کر دیا ہے کہ حکومتی اقدامات کے نتیجے میں بحران مزید شدت اختیار کر رہا ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے اعتراف کیا کہ ریفرنس بھجواتے وقت کچھ غلطیاں ہوئی ہیں، ان کے خیال میں اس اہم آئینی مسئلے پر قوم کو اعتماد میں لیا جانا چاہیے تھا۔ صدر نے وردی میں چیف جسٹس سے ملاقات کی وضاحت ایک بار پھر کی ہے مگر سوال یہ ہے کہ جب ان کے بقول صدارتی کیمپ آفس میں جسٹس افتخار چودھری کی درخواست پر ان سے ملاقات کی گئی تو پھر اس منظر کو میڈیا میں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس بھجوانے کے بعد انہیں کس آئینی اختیار کے تحت غیر فعال کیا گیا؟ یہ سوال بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ چیف جسٹس کی صدارتی کیمپ آفس میں موجودگی کے دوران قائم مقام چیف جسٹس سے حلف کیوں اٹھوایا گیا؟ جسٹس افتخار کو

صدارتی کیمپ آفس سے واپسی پر سپریم کورٹ جانے سے روکنے کے احکامات کہاں سے جاری ہوئے؟ جسٹس افتخار محمد چودھری کو نظر بند کرنے کا حکم کس اتھارٹی نے دیا؟ پرامن وکلاء اور سیاسی کارکنوں پر پولیس تشدد کی ہدایت کہاں سے جاری ہوئی؟ غیر فعال کیے گئے چیف جسٹس کے ساتھ پولیس نے جو سلوک کیا اس پر قائم مقام چیف جسٹس از خود نوٹس لے چکے ہیں اور سماعت جاری ہے اس لیے ہم تبصرہ نہیں کرتے۔ جناب صدر اور ان کے رفقاء کا سارا زور تاحال اس بات پر رہا ہے کہ ملک کے خلاف سازش ہو رہی ہے مگر یہ نہیں بتایا جا رہا کہ اس سازش میں ملوث عناصر مقامی ہیں یا ان کا اشارہ کسی خاص بیرونی طاقت کی طرف ہے۔ امریکہ اور یورپ کی طرف سے عدالتی بحران پر جس قسم کے بیانات آئے ہیں حکومت ان سے بھی خوش نظر نہیں آئی۔ یہ امر بھی باعث حیرت ہے کہ جناب صدر نے عدلیہ کا بحران شروع ہونے کے 10 روز بعد قوم کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے بھی ایک نجی چینل کا انتخاب کیا۔ بہتر ہوتا کہ وہ پی ٹی وی سے مخاطب ہوتے اور تمام نجی چینلز کے ذریعے ان کی کوریج کا اہتمام کیا جاتا۔ محترم صدر نے ایک پولیس انسپکٹر کی گم شدگی کا ذکر بھی کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ انسپکٹر کہاں گیا؟ کیا اسے بھی ان لاپتہ افراد کی فہرست میں شامل سمجھا جائے جن کے مقدمات کی سماعت غیر فعال اور جبری رخصت پر بھجوائے گئے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کر رہے تھے۔ حکومت کی سطح پر یہ اعتراف تو پہلے ہی کیا جا چکا ہے کہ چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس پر اس قدر ردعمل کی توقع نہیں تھی مگر جب شدید ردعمل سامنے آیا تو اس کے تدارک کے لیے جس راستے کا انتخاب کیا گیا اس نے محض اس کی شدت میں اضافہ ہی کیا۔ جناب صدر کہتے ہیں کہ وہ وزیراعظم کے ساتھ مل کر صورت حال میں بہتری کے لیے اقدامات کر رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کو اتنی تعداد میں ججوں کے استعفوں کی توقع بھی نہیں تھی۔ وکلا اور اپوزیشن کے احتجاج کو دبانے کے لیے پولیس کے ذریعے تشدد کے راستے کا انتخاب کیا گیا، اس احتجاج کو روکنے کے لیے حکومت کچھ نہیں کر پائے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ حکومتی اور بااثر طبقات نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس قوم میں احتجاج کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ معاشی ترقی کے بلند بانگ دعوؤں میں یہ بھلا دیا گیا کہ عام آدمی کو اس ترقی سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ حکومت سے ہماری اپیل ہے کہ وہ ''سازش'' کا توڑ کرنے کے بجائے عوام کی معاشی صورت حال کا جائزہ لے اور اپنے اقدامات سے ثابت کرے کہ وہ عام آدمی کے معاشی حالات بہتر بنانے میں مخلص ہے۔ جناب صدر نے اگر ریفرنس بھجواتے وقت سرزد ہونے والی غلطیوں کا احساس کر لیا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ اس کرائسز سے نکلنے کے لیے سوچ بچار کے بعد حکمت عملی تیار کی جائے۔ وکلا برادری صدارتی ریفرنس واپس لینے کا مطالبہ کر رہی ہے، کیا اس پہلو پر بھی غور ہو سکتا ہے؟



چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکلا

حکومت کی جانب سے صدارتی ریفرنس کے حق میں سپریم کورٹ اور سپریم جوڈیشل کونسل میں دلائل دینے کیلئے الگ الگ وکلاء پینل تشکیل دیا گیا ہے جبکہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے سپریم کورٹ اور سپریم جوڈیشل کونسل میں پیروی کیلئے ایک ہی پینل تشکیل دیا ہے جس کی سربراہی ممتاز قانون دان چودھری اعتزاز احسن کر رہے ہیں جو کہ پیپلز پارٹی کے ایک اہم سیاسی رہنما ہیں۔ چودھری اعتزاز احسن 1945ء میں پیدا ہوئے انہوں نے کیمرج یونیورسٹی سے ایم اے اور بار ایٹ لاء کے امتحانات پاس کئے اور پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں میں وکالت شروع کی۔ انہوں نے ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے نائب صدر کے عہدے پر کام کیا۔ سیاسی پریزن ریلیف اور بحالی کی کمیٹی کے ممبر کے طور پر چودھری اعتزاز احسن ملٹری کورٹس میں دفاع کے وکیل کے ممبر کے طور پر پیش ہوتے رہے۔ چودھری اعزاز احسن پی پی پی کے اہم اور سرگرم سیاسی کارکن ہیں جو کہ پیپلز پارٹی کے 1970ء کے دور میں حکومت میں پنجاب انفارمیشن پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ منسٹری کے وزیر رہے۔ وہ کئی مرتبہ سیاسی اسیر رہے جبکہ پیپلز پارٹی کے 1986ء سے 1990ء کے دور میں وزیر داخلہ رہے۔ چودھری اعتزاز احسن کو 1993ء کے عام انتخابات میں شکست ہوئی جبکہ وہ 2002ء کے عام انتخابات میں دوبارہ ایم این اے منتخب ہوئے۔ چودھری اعتزاز احسن نے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں متعدد اہم مقدمات میں پیروی کی ہے۔ چیف جسٹس کے وکلاء پینل میں دیگر وکلاء میں تمام وکالت کے شعبے سے منسلک ہیں انہوں نے کبھی بھی اپنی سیاسی وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔

پینل میں شامل جسٹس (ر) فخر الدین ابراہیم حامد خان سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر رہے ہیں اور اب پاکستان بار کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ہیں پینل میں شامل جسٹس (ر) طارق محمود کو وکلاء برادری میں ایک بہترین شخصیت ہونے کا اعزاز حاصل ہے جنہوں نے ہمیشہ میرٹ اور آئین کی بالادستی کے لئے فیصلے کئے۔ جسٹس (ر) طارق محمود نے کوئٹہ ہائیکورٹ بنچ سے اس بنیاد پر استعفیٰ دے دیا تھا جب ان کو ریفرنڈم منعقد کروانے کیلئے ممبر مقرر کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ ریفرنڈم غیر آئینی ہے اور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس استعفیٰ کے نتیجے میں سپریم کورٹ کے وکلاء نے ان کو سپریم بار ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا۔ پینل میں قاضی محمد انور ایڈووکیٹ شامل ہیں جو کہ پاکستان بار کونسل کی ایگزیکٹو کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ پینل میں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر منیر اے ملک شامل ہیں جو کہ وکلاء کی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے رہے تاہم ان کی کسی بھی سیاسی جماعت سے واضح وابستگی نہیں ہے۔

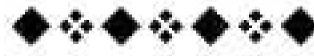
◆❖◆❖◆❖◆

حکومتی وکلا کا پینل

سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کی آئینی درخواست کی پیروی حکومت کے سینئر مشیر سینئر ایڈووکیٹ سید شریف الدین پیرزادہ کر رہے ہیں جب کہ صدر کی جانب سے سپریم جوڈیشل کونسل میں صدارتی ریفرنس کی پیروی وکلاء کا ایک پینل کر رہا ہے جس کے سربراہ سابق وزیر قانون ڈاکٹر خالد رانجھا کو مقرر کیا گیا ہے۔ سید شریف الدین پیرزادہ حکومت کے سینئر مشیر ہیں جو کہ 12 جون 1913 کو پیدا ہوئے بمبئی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی 1941 سے 1944 تک بابائے قوم محمد علی جناح کے اعزازی سیکرٹری رہے 47-1945 کے عام انتخابات کے دوران بمبئی صوبائی مسلم لیگ کے پبلسٹی ونگ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ ڈیلی مارننگ ہیرالڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کر چکے ہیں۔ 1966 سے 1968 تک پاکستان کے وزیر خارجہ 1968 سے 1971 تک اٹارنی جنرل پاکستان رہے۔ 1977 میں اقوام متحدہ کی اقلیت کی سب کمیٹی کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ 1977 میں دوبارہ اٹارنی جنرل ممبر انٹرنیشنل کمیشن اور اسلامی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس ڈرافٹنگ کی ایکسپرٹ کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ 1977 میں وزیر قانون اور اٹارنی جنرل بنے جبکہ 1978 سے 1984 تک ایک مرتبہ پھر وزیر قانون اور اٹارنی جنرل رہے 1981 میں کمپنی لاء کمیشن کے چیئرمین رہے۔ 1965 میں رن آف کچھ کے معاملے پر انٹرنیشنل ٹریبونل میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ اس کے علاوہ اہم مقدمات میں پیش رہے۔ 1985 سے 1988 تک او آئی سی کے سیکرٹری جنرل رہے۔ 1993 میں نگران وزیر خارجہ رہے۔ 1998 میں نشان امتیاز حاصل کیا، چیف ایگزیکٹو کے اعزازی سینئر ایڈوائزر مقرر ہوئے۔ 1998 میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے ممبر بنے 2000 میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے ایڈہاک جج مقرر ہوئے اور اب وزیر اعظم کے مشیر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سید شریف الدین پیرزادہ نے پاکستان کی آئینی تاریخ میں ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور اکثر، بیشتر ان کو وکلاء برادری اور اپوزیشن جماعتوں کی جانب سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

سپریم کورٹ میں سید شریف الدین پیرزادہ کے علاوہ صدر کی جانب سے دوسرے وکیل راجہ محمد ابراہیم ستی پیش ہو رہے ہیں۔ جنہوں نے ایک وکیل کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور ایڈووکیٹ سپریم کورٹ بنے اور سپریم کورٹ میں شہباز شریف کی آئینی درخواست میں حکومت کی نمائندگی کے علاوہ متعدد مقدمات میں پیش ہو چکے ہیں۔ وفاق کی جانب سے جسٹس (ر) ملک محمد قیوم نمائندگی کر رہے ہیں جنہوں نے کہا ہے کہ چیف جسٹس کی آئینی درخواست کے علاوہ باقی تمام آئینی درخواستوں میں وہ وفاق کی نمائندگی کریں گے۔ جسٹس (ر) ملک محمد قیوم نے واضح طور پر کسی سیاسی جماعت کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار نہیں کیا، تاہم وہ مسلم لیگ (ن) کے ساتھ سیاسی وابستگی رکھتے ہیں۔ فاضل وکیل ایک جج کے صاحب زادے ہیں جو کہ خود بھی لاہور ہائیکورٹ کے جج رہے ہیں اور ایک تنازعے کے نتیجے میں انہوں نے لاہور ہائیکورٹ کے جج کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ جس کے بعد وہ سپریم کورٹ بارایسوسی ایشن کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ وفاق کی جانب سے سینئر ایڈووکیٹ احمد رضا قصوری بھی پیش ہو رہے ہیں۔ جنہوں نے 1973ء میں آئین پاکستان کو بنانے میں اہم کردار ادا کیا پیپلز پارٹی سے وابستہ رہے اور اب سپریم کورٹ کے سینئر وکیل کے طور پر وکالت کے پیشے سے منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ حکومتی پینل میں دیگر وکلاء بھی سپریم کورٹ میں نمائندگی کریں گے جن میں سابق

ایڈووکیٹ جنرل پنجاب مقبول الٰہی ملک اہم شخصیت ہیں، جب کہ صدر مملکت کی جانب سے سپریم جوڈیشل کونسل میں وکلاء کا ایک پینل نمائندگی کر رہا ہے۔ جس کی سربراہی سابق وزیر قانون ڈاکٹر خالد رانجھا کر رہے ہیں جو کہ جنرل پرویز مشرف کی حکومت میں وزیر قانون بھی رہے۔ مسلم لیگ قائداعظم گروپ میں شمولیت اختیار کی، اس سے قبل بار ایسوسی ایشن میں اہم عہدوں پر رہ چکے ہیں اور اب مسلم لیگ کی جانب سے سینیٹر مقرر ہوئے ہیں۔ سپریم جوڈیشل کونسل میں دیگر حکومتی پینل میں امان اللہ کنرانی ممتاز قانون دان سابق چیئرمین سینیٹ اور موجودہ سینیٹ میں حکومتی جماعت کے قائد ایوان وسیم سجاد کے علاوہ راجہ عبدالرحمٰن عارف چوہدری شامل ہیں۔ وفاق نے سپریم جوڈیشل کونسل اور سپریم کورٹ میں حکومتی نمائندگی کے لیے الگ الگ وکلاء کے پینل تشکیل دیے ہیں۔



عدلیہ کی آزادی......حقیقت یا خواب (اسلم لودھی)

سپریم کورٹ فل کورٹ کے ارکان

صدارتی ریفرنس کے معاملے پر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سمیت دیگر درخواست گزاروں کی آئینی درخواستوں کی سماعت کے لیے تشکیل دی جانے والی فل کورٹ میں چاروں صوبوں سے تعلق رکھنے والے جج صاحبان کی نمائندگی ہے۔فل کورٹ میں شامل 8 جج صاحبان کا تعلق پنجاب، سندھ سے 3، سرحد سے 2 اور بلوچستان سے ایک جج شامل ہیں۔فل کورٹ کے سربراہ مسٹر جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے 1968ء میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے سپیشل سرٹیفکیٹ آف آنرز کے ساتھ پاس ہوئے۔1969ء میں ماتحت عدلیہ کے وکیل، 1971ء میں ایڈووکیٹ ہائی کورٹ اور 1976ء میں ایڈووکیٹ سپریم کورٹ بنے۔1976ء میں پنجاب کے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل، 1984ء میں ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل اور 1987ء میں ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔اکتوبر 1988ء میں لاہور ہائی کورٹ اور جنوری 2002ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس محمد نواز عباسی نے بی اے ایل ایل بی، ڈی ایل ایل شریعہ کورٹس میں کیا۔1992ء میں ہائی کورٹ اور 2002ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس فقیر محمد کھوکھر 1996ء میں ہائی کورٹ اور 2002ء میں سپریم کورٹ کے جج بنے۔مسٹر جسٹس فلک شیر بیرسٹر ایٹ لاء ہیں۔1987ء میں لاہور ہائی کورٹ اور 2002ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر میاں شاکر اللہ جان 1993ء میں پشاور ہائی کورٹ اور 2004ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس ایم جاوید بٹر 1994ء میں لاہور ہائی کورٹ اور 2004ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس تصدق حسین جیلانی 1994ء میں لاہور ہائی کورٹ اور 2004 ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس سید سعید اشہد 1997ء میں سندھ ہائی کورٹ کے جج 2000 ء میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جب کہ 2005ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس ناصر الملک بیرسٹر ایٹ لاء ہیں، 1994ء میں پشاور ہائی کورٹ کے جج اور 2004ء میں چیف جسٹس جب کہ 2005ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس راجہ فیاض احمد 1997ء میں بلوچستان ہائی کورٹ کے جج 2000ء میں بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور پھر 2005 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس چودھری اعجاز احمد 1997ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج اور 2005ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس سید جمشید علی 1998ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج جبکہ 2005ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔مسٹر جسٹس حامد علی مرزا 1995ء میں سندھ ہائی کورٹ کے جج جب کہ 2000ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔سپریم کورٹ میں بطور ایڈہاک جج دو مرتبہ تقرری ہوئی۔مسٹر جسٹس غلام ربانی سندھ ہائی کورٹ کے جج بنے پھر سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج کے عہدے پر تقرری ہوئی۔



عبوری آئین کے تحت حلف نہ اٹھانے والے جج صاحبان

سپریم کورٹ کی تاریخ میں چند مواقع ایسے بھی آئے جب ججوں نے پی سی او یا آئین سے متصادم قوانین کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔26 جنوری 2001ء کو اس وقت کے صدر رفیق تارڑ نے جب 1999ء کے عبوری دستوری حکم نامہ (پی سی او) کے تحت سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج صاحبان کو از سر نو حلف اٹھانے کا حکم دیا تو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی سمیت چھ ججوں نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ جن میں جسٹس سعید الزمان صدیقی کے علاوہ جسٹس مامون قاضی، جسٹس وجیہہ الدین احمد جسٹس کمال منصور عالم جسٹس ناصر اسلم زاہد اور جسٹس خلیل الرحمٰن شامل تھے۔ جس کے نتیجے میں حلف اٹھانے والے جسٹس ارشاد حسن خان، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ حلف اٹھانے والے دیگر ججوں میں جسٹس محمد بشیر جہانگیری، جسٹس شیخ اعجاز نثار، جسٹس عبدالرحمٰن خان، جسٹس شیخ ریاض احمد، جسٹس چودھری محمد عارف اور جسٹس منیر اے شیخ شامل تھے۔

ہائی کورٹ کے متعدد ججوں نے بھی حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ان سے بھی پی سی او کے تحت حلف اٹھانے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس طرح سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے 13 فاضل جج ملازمت سے فارغ ہو گئے۔ حکومت نے حلف اٹھانے کے لیے سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس خلیل الرحمٰن، لاہور ہائی کورٹ کے دو اور سرحد ہائی کورٹ کے چار فاضل ججوں کو مدعو ہی نہیں کیا۔ وفاقی شرعی عدالت کے چار ججوں نے بھی حلف اٹھایا ہے اور جسٹس فضل الٰہی کو شرعی عدالت کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا ہے۔

اس کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے سپریم کے سابق جج جسٹس جاوید اقبال نے کہا کہ موجودہ حکومت نے ضیاء الحق والا طریقہ اختیار کیا۔ سابق گورنر سندھ اور اٹارنی جنرل فخر الدین جی ابراہیم نے کہا تھا کہ فوجی حکومت کو یہ کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حلف سے انکار کرنے کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کے سوال پر حکومت کو جواب دینا ہوگا۔ نامور قانون داں حبیب وہاب الخیری نے اس حلف کو عدلیہ کی بربادی قرار دیا تھا۔ اسکے ذمے دار شریف الدین پیرزادہ ہیں۔ سابق جج لاہور ہائی کورٹ ذکی الدین پال اور سابق وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ نے کہا کہ اس معاملے میں عدلیہ تقسیم ہوگئی ہے۔ جسٹس (ر) اے کے ڈوگر نے کہا کہ پی سی او کے تحت حلف اٹھانے والے ججوں نے آئین کی خلاف ورزی کی ہے۔

واضح رہے کہ 19 سال قبل ضیاء الحق نے بھی عبوری آئین کے تحت ججوں کو نیا حلف اٹھانے کے لیے کہا تھا۔ اس وقت سپریم کورٹ کے چیف جسٹس انوار الحق، جسٹس دراب پٹیل، جسٹس ذکی الدین پال اور جسٹس فخر الدین جی ابراہیم نے عبوری حکم کے تحت از سر نو حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے 12 ججوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ چیف جسٹس انوار الحق کے انکار کے بعد جسٹس محمد حلیم چیف جسٹس بنا دیے گئے تھے۔



پاکستان کے چیف جسٹس صاحبان

قیام پاکستان سے اب تک سپریم کورٹ آف پاکستان کے 20 چیف جسٹس صاحبان مقرر ہو چکے ہیں۔ پہلے چیف جسٹس جناب جسٹس عبدالرشید تھے اور 20 ویں چیف جسٹس جناب جسٹس افتخار محمد چودھری ہیں۔ ان 20 جسٹس صاحبان میں ایک ہفتے کی مدت سے لے کر 8 سال کی مدت تک کے چیف جسٹس صاحبان اپنے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ چیف جسٹس صاحبان کی اکثریت 65 سال کی عمر پوری کرنے پر ریٹائر ہوئی، تاہم چند ایک چیف جسٹس صاحبان مختلف حالات کے تحت ریٹائر ہوئے۔ پاکستان کی تاریخ میں چیف جسٹس جناب جسٹس سجاد علی شاہ وہ چیف جسٹس ہیں جنہیں خود عدالت نے ان کے عہدے سے ہٹایا، جب کہ چیف جسٹس جناب جسٹس انوار الحق اور چیف جسٹس جناب سعید الزماں صدیقی نے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھایا، جس کے باعث وہ اس عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔ اسی طرح جسٹس محمد یعقوب اور جسٹس ریاض احمد شیخ ایک آئینی ترمیم کے باعث عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

جسٹس سر عبدالرشید (7 جون 1949ء تا 29 جون 1954ء)

جسٹس سر عبدالرشید 29 جون 1889ء کو بھگوان پورہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے حصول کے بعد 1913ء میں وکالت شروع کی۔ 1933ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ 1949ء میں محکمۂ عدالت (Judicafure) لاہور کے چیف جسٹس بنے۔ 15 اگست کو انہوں نے پہلے چیف جسٹس آف پاکستان اور بھارت میں سب سے سینئر مسلم جج کی حیثیت سے قائداعظم محمد علی جناح سے گورنر جنرل پاکستان کے عہدے کا حلف لیا۔ 27 جون 1949ء کو انہیں چیف جسٹس پاکستان کے عہدے پر ترقی دی گئی جہاں وہ 29 جون 1954ء کو 65 برس کی عمر میں ریٹائر ہوئے۔

جسٹس محمد منیر (29 جون 1954ء تا 2 مئی 1960ء)

جسٹس محمد منیر 1895ء کو پیدا ہوئے۔ 1921ء میں امرتسر سے وکالت کا آغاز کیا۔ 1922ء میں لاہور آ گئے۔ 1942ء میں محکمہ عدالت لاہور بنچ کے جج مقرر ہوئے۔ 1949ء میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے 29 جون کو چیف جسٹس پاکستان سر عبدالرشید کی ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ 65 برس کی عمر میں 2 مئی 1960ء کو اس عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

جسٹس محمد شہاب الدین (3 مئی 1960ء تا 12 مئی 1960ء)

جسٹس محمد شہاب الدین 13 مئی 1895ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ 1921ء میں سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ بعدازاں مجسٹریٹ اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی حیثیت سے 1943ء تک خدمات انجام دیں۔ پہلے انہیں مدراس ہائی کورٹ کا ایڈیشنل جج مقرر کیا گیا، پھر 1946ء میں جج کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی۔ تقسیم کے بعد انہیں ڈھاکا ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ 1950ء میں اسی کورٹ کے چیف جسٹس بنے۔ 1953ء میں وفاقی عدالت (سپریم کورٹ) کے جج مقرر ہوئے۔

جسٹس اے آر کارنیلیس (13 مئی 1960ء تا 29 فروری 1968ء)

جسٹس ایلون رابرٹ (اے آر) کارنیلیس کیتھولک عیسائی تھے۔ 1903ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ 1926ء میں سول سروس میں شامل ہوئے۔ اسسٹنٹ کمشنر اور ڈسٹرکٹ اینڈ سول جج کی حیثیت سے پنجاب میں 1943ء تک خدمات انجام دیں۔ 1946ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر ترقی پائی۔ پاکستان بننے کے بعد 1951ء میں وفاقی عدالت پاکستان کے جج مقرر ہوئے۔ 1954ء میں جب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر نے گورنر جنرل کی جانب سے اسمبلی توڑنے کے فیصلے کو برقرار رکھا تو جسٹس کارنیلیس نے اس میں اختلافی نوٹ لکھا۔ وہ جسٹس محمد صبیح الدین کی ریٹائرمنٹ کے بعد 3 مئی 1960ء کو چیف جسٹس آف پاکستان بنے اور 65 برس کی عمر میں 29 فروری 1968ء میں ریٹائر ہوئے۔

جسٹس شیخ عبدالرحمٰن (یکم مارچ 1968ء تا 3 جون 1968ء)

جسٹس شیخ عبدالرحمٰن 4 جون 1903ء کو پیدا ہوئے۔ 1926ء میں انڈین سول سروس سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ 1946ء تک پنجاب کے مختلف اضلاع میں اسسٹنٹ کمشنر اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، پھر لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ 1954ء میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے۔ 1955ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنائے گئے۔ 1958ء میں سپریم کورٹ کے جج بنے اور 29 فروری 1968ء کو جسٹس کارنیلیس کی ریٹائرمنٹ کے بعد چیف جسٹس پاکستان بنے۔ ان کی مدت بھی مختصر تھی۔ صرف تین ماہ بعد 65 برس کی عمر ہونے پر 3 جون 1968ء کو ریٹائر ہوئے۔

جسٹس فضل اکبر (3 جون 1968ء تا 17 نومبر 1968ء)

جسٹس فضل اکبر 1903ء میں پیدا ہوئے۔ 1931 میں فورٹ ولیم ہائی کورٹ میں وکیل کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور کول کتہ یونیورسٹی میں قانون پڑھاتے رہے۔ 1943ء سے 1946ء تک ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر کام کیا۔ تقسیم کے بعد 1949ء میں ہائی کورٹ مشرقی پاکستان کے جج مقرر ہوئے۔ 1960ء میں سپریم کورٹ کے جج کے عہدے پر ترقی پائی۔ 4 جون 1968ء کو جسٹس ایس اے رحمٰن کے ریٹائرمنٹ کے بعد چیف جسٹس بنے۔ ان کی مدت بھی مختصر تھی، محض 5 ماہ بعد 65 برس کی عمر کو پہنچ کر 17 نومبر 1968ء کو ریٹائر ہوئے۔

جسٹس حمودالرحمٰن (18 نومبر 1968ء تا 31 اکتوبر 1975ء)

جسٹس حمودالرحمٰن 1910ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ 1938ء میں کول کتہ سے وکالت شروع کی۔ تقسیم کے بعد 1948ء میں ڈھاکا آ گئے۔ 1954ء میں ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے سے ترقی پا کر ڈھاکا ہائی کورٹ کے جج بنے۔ 1960ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور 1968ء میں جسٹس فضل اکبر کی ریٹائرمنٹ کے بعد چیف جسٹس پاکستان بنائے گئے، جہاں سے وہ 31 اکتوبر 1975ء کی ریٹائر ہوئے۔ جسٹس حمودالرحمٰن نے سانحہ مشرقی پاکستان کی تحقیقاتی کمیشن کی سربراہی بھی کی۔

جسٹس محمد یعقوب علی (یکم نومبر 1975ء تا 22 ستمبر 1977ء)

جسٹس محمد یعقوب 1912ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ 1965ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ 1965ء میں ترقی پا کر سپریم کورٹ کے جج بنے۔ یکم نومبر کو پاکستان کے چیف جسٹس بنائے گئے۔ نصرت بھٹو کیس کے دوران چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی جانب سے ایک آئینی ترمیم کے باعث وہ 22 ستمبر 1977ء کو اپنے عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔

جسٹس انوار الحق (23 ستمبر 1977ء تا 25 مارچ 1981ء)

جسٹس انوار الحق 11 مئی 1917ء کو پیدا ہوئے۔ 1939ء میں سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔

جسٹس محمد حلیم (25 مارچ 1981ء تا 31 دسمبر 1989)

جسٹس محمد حلیم یکم جنوری 1925ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ 11 اگست 2006ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا، وہ پاکستان کے چیف جسٹس کے عہدے پر سب سے زیادہ مدت تک فرائض انجام دینے والے جسٹس ہیں۔ ان کے والد محمد وسیم پاکستان کے پہلے ایڈووکیٹ جنرل تھے۔

جسٹس محمد افضل ظلّہ (یکم جنوری 1990ء تا 18 اپریل 1993ء)

جسٹس محمد افضل ظلّہ 19 اپریل 1928ء کو بجیال مندرہ ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ 1968 میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ 1979ء میں سپریم کورٹ کے جج بنائے گئے۔ یکم جنوری 1990ء کو چیف جسٹس بنائے گئے، جہاں سے 65 برس عمر ہونے پر 19 اپریل 1993ء کو ریٹائر ہوئے۔

جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ (19 اپریل 1993ء تا 14 اپریل 1994ء)

جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ 15 اپریل 1929ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ 39 برس کی عمر میں ہائی کورٹ کے جج بنے۔ 65 برس میں 14 اپریل 1994ء کو پاکستان کے چیف جسٹس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اس طرح کہا جاتا ہے کہ وہ جسٹس کے طور پر طویل عرصے تک خدمات انجام دینے والوں میں سرفہرست ہیں۔ 1993ء میں وزیراعظم نواز شریف کی حکومت صدر غلام اسحٰق خان کی جانب سے برطرف کیے جانے کے فیصلے کو کالعدم قرار دے کر نواز شریف حکومت بحال کر کے پاکستان کی سیاسی اور عدالتی تاریخ میں ایک باب رقم کیا۔

جسٹس سجاد علی شاہ (5 جون 1994ء تا 2 دسمبر 1997ء)

جسٹس سجاد علی شاہ کو 1994ء میں اس وقت کی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے دو سینئر ججوں کو نظر انداز کر کے چیف جسٹس پاکستان مقرر کیا۔ جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی 14 اپریل 1994 کو بحیثیت چیف جسٹس پاکستان ریٹائرمنٹ کے بعد اصولی طور پر جسٹس سعد سعود جان کو چیف جسٹس بننا تھا لیکن وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو نے سجاد علی شاہ کو بنا دیا۔ بعد ازاں 1995ء میں جب صدر فاروق لغاری نے محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت کو بدعنوانی کے الزامات کے تحت برطرف کیا تو چیف جسٹس سجاد علی شاہ اور دیگر 6 ججوں پر مشتمل سپریم کورٹ نے صدر فاروق لغاری کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ پھر دسمبر 1997ء میں جب وزیراعظم نواز شریف نے 8 ویں ترمیم ختم کر کے تیرہویں ترمیم پارلیمنٹ سے منظور کرائی تھی جسٹس سجاد علی شاہ کی سربراہی میں قائم تین رکنی بنچ نے 13 ویں ترمیم کو معطل کر کے 8 ویں ترمیم بحال کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس فیصلے کے خلاف جسٹس سعید الزماں صدیقی کی سربراہی میں قائم 10 رکنی بنچ نے حکم امتناعی جاری کر دیا، سپریم کورٹ نے جسٹس سجاد علی شاہ کی بطور چیف جسٹس اور تیرہویں ترمیم کے حوالے سے پٹیشنوں کا فیصلہ کیا۔ سپریم کورٹ کے 10 رکنی بنچ نے اجمل میاں کو، جو قائم مقام چیف جسٹس تھے، انہیں مکمل طور پر چیف جسٹس بنانے کا حکم دیا۔ اس فیصلے کے بعد جسٹس سجاد علی شاہ ریٹائر ہو گئے۔

جسٹس اجمل میاں (23 دسمبر 1997ء تا 30 جون 1999ء)

جسٹس اجمل میاں 4 جولائی 1934ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ 18 مارچ 1978ء کو سندھ ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج بنے، 17 مارچ 80ء کو مکمل جج مقرر کیا گیا۔ 4 ستمبر 1988ء کو سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے، 10 دسمبر 89ء کو ترقی پا کر سپریم کورٹ کے جج بنائے گئے۔ جسٹس اجمل 23 دسمبر 1997ء کو سپریم کورٹ کے حکم پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بنے تھے۔

جسٹس سعید الزماں صدیقی (یکم جولائی 1999ء تا 26 جنوری 2000ء)

جسٹس سعید الزماں صدیقی یکم دسمبر 1937ء کو پیدا ہوئے۔ یکم جولائی 1999ء کو چیف جسٹس بنے، تاہم 2000ء میں جب صدر جنرل پرویز مشرف نے پی سی او جاری کیا تو انہوں نے اس کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کرتے ہوئے 26 جنوری کو استعفیٰ دے دیا۔ وہ 5 مارچ 1980ء کو سندھ ہائی کورٹ کے جج بنے۔ نومبر 1990ء میں چیف جسٹس بنے۔ مئی 1992ء میں سپریم کورٹ کے جج بنائے گئے، جہاں یکم جولائی 1999ء کو انہوں نے چیف جسٹس پاکستان کا حلف اٹھایا۔

جسٹس ارشاد احمد خان (26 جنوری 2000ء تا 6 جنوری 2002ء)

جسٹس بشیر جہانگیری (7 جنوری تا 31 جنوری 2002ء)

جسٹس بشیر جہانگیری یکم فروری 1937ء کو مانسہرہ میں پیدا ہوئے۔ 7 مارچ 1966ء کو سول جج بنے۔ یکم فروری 1988ء کو پشاور ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے، جہاں ترقی پا کر چیف جسٹس بنے، پھر 22 فروری 1995ء کو سپریم کورٹ بھیج دیے گئے۔ جہاں 6 جنوری 2002 کو جسٹس ارشاد احمد خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد چیف جسٹس بنائے گئے، تاہم ان کی میعاد صرف 24 دن تھی۔

جسٹس شیخ ریاض احمد (یکم فروری 2002ء تا 31 دسمبر 2003ء)

جسٹس شیخ ریاض احمد یکم فروری 2002ء کو چیف جسٹس بنائے گئے، قبل ازیں انہیں 1997ء میں سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا گیا تھا، اس سے پہلے وہ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس اور پھر چیف جسٹس رہے، انہوں نے چیف جسٹس کی حیثیت سے مختاراں مائی کیس کا ازخود نوٹس لیا تھا۔

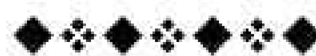
جسٹس ناظم حسین صدیقی (31 دسمبر 2003ء تا 30 جون 2005ء)

صدر جنرل پرویز مشرف کی جانب سے 17 ویں آئینی ترمیم کے بعد سپریم کورٹ کے 10 جج صاحبان بشمول چیف جسٹس شیخ ریاض احمد بھی ریٹائر ہو گئے۔ جس کے بعد جسٹس ناظم حسین صدیقی چیف جسٹس مقرر ہوئے، جسٹس ناظم حسین صدیقی مارچ 1992ء میں سندھ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ پھر 1999 میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے، جہاں سے فروری 2000ء میں انہیں ترقی دے کر سپریم کورٹ کا جج بنایا گیا۔ انہوں نے صدر جنرل پرویز مشرف کے خلاف 17 ویں ترمیم کے حوالے سے 6 پٹیشنوں کو خارج کر دیا تھا۔

جسٹس افتخار محمد چودھری

پاکستان کے 20 ویں چیف جسٹس ہیں۔ 12 دسمبر 1948ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ 9 مارچ 2007ء کو انہیں غیر فعال بنایا گیا اور ایک طرح سے نظر بند کر دیا گیا۔ البتہ 5 مئی کو ان کی یہ نظر بندی ختم کر دی گئی۔ انہوں نے پاکستان اسٹیل ملز، پرائیویٹائزیشن، حسبہ بل، گم شدہ افراد اور 2007ء کے کئی کیسز میں اہم ترین رولنگ دی ہیں۔

فنون اور قانون میں بیچلرز کی ڈگریاں رکھنے والے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے 1974ء میں بار میں شمولیت اختیار کی۔ ہائی کورٹ میں 1976ء میں اور سپریم کورٹ میں 1985ء میں پریکٹس کے لیے اندراج کرایا۔ 1989ء میں بلوچستان کے ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ 6 نومبر 1990ء کو بلوچستان ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور 21 اپریل 1999ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ 4 فروری 2000ء کو سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور 30 جون 2005ء کو صدر جنرل پرویز مشرف نے انہیں سینئر ترین جج ہونے کے سبب سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کیا۔ ان سے قبل جسٹس ناظم حسین صدیقی چیف جسٹس تھے۔



عدلیہ کے سربراہان کی تذلیل

وطن عزیز میں گزشتہ دواڑھائی عشروں کے دوران مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری پانچویں چیف جسٹس آف پاکستان ہیں' جنہیں انتظامیہ کے جابر سربراہ اپنے گماشتوں کے ذریعے رسوا کر کے انہیں اعلیٰ ترین عدالتی عہدہ سے اس لیے ہٹانا چاہتے ہیں کہ ان کی من مانی کارروائیوں میں کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ ان سربراہان میں دو فوجی آمر ہیں اور ایک سویلین ہے۔ اول ذکر میں سرفہرست جنرل ضیاء الحق ہیں' جنہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی جسٹس یعقوب علی خان کو چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے سے فارغ کیا اور اس کے بعد جسٹس انوار الحق چیف جسٹس آف پاکستان کو ان کے دو سینئر ساتھیوں فخر الدین جی ابراہیم اور دراب پٹیل سمیت اس لیے عدالتی عہدوں سے ہٹایا کیونکہ انہوں نے نیا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا' حالانکہ سپریم کورٹ نے جسٹس انوار الحق کی سرکردگی میں ان کے فوج انقلاب کو ''نظریہ ضرورت'' کے فرسودہ اصول کی بنا پر جائز ہونے کا سرٹیفکیٹ عطا کیا تھا۔ تیسرے نمبر پر جسٹس سجاد علی شاہ کی شامت آئی۔ وہ انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالتوں کے قیام کی مخالفت پر وزیر اعظم میاں نواز شریف کو ناراض کر بیٹھے۔ جنہوں نے ایک پریس کانفرنس میں شاہ صاحب کے خلاف سخت کلامی کی جس پر شاہ صاحب نے میاں صاحب کے خلاف ہتک عدالت کے علاوہ ان کے خلاف چند پینڈنگ مقدمات میں کارروائی شروع کی اور انہیں عدالت میں اصالتاً حاضری کیلئے طلب کیا۔ میاں صاحب مع وکیل حاضر ہوئے اور ان کے وکیل نے وضاحتی بیان میں میاں صاحب کی جانب سے ایک طریقے سے معافی مانگی۔

چاہئے تو یہ تھا کہ شاہ صاحب اس بات کو ختم کر دیتے لیکن انہوں نے معاملے کو طول دیا اور کارروائی مقدمات ہفتہ بھر کے لیے ملتوی کر دی۔ اس دوران میاں صاحب کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ چیف جسٹس صاحب کہیں اسے آئندہ تاریخ پیشی پر سزا ہی نہ دے دیں۔ لہٰذا انہوں نے سپریم کورٹ کے کوئٹہ بنچ کو اپروچ کر کے اپنے کسی حواری کی آئینی درخواست پر شاہ صاحب کے خلاف حکم امتناعی حاصل کر لیا کہ وہ تا حکم ثانی بطور چیف جسٹس سپریم کورٹ کام نہ کریں' کیونکہ وہ جسٹس اجمل میاں جج سپریم کورٹ سے جونیئر جج ہیں۔ سپریم کورٹ کے دو جونیئر ججوں کا اپنے چیف جسٹس کو اس کے فرائض منصبی کی ادائیگی سے روکنا اور وہ بھی حکومت کے سربراہ کے ایما یا اشارے پر۔ اقوام عالم کی عدالتی تاریخ میں اس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی غیر معمولی اقدام وقوع پذیر ہوا ہو۔ بہر حال شاہ صاحب نے لارجر بنچ بنا کر مذکورہ حکم امتناعی کو ختم کر دیا اور میاں نواز شریف وزیر اعظم کے خلاف مقدمات کی کارروائی جاری رکھی۔ اب میاں صاحب نے لاہوریوں والا حربہ استعمال کیا اور اپنے بھائی میاں شہباز شریف جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے کے ذریعے اپنی پارٹی کے غنڈوں اور شرپسندوں' جن کی قیادت ان کی پارٹی کے چند عوامی نمائندے کر رہے تھے' سے سپریم کورٹ پر حملہ کرا دیا اور جب وہ عناصر تمام رکاوٹیں پھلانگتے ہوئے چیف جسٹس کے کمرہ عدالت میں جہاں شاہ صاحب برادر ججوں کے مقدمات سن رہے تھے' جا پہنچے اور گالی گلوچ کرتے ہوئے ان پر حملہ کرنے والے تھے کہ شاہ صاحب اور ان کے ساتھی جج ڈائس چھوڑ کر اپنے چیمبرز میں چلے گئے اور جان بچائی لیکن شاہ صاحب اور ان کے دو ساتھی ججوں نے میاں صاحب کے خلاف مقدمات کی سماعت نہ چھوڑی اور کارروائی ملتوی کر دی۔

میاں صاحب کا یہ حربہ بھی اپنے خلاف مقدمات میں کارروائی رکوانے میں کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے سپریم کورٹ میں شاہ صاحب کے مخالف ججوں کو جن کی اکثریت تھی' مختلف طریقوں سے اپنا ہمنوا بنا کر عدالتی کارروائی کے ذریعے شاہ صاحب کو چیف جسٹس کے عہدے سے ہٹانے

کی ٹھانی۔اس ضمن میں جسٹس سعید الزمان صدیقی نے لیڈنگ رول ادا کرتے ہوئے پشاور سے جہاں وہ دو ساتھیوں کے ساتھ سرکٹ پر تھے۔ پہلے کوئٹہ بنچ کے ججوں کی طرح ایک آئینی درخواست پر حکم امتناعی صادر کر کے شاہ صاحب کو انہیں عدالتی اور انتظامی کام کرنے سے روک دیا' پھر تمام دیگر ججوں کو جو مختلف سرکٹس پر تھے۔ اسلام آباد بلوا کر کم وبیش ایک درجن ججوں کی سربراہی کرتے ہوئے شاہ صاحب کو ایک حکم کے ذریعے چیف جسٹس کے عہدے سے ہٹا کر انہیں سپریم کورٹ کا عام جج بنا دیا اور ان کی جگہ جسٹس اجمل میاں کو جو شاہ صاحب سے سینئر تھے۔ چیف جسٹس آف پاکستان بنا دیا۔ چونکہ شاہ صاحب کیلئے کوئی اور راستہ نہیں رہا۔لہٰذا وہ بقایا عرصہ ملازمت جو دو اڑھائی مہینے تھی کیلئے رخصت پر چلے گئے۔ان کے ساتھ ہی مسٹر فاروق لغاری عہدہ صدارت سے مستعفی ہو کر گھر چلے گئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں شاہ صاحب کو لغاری صاحب کی اشیر باد حاصل تھی وہاں میاں نواز شریف کو جنرل جہانگیر کرامت آرمی چیف کی حمایت حاصل تھی۔جنہوں نے مبینہ طور پر شاہ صاحب اور لغاری صاحب کو اپنے اپنے عہدے چھوڑنے پر مجبور کیا۔ ورنہ وہ مختلف طریقوں سے جسٹس صدیقی کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے اوٹ پٹانگ فیصلے پر عمل درآمد کو روک سکتے تھے۔ آخر جسٹس صدیقی نے جسٹس سجاد علی شاہ کی موجودگی میں جنہیں صرف سپریم جوڈیشل کونسل ہی عہدے سے ہٹا سکتی تھی۔ اس طرح چیف جسٹس کے اختیار استعمال کرنے شروع کر دیئے اور صدر کا رول ادا کرتے ہوئے جسٹس اجمل میاں کو چیف جسٹس آف پاکستان بننے کا حلف دے دیا۔ واضح رہے کہ جسٹس سجاد علی شاہ کو جو سپریم کورٹ میں سنیارٹی کی رو سے چوتھے نمبر پر تھے' محترمہ بے نظیر بھٹو نے بطور وزیر اعظم تین سینئر ججوں کو سپرسیڈ کر کے چیف جسٹس آف پاکستان بنا دیا۔ بعد میں مشہور ججز کیس میں جو سپریم کورٹ نے ان کی سربراہی میں فیصلہ کیا یہ قرار دیا گیا کہ چیف جسٹس کے عہدے پر پروموشن صرف اور صرف سنیارٹی پر ہو گی لیکن انہوں نے اس فیصلے کا اطلاق اپنے آپ پر نہ کیا اور بعد میں اس لغزش کا فائدہ میاں نواز شریف نے اٹھایا۔ بہر حال انتظامیہ کے سربراہ کے ہاتھوں عدلیہ کے سربراہ کی رسوائی تو ہوئی اور اول الذکر نے طاقت اور دولت کے بل بوتے پر اپنے خلاف پینڈنگ مقدمات کی کارروائی رکوا لی جو بدستور رکی رہے گی جب تک وہ زندہ ہے۔

اب باری آتی ہے جسٹس سعید الزمان صدیقی صاحب کی جو جسٹس اجمل میاں کی ریٹائرمنٹ پر چیف جسٹس آف پاکستان بنے تھے۔انہوں نے میاں نواز شریف کے اشارے پر جسٹس سجاد علی شاہ کو اعلیٰ عدالتی عہدے سے ہٹایا اور جنرل پرویز مشرف نے فوجی انقلاب کے ذریعے نہ صرف میاں نواز شریف کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹایا بلکہ کچھ عرصے بعد جسٹس سعید الزمان صدیقی کو بھی چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے سے ان کے پانچ ساتھی ججوں سمیت اس بنا پر ''ایک مارشلائی'' حکم کے ذریعے علیحدہ کیا کیونکہ انہوں نے ان کے تحفظ اقتدار کی بابت ایک نیا حلف اٹھانے سے انکار کیا تھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق جسٹس صدیقی کو سپریم کورٹ جانے سے روکنے اور نئی حلف برداری تک اپنی سرکاری رہائش گاہ میں فوجی پہرے میں نظر بند یا محبوس رکھا گیا۔ کیا ہی بھیانک انجام تھا اس اعلیٰ ترین عدالتی عہدے کا۔

جسٹس صدیقی کے جانے کے بعد جسٹس ارشاد حسن خان اور ان کے بعد جسٹس شیخ ریاض احمد چیف جسٹس آف پاکستان بنے لیکن انہوں نے صدر جنرل پرویز مشرف اور ان کے مصاحبین کو ناراضی کا کوئی موقع نہ دیا چونکہ اعلیٰ انتظامیہ ان سے خوش رہی اور وہ تب ہی خوش رہتی ہے جب عدلیہ ان دونوں صاحبان کو کوئی گزند نہ پہنچی اور وہ بخیریت ریٹائر ہوئے۔ باوجود اس کے کہ موخرالذکر کے خلاف خاصی شکایات تھیں اور ممبران بار کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔

شیخ صاحب کے بعد جسٹس افتخار محمد چودھری (موجودہ زیر عتاب چیف جسٹس) چیف جسٹس آف پاکستان بنے۔ انہوں نے روٹین کے مقدمات سماعت کرنے کے علاوہ آئین کے آرٹیکل (۳)۱۸۴ کے تحت عدالتی فعالیت کے اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے مفاد عامہ میں مختلف افراد کی درخواستوں پر یا از خود نوٹس لیتے ہوئے کئی اہم فیصلے ہمراہی ججوں کی مدد سے کیے جن سے حکومت کے مفادات اور اختیارات پر زد پڑی اور اعلیٰ مقتدر اشخاص اور حکومتی ادارے خاص طور پر قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں ان سے ناراض ہو گئے۔ جنہوں نے ان کے خلاف مہم شروع کر دی۔ ان اہم فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ان کی قیادت میں سپریم کورٹ نے پاکستان سٹیل ملز کراچی کی نجکاری اور سیل (Sale) کی منسوخی کا کیا جس کی سارے ملک میں پذیرائی ہوئی کیونکہ یہ مشہور قومی ادارہ جو مبینہ طور پر 200 ارب روپے کی مالیت کے لگ بھگ تھا۔ وفاقی حکومت کے نجکاری

کمیشن نے جس کے سربراہ جناب شوکت عزیز وزیراعظم تھے۔ غیر شفاف طریقے سے مشکوک مالی حیثیت کے افراد کے ہاتھوں صرف 20/22 ارب روپے میں فروخت کر ڈالا۔ اس فیصلے سے وفاقی حکومت خاص طور پر وزیراعظم صاحب کے وقار اور نیک نیتی کو شدید دھچکا لگا اور انتظامیہ کے اعلیٰ افراد چیف جسٹس کو اس فیصلے کا ذمہ دار گردان کر ان کے عہدے کے در پے ہو گئے بلکہ ان کی اور ان کے اہل خانہ کی جان و مال و عزت کے دشمن بن گئے۔ اس مذموم ارادے کی تکمیل کیلئے ان کو نعیم بخاری جیسے آلہ کار مل گئے جنہوں نے چیف جسٹس کے خلاف ایک الزامات بھرا خط پرنٹ میڈیا میں لکھ مارا۔ اس میں زیادہ تر الزامات ایسے تھے جن کے ساتھ ان کا دور کا واسطہ بھی بطور ایک عام وکیل کے نہ تھا۔

بہرحال وزیراعظم صاحب نے اس خط کی بناء پر وزارت قانون سے چیف جسٹس صاحب کے خلاف آئین کے آرٹیکل ۲۰۹ کے تحت سپریم جوڈیشل کونسل کے پاس دائر کروانے کے لیے ریفرنس تیار کروا کر صدر جنرل پرویز مشرف کو بھجوایا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا چیف جسٹس کو صدر صاحب نے ریفرنس میں شامل الزامات کی جواب طلبی کیلئے آرمی ہاؤس یا صدارتی کیمپ آفس راولپنڈی بلوایا یا چیف جسٹس صاحب خود نعیم بخاری کے کھلے خطے میں شامل الزامات کی وضاحت کیلئے یا وزیراعظم صاحب کے خلاف شکایت کرنے کیلئے خود صدر صاحب کے پاس گئے اور وہاں کئی گھنٹے زبردستی رکھے گئے یا وہ مفصل وضاحت کرتے ہوئے خود وہاں ٹھہرے رہے۔ البتہ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ وزیراعظم شوکت عزیز بھی وہاں آ گئے تھے اور صدر صاحب نے چیف جسٹس صاحب سے استعفیٰ طلب کیا اور انہوں نے انکار کر دیا جس پر صدر صاحب نے ۹ مارچ کو سپریم جوڈیشل کونسل کے پاس برخلاف چیف جسٹس صاحب ریفرنس دائر کر دیا۔ جس میں سٹیل ملز والے مقدمے کے فیصلے کا بھی ذکر تھا۔ بقول وفاقی وزیر قانون' انہی وزیر صاحب نے چند روز پہلے اپنے اخباری بیان میں انکشاف کیا کہ اس نے تو ۹ مارچ ہی کو سمری چیف جسٹس صاحب کو لازمی رخصت پر بھجوانے کیلئے بھجوا دی تھی لیکن سپریم جوڈیشل کونسل نے اسی تاریخ کو بعد از وصولی ریفرنس از ان صدر صاحب' چیف جسٹس صاحب کو تا فیصلہ ریفرنس غیر فعال ہونے کا حکم صادر کر دیا تھا۔

اخباری اطلاعات سے ظاہر ہے کہ ۹ مارچ کو ہی کونسل کے حکم کی بناء پر انتظامیہ نے چیف جسٹس آف پاکستان کو ان کے فیملی ممبرز سمیت ان کی سرکاری رہائش گاہ میں پولیس کے پہرے تلے نظر بند یا محبوس کر کے ان کے ٹیلیفون وغیرہ کاٹ کر ان کو تمام سہولتوں سے محروم کر دیا تھا۔ ۱۳ مارچ کو جب وہ کونسل کی طلبی پر اس کے سامنے پیش ہونے کیلئے اپنی رہائش گاہ سے پیدل سپریم کورٹ جانے کیلئے روانہ ہوئے کیونکہ ان کی گاڑیاں رات کو ہی بذریعہ لفٹر اٹھوالی گئی تھیں تو پولیس نے انہیں روک کر زبردستی اپنی پولیس وین میں ڈالا۔ اس کشمکش میں ان کا کالا کوٹ بھی پھٹ گیا اور چہرے پر خراشیں بھی آئیں۔ ایک ڈی ایس پی نے انہیں پولیس وین میں سوار کرتے ہوئے ان کے بال بھی کھینچے۔ اس حالت میں انہیں لے کر جب پولیس وین سپریم کورٹ پہنچی تو وکلاء کے ہجوم نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور انتظامیہ کے خلاف نعرے بازی کی۔ چیف جسٹس صاحب سپریم جوڈیشل کونسل کے روبرو پیش ہوئے اور ایک درخواست دی جس میں پانچ ممبران کونسل میں سے تین کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا اور بند کمرے میں سماعت کی بجائے کھلے بندوں کارروائی کی استدعا کی۔ انہوں نے جسٹس جاوید اقبال کی تقرری بطور قائم مقام چیف جسٹس پر بھی اپنی موجودگی کی بناء پر اعتراض کیا اس کے بعد کارروائی ملتوی ہو گئی اور اگلی تاریخ پیشی ۱۳ اپریل ہے۔ البتہ ایک درمیانی پیشی پر انہیں چارجز دیئے گئے۔

بادی النظر میں فاضل سپریم جوڈیشل کونسل' جسے آئین پاکستان مجریہ ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۲۰۹ ترتیب دیتی ہے اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے خلاف اپنی اطلاع پر یا صدر کے ریفرنس پر الزامات کی انکوائری کا اختیار دیتی ہے کو کسی زیر انکوائری جج' جیسا کہ اب چیف جسٹس آف پاکستان ہے' کو انکوائری کے دوران اسے معطل کرنے یا غیر فعال کرنے یا لازمی یا جبری رخصت پر بھجوانے کا کوئی اختیار اس آرٹیکل میں یا آئین کی کسی اور شق میں نہیں ہے اور نہ ہی صدر مملکت یا کسی اور فرد یا اتھارٹی کو ایسا کوئی اختیار ہے۔ کونسل کا چیف جسٹس کو غیر فعال یا معطل کرنے کا حکم ماورائے آئین و قانون معلوم ہوتا ہے اور چیف جسٹس اور ان کے اہل و عیال کے خلاف کھلم کھلا انتظامیہ کی مذکورہ بدسلوکی کی دہشت گردی ہے جس کے خلاف صدر صاحب ملکی اور بین الاقوامی لیول پر سینہ سپر ہیں۔ عدلیہ جو مملکت کا تیسرا آئینی ستون ہے۔ اس کے سربراہ کے ساتھ غیر انسانی سلوک' صدر اور وزیراعظم کے مطالبہ برائے استعفیٰ سے انکار کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور اب جب کہ صدر صاحب نے اس غیر قانونی فعل کا وسیع تر شدید ردعمل عوام میں خاص طور پر وکلاء میں اندرون ملک اور بیرون ملک ساری مہذب دنیا میں جہاں معاشرے قانون کی حکمرانی پر یقین رکھتے ہیں دیکھا ہے تو اب انہیں

محسوس ہوا ہے کہ چیف جسٹس کو غیر فعال کرنا غلطی تھی اور اس غلطی کا اعتراف کھل کھلا کرتے پھرتے ہیں۔

انہوں نے چند روز پہلے پاکپتن کے جلسہ عام کے دوران برملا کہا ہے کہ ان کو چیف جسٹس کے خلاف کوئی عناد نہیں ہے اور انہوں نے وزیر اعظم کا تیار کردہ ریفرنس آئین کے مطابق کونسل کو بھجوا دیا تھا جو کچھ سپریم جوڈیشل کونسل اور انتظامیہ نے چیف جسٹس کے ساتھ کیا ہے۔ کیا اسے یا کسی لا تعلق شہری کو یہ توقع ہوسکتی ہے کہ موجودہ کونسل اس کے ساتھ انصاف کرے گی؟ البتہ جسٹس بھگوان داس کے قائم مقام چیف جسٹس بننے پر اور سپریم کونسل کی موجودہ ہیت ترکیبی بدلنے پر شاید اس کے ساتھ انصاف ہونے کی کوئی صورت نکل آئے ورنہ چیف جسٹس صاحب کو اپنے چار پیشروؤں کی طرح اپنے اعلیٰ عدالتی عہدے‘ جسے ابدی نظر بد لگی ہوئی ہے سے بالآخر ہاتھ دھونے ہی پڑیں گے۔ البتہ صدر صاحب اپنی تسلیم شدہ غلطی کا ازالہ کرنے کیلئے اگر اپنا ریفرنس کونسل سے غیر مشروط طور پر واپس لے لیں اور چیف جسٹس صاحب اپنے عہدے پر بحال ہو جائیں تو یہ نہ صرف ان کے اپنے اقتدار کیلئے بہتر ہوگا بلکہ ملک وقوم کیلئے بھی ایک اچھا اقدام ہوگا۔

یہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف جاری تادیبی کارروائی نے جہاں انتظامیہ کی گڈ گورننس‘ حقیقی جمہوریت اور اعتدال پسندی کے بلند بانگ دعوؤں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے‘ وہاں اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کے عہدوں کے آئینی تحفظ کا بھرم بھی توڑ دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتظامیہ کے سربراہ کے رحم وکرم پر ہیں۔ جو آئین کے آرٹیکل ۲۰۹ کے تحت کسی بھی ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے جج کے خلاف کسی بھی شکایت یا اطلاع پر ریفرنس بنا کر سپریم جوڈیشل کونسل کو اس جج کے خلاف برائے انکوائری اور رپورٹ بھجوا سکتا ہے اور اس جج کے خلاف الزامات مندرجہ شکایت ثابت ہوجانے کی رپورٹ ملنے پر اس جج کو عہدے سے برخاست کرسکتا ہے۔ چونکہ سپریم جوڈیشل کونسل سپریم کورٹ کے تین سینئر ججز بشمول چیف جسٹس اور ہائی کورٹ کے دو سینئر ججوں چیف جسٹسز پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کی بھی وہی نازک پوزیشن ہوتی ہے جو دوسرے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی ہوتی ہے۔ انہیں آئینی اختیارات کے استعمال پر صدر صاحب برخلاف چیف جسٹس آف سپریم کورٹ ریفرنس تیار کردہ ازاں وزیر اعظم پر کونسل سے انکوائری کروارہے ہیں اور اس ایکشن اور پولیس کی چیف جسٹس سے بدسلوکی کے خلاف سارے ملک میں وکلاء احتجاج کر رہے ہیں۔

دائر ریفرنس سے پہلے واقعات اور پولیس ایکشن کو چھوڑ کر آرٹیکل ۲۰۹ کے تحت صدر کے اختیارات کو بغور دیکھا جائے تو وہ کافی حد تک عدلیہ کی آزادی اور خودمختاری جو بے لاگ اور بے خطر فراہمی انصاف کیلئے ضروری ہیں۔ سلب کرتے ہیں اور ان کو محدود کرنا ضروری ہے۔ میری دانست میں اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ صدر کو بذریعہ آئینی ترمیم موصولہ شکایت کی مناسب چھان بین کروانے کا پابند بنا کر اگر اس میں کوئی سچائی پائے تو تب برخلاف جج متعلقہ ریفرنس دائر کرے۔ اگر مناسب سمجھے تو بذریعہ وزارت قانون دائر ریفرنس سے پہلے اس جج کے Comments بھی منگوا لے۔ ممکن ہے ریفرنس کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ دوسرا یہ کہ بذریعہ ترمیم آرٹیکل ۲۰۹ یا علیحدہ آرٹیکل بنانے سے اس جج کو جس کے خلاف صدر صاحب نے سبکدوشی عہدہ کا حکم دیا ہو۔ سپریم کورٹ میں اس حکم کے خلاف اپیل کا حق دیا جائے جو اپیل فل کورٹ سماعت کرے۔ ماتحت عدلیہ میں جج کو مجاز اتھارٹی کے حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں سپیشل بنچ کے پاس اپیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ ایسی ہی ترامیم کیلئے حاضر سروس جج اور وکلاء مل کر کوششیں کریں۔

بشکریہ (جسٹس (ر) ملک عبدالمجید ٹوانہ)

◆◇◆◇◆◇◆

سپریم کورٹ کا ضابطہ اخلاق

عدالت عظمٰی کے لارجر بنچ کے فیصلے کے مطابق سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس کی سماعت روک دی گئی اور چیف جسٹس اور حکومت کی آئینی پٹیشن کی سماعت کے لئے فل کورٹ قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ معاملات کو سنبھالنے کی ایک کوشش ہے۔ اب عدالت عظمٰی نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف ریفرنس اور ریفرنس کے خلاف دائر آئینی درخواستوں کے حوالے سے ضابطہ اخلاق جاری کر دیا ہے۔

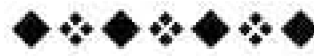
سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ سپریم جوڈیشل کونسل میں چیف جسٹس مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف ریفرنس اور فل کورٹ میں آئینی درخواستیں زیر سماعت ہیں اس لئے عدالتی کارروائی متاثر کرنے والے مباحث اور تبصرے سختی سے منع ہیں۔ خلاف ورزی پر توہین عدالت کے تحت کارروائی ہوگی۔ سپریم کورٹ نے اس حوالے سے نیا ضابطہ اخلاق جاری کر دیا جس میں کہا گیا کہ صدارتی ریفرنس جو سپریم جوڈیشل کونسل کے روبرو اور اس موضوع پر آئینی درخواستیں چونکہ سپریم کورٹ کے روبرو زیر سماعت ہیں اس لئے اس حوالہ سے ایسے مباحثوں، تبصروں اور تحریروں پر پابندی ہے جن کا ریفرنس اور آئینی درخواستوں کی سماعت پر اثر انداز ہونے، اس عمل کا مذاق اڑانے، اس عمل اور معزز عدالت یا عدالت کے کسی جج کے بارے میں منفی تاثر پیدا کرنے کا امکان ہو یا اس کا تعلق مقدمے کی کارروائی سے ہو اور ایسے کسی بھی اقدام پر اس کے ذمہ دار کے خلاف توہین عدالت کے قوانین کے تحت کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ عام شہریوں، وکلاء برادری، اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کیلئے جاری کردہ ضابطہ اخلاق کے تحت آئینی درخواستوں کی سماعت کے موقع پر سپریم کورٹ آنے والے تمام افراد کیلئے ہدایت جاری کی گئی ہے کہ سپریم کورٹ کی عمارت میں سپریم کورٹ کے صرف ان وکلاء اور ایڈووکیٹس آن ریکارڈ کو داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی جس کے مقدمات کی اس دن سماعت کسی بنچ کے روبرو ہونا ہو۔ اسی طرح مدعیان کو بھی ان کی شناخت کے ثبوت کے بعد سپریم کورٹ کی عمارت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ سپریم کورٹ کے وکلاء اور ایڈووکیٹس آن ریکارڈ کو اپنے دفتری فرائض کی ادائیگی کیلئے ہی بار روم اور عدالت عظمٰی کے دفاتر میں جانے کی اجازت ہوگی۔ سپریم کورٹ، ہائی کورٹس اور سول اینڈ ڈسٹرکٹ کورٹس میں معزز جج صاحبان کے داخلے کیلئے راستوں کو دیگر کسی شخص بشمول وکلاء استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اور عدالتوں کے تقدس اور احترام کو برقرار رکھنا وکلاء برادری کے تمام معزز ارکان کا قانونی اور اخلاقی فرض ہے۔ اس لئے بار کے ممبران اس بات کو یقینی بنائیں کہ معزز جج صاحبان کیلئے مخصوص دروازوں سے جج صاحبان کے علاوہ کسی اور کی طرف سے سپریم کورٹ کی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش نہ کی جائے اور سپریم کورٹ کے وکلاء یا ایڈووکیٹس آن ریکارڈ کے علاوہ کسی اور شخص کسی بھی گیٹ کے ذریعہ سپریم کورٹ کی عمارت میں داخل نہ ہو۔ اس کے علاوہ سپریم کورٹ کی عمارت میں یا معزز جج صاحبان کے سپریم کورٹ میں داخلے کیلئے مخصوص دروازوں کے قریب کسی بھی وکیل یا شخص کو نعرے لگانے کی اجازت نہیں ہوگی اور پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کا عدالت میں داخلہ رجسٹرار سپریم کورٹ کی طرف سے جاری کردہ پاس کے ذریعہ سے ہوگا۔ مزید برآں سپریم کورٹ کی جانب سے جاری کردہ پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ یہ بات نوٹس میں آئی ہے کہ فل بنچ میں شامل فاضل جج صاحبان کے ناموں کا جس طرح اخبارات، ٹی وی، ٹاک شوز اور متعلقہ پروگراموں میں ذکر کیا گیا ہے وہ انتہائی قابل اعتراض ہے۔ فاضل ججوں کے ناموں کا غیر محتاط طور پر ''مسٹر جسٹس'' یا ''جسٹس'' کے بغیر ذکر کیا جاتا ہے حتیٰ کہ ان کے پورے نام بھی بیان نہیں کئے جاتے۔ اس رجحان کو روکنے کی ضرورت ہے۔ پریس ریلیز کے مطابق تمام متعلقین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر ٹی وی یا اخبارات میں فاضل جج صاحبان کے ناموں کا حوالہ دینا بہر حال ضروری ہو تو ان کے مکمل ناموں کا درست طور پر ذکر کیا جائے اور ناموں کا ''مسٹر جسٹس'' یا ''جسٹس'' کے ٹائٹل کے ساتھ حوالہ دیا جائے تاکہ عدالت اور جج صاحبان کے وقار اور آداب کو برقرار رکھا جا سکے۔



پیمرا آرڈیننس میں نئی ترامیم

نمبر	موجودہ قانون	نئی ترامیم
1-	پیمرا بل کی شق نمبر 2 کا تعلق نشریاتی میڈیا کی تعریف و تشریح سے ہے۔ پیمرا آرڈیننس کے آرٹیکل 2 میں 2 ترامیم کی گئی ہیں پیمرا آرڈیننس کی شق 2 ذیلی شق جے (J) میں فریکوئنسی کی تعریف بیان کی گئی ہے جس کے مطابق الیکٹرومیگنیٹک لہروں (Elec tromagnetic Wave) کے نمبر کو ٹرانسمیشن کے استعمال کے لئے (Hertz) ہرٹز فی سیکنڈ ماپا جائے گا۔	1- ذیلی شق H-A جو ڈی ٹی ایچ (ڈائریکٹ ٹو ہوم) سے متعلق ہے اس کے ساتھ مزید 2 الفاظ آئی پی ٹی وی (IPTV) اور موبائل ٹی وی کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ 2- ترمیم نمبر 2 کا تعلق فریکوئنسی سے ہے۔ نئی ترمیم کے تحت شق میں شامل فی سیکنڈ کے الفاظ ختم کر دیئے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ لہروں کو ماپا جائے گا جو ٹرانسمیشن کے لئے استعمال ہوں گی۔
2-	آرڈیننس کے آرٹیکل 4 کی ذیلی شق (3) کو ختم کر دیا گیا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ کوئی رکن اتھارٹی کی رخصت کے بغیر اتھارٹی کے تین اجلاسوں میں مسلسل غیر حاضر ہوگا تو اس کا عہدہ خالی تصور کیا جائیگا۔	نئی ترمیم کے تحت ذیلی شق (3) کو ختم کر دیا گیا ہے۔
3-	آرڈیننس کے آرٹیکل 20 جو لائسنسی کے قواعد و ضوابط سے متعلق ہے اس کی ذیلی شق (d) آرڈیننس کے تحت رولز پر عمل درآمد سے متعلق ہے۔	ذیلی شق (D) میں لفظ رولز کے ساتھ ریگولیشنز کا اضافہ کیا گیا ہے۔
4-	آرڈیننس کی شق 23 کی ذیلی شق 2 میں کہا گیا ہے کہ اتھارٹی لائسنس کے اجراء کے عمل میں اس امر کو یقینی بنائے گی کہ یہ ممکنہ حد تک اوپن اور Fair مقابلے کے ذریعے دیا جائے۔	نئی ترمیم کے تحت لفظ Fair کو Fare میں تبدیل کیا گیا ہے۔ جس کے مطابق لائسنس کے اجراء میں متعلقہ فریق کا رنگ ڈھنگ دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا جائے گا۔
5-	آرڈیننس کی شق نمبر 25 کی ذیلی شق (D) کا تعلق ملک کے اندر کام کرنے والی مقامی تنظیم سے ہے جسے لائسنس کا اجرا نہیں ہوسکتا یہ شق مقامی سطح پر NGO's سے متعلق تھی۔	نئی ترمیم کے مطابق اب اس میں غیر ملکی این جی اوز کو ریڈیو اور ٹی وی نشریات کیلئے لائسنس کا اجراء ممنوع ہوگا شق میں ''آرگنائزیشن'' کے لفظ کے ساتھ Foreign non- government organization کا لفظ شامل کیا گیا ہے۔
6-	شق نمبر 27 جو نشریات یا کیبل ٹی وی آپریشن پر پابندی سے متعلق ہے اس میں دو ترامیم کی گئی ہیں۔	ایک ترمیم کے تحت لفظ نتیجتاً Therefore کی جگہ اس لئے Therefor لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے دوسری ترمیم کے تحت CTV آپریٹر کے لفظ کے ساتھ اونر (Owner) لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

-7	شق نمبر 28 جو نشریات یا کیبل ٹی وی آپریشن کی معطلی سے متعلق ہے اس میں ایک ترمیم کی گئی ہے۔	ترمیم کے مطابق اس شق میں کسی چینل کی نشریات کی معطلی کے لئے اتھارٹی کی پیشگی منظوری کے لئے Approval of the Authority میں "of" کی بجائے "by" کا لفظ شامل کیا گیا ہے۔
-8	آرڈیننس کے آرٹیکل 29 میں 2 ترامیم کی گئی ہیں۔	پرووائزو کے ذیلی سیکشن 5 کے اختتام پر فل سٹاپ کی جگہ Colon کا لفظ شامل کیا گیا ہے اور ایک جملے کا اضافہ کیا گیا ہے جس کے تحت پیمرا اتھارٹی یا چیئرمین سیکشن 30 کے تحت حاصل اختیارات کے ذریعے آرڈرز کی خلاف ورزی پر غیر قانونی نشریات چلانے اور تقسیم کرنے والے کے آلات یا مقام کو سربمہر کر سکے گا۔ دوسری ترمیم کے ذریعے ذیلی شق 6 میں ایک کی جگہ دس کیا گیا ہے۔
-9	آرڈیننس کے آرٹیکل 30 جو لائسنس معطل / بحال کرنے کی شرائط سے متعلق ہے اس میں ایک جملے کا اضافہ کیا گیا ہے۔	نئی ترمیم کے تحت آرڈیننس کی شق 30 میں مزید اضافہ کیا گیا ہے جس کے تحت اتھارٹی کے ممبران پر مشتمل کمیٹی ذیلی شق ایک کے تحت دیئے گئے شواہد اور ثبوت پر کسی براڈ کاسٹ میڈیا کا لائسنس معطل کیا جا سکے گا۔
-10	آرڈیننس کا آرٹیکل 39 ریگولیشنز بنانے کے سلسلے میں اتھارٹی کے اختیارات سے متعلق ہے جس کے تحت اتھارٹی کو حکومت کی منظوری سے رولز بنانے کا اختیار دیا گیا۔	نئی ترمیم کے تحت پیمرا اتھارٹی آرڈیننس پر تیزی سے عمل درآمد کے لئے ضرورت پڑنے پر رولز و ریگولیشنز بنا سکے گی۔ اس میں حکومت کی منظوری حاصل کرنا ضروری نہیں ہوگا۔



پیمرا ترمیم پر ردعمل

صدر جنرل پرویز مشرف نے پیمرا ترمیمی آرڈیننس 2007ء جاری کر دیا ہے جس کے تحت پیمرا کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس عمارت کو سیل کر سکتا ہے جہاں غیر قانونی نشریات چل رہی ہوں اس آرڈیننس کے ذریعہ پارلیمنٹ میں دو ہفتے قبل منظور کئے گئے پیمرا ایکٹ کی آٹھ شقوں میں تبدیلی کی گئی ہے اور ایک نئی شق شامل کی گئی ہے جس کے تحت پیمرا کو براڈ کاسٹنگ آلات کو ضبط کرنے اور نشریاتی لائسنس معطل کرنے کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ فوری طور پر نافذ العمل کئے گئے پیمرا آرڈیننس کے تحت چیئرمین پیمرا کو کسی ٹی وی چینل کی نشریات روکنے اور زمینی حالات کو دیکھتے ہوئے متعلقہ ادارے کا نشریاتی لائسنس کسی بھی وقت منسوخ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس آرڈیننس کے تحت قواعد وضوابط کی خلاف ورزی پر جرمانے کی حد دس لاکھ سے بڑھا کر ایک کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔

یہ ترمیمی آرڈیننس ایک ایسے موقع پر جاری کیا گیا ہے، جب دو روز بعد قومی اسمبلی کا اجلاس ہونے والا ہے۔ آرڈیننس موبائل ٹی وی اور دیگر تمام ٹی وی چینلوں کی نشریات پر لاگو ہوگا جس کے بارے میں یہ بھی واضح نہیں کہ اس آرڈیننس کو مجاز فورم اور مجاز اتھارٹی کے روبرو چیلنج بھی کیا جا سکے گا کہ نہیں؟

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ 2002ء کے جس پیمرا آرڈیننس کو چند ہفتے قبل پارلیمنٹ سے منظور کرا کے ایکٹ بنایا گیا' اب ایسی کیا مجبوری لاحق ہوگئی ہے کہ اس ایکٹ میں بھی ردوبدل کیلئے حکومت کو ترامیم کرنے اور پیمرا کو مزید با اختیار بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی جبکہ پیمرا ترمیمی آرڈیننس کی شکل میں لاگو کئے گئے اس نئے قانون کے تحت الیکٹرانک میڈیا کی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قانون اپنی ہیئت اور عملداری کے حوالے سے ''ڈریکونین لاء'' کے زمرے میں ہی شامل ہوگا جس کی کسی مہذب سول سوسائٹی میں قبولیت کی کم ہی گنجائش نکل سکتی ہے۔

جو حکومت اب تک میڈیا کی آزادی اور نجی ٹی وی چینلوں کے اجراء کا کریڈٹ لیتی رہی ہے، اسے اپنے اس کریڈٹ کو ڈس کریڈٹ میں تبدیل کرنے اور اپنے خلاف ایک اور محاذ کھولنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ہے اور اس انتہائی اقدام کے پیچھے کون عوامل اور کس کے مشورے کارفرما ہیں' پوری قوم اس بارے میں سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔

اس ترمیمی آرڈیننس کے نتیجہ میں اندرون ملک ہی نہیں، بیرون ملک بھی حکومت کی بدنامی میں اضافہ ہوگا' جس طرح عدلیہ ریاست کا ایک اہم ستون ہے' اسی طرح پریس اور میڈیا بھی ریاست کا چوتھا ستون ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ حکومت کے نادان مشیر اسے ریاستی اداروں سے ہی لڑانے کے کیوں درپے ہیں؟ جبکہ اس پالیسی سے حکومت کی نیک نامی پر ہی دھبہ نہیں لگے گا' اس کے غیر مستحکم ہونے کی راہ بھی ہموار ہوگی۔ یہ عجیب منطق ہے کہ حکمران طبقہ کی جانب سے پریس کی آزادی کے نعرے بھی لگائے جا رہے ہیں اور میڈیا کا گلا دبانے کے بھی تمام ہتھکنڈے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ اس سے ملکی حالات پر کنٹرول نہ پانے کی صورت میں حکومت کی بوکھلاہٹ کے تاثر کو ہی تقویت ملے گی۔

اسی قسم کی سخت پابندیاں پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی شکل میں جنرل ایوب کے دور میں پرنٹ میڈیا پر بھی عائد کی گئی تھیں جو بالآخر حکومت کے گلے پڑیں اور اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پابندیوں کا حکومت کو فائدہ نہیں ہوا اور وہ غیر مستحکم ہو کر رہی' اسی طرح اب موجودہ حکومت کو بھی میڈیا کی آزادی پر عائد کی جانے والی پابندیوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ اسے نقصان ہی اٹھانا پڑے گا کیونکہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی آزادی کے نتیجہ میں اس وقت عوام میں شعور اور بیداری کی جو لہر پیدا ہو چکی ہے' اسے واپس تو نہیں موڑا جا سکتا' اس لئے میڈیا پر پابندی موجودہ سول سوسائٹی میں کسی صورت قابل قبول نہیں ہو سکتی اور حکومت کے اپنے ہی پیدا کردہ عدالتی ایشو کی طرح یہ ایشو بھی حکومت مخالف تحریک کو تقویت پہنچا سکتا ہے جبکہ پیمرا ترمیمی آرڈیننس کے خلاف اندرون ملک اور بیرون ملک سے سخت ردعمل سامنے آنے بھی لگا ہے۔ گزشتہ روز اسلام آباد میں مشعل بردار جلوس اور ملک بھر میں صحافی برادری کے ساتھ ساتھ دیگر مکاتب فکر کے لوگوں کے احتجاجی مظاہرے اس سلسلہ کی کڑی ہیں جبکہ امریکی دفتر خارجہ کی جانب سے بھی باور کرایا گیا ہے کہ امریکہ پاکستان میں نجی ٹی وی چینلز پر پابندی کا بغور جائزہ لے رہا ہے۔ امریکی دفتر خارجہ کے ترجمان شان میکانن کے بقول میڈیا کو عدالتی بحران کی کوریج کی آزادی ہونی چاہئے تاکہ پاکستانی عوام کو پتہ ہو کہ ان کی حکومت کیا کر رہی ہے۔ اسی طرح برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی نے پیمرا ترمیمی آرڈیننس کو اپنی ایک رپورٹ میں تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ حکمران میڈیا کو بند نہیں کرا سکیں گے۔

انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس کی جانب سے بھی پاکستانی میڈیا پر ڈالے جانے والے حکومتی دباؤ پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اسلئے حکومت کو اس بارے میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے کہ پیمرا ترمیمی آرڈیننس کے ذریعے اس کے تحفظ کی کوئی صورت نکلے گی یا اس کے استحکام کو مزید دھچکا لگے گا۔

یہ آرڈیننس بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں سے متعلق آئینی دفعات کے بھی منافی ہے اور اظہار رائے کی آزادی سے متعلق آئین کی شقوں سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ سپریم کورٹ گزشتہ روز ایک کیس کی سماعت کے دوران پہلے ہی قرار دے چکی ہے کہ ملکی استحکام و سالمیت اور جمہوریت کی بقاء کے لئے آزادی صحافت لازمی ہے۔ اگر حکومت کی جانب سے آزادی صحافت کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی جائے گی جیسا کہ بعض نجی ٹی وی چینلوں کی نشریات روکنے کے ساتھ ساتھ ایک چینل کی اطلاع کے مطابق راولپنڈی/ اسلام آباد میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے دو سو کے قریب ارکان کے خلاف فوجداری مقدمات بھی درج کئے جا چکے ہیں اور پیمرا ترمیمی آرڈیننس کی تلوار بھی لٹکا دی گئی ہے تو اس کا ردعمل بھی فطری ہوگا اور سول سوسائٹی کے تحفظ کیلئے عدلیہ، پریس اور دیگر مکاتب فکر کے لوگوں کیلئے یکجا ہو کر شہری آزادیوں کا تحفظ کرنا مجبوری بن جائے گا، جس کا اب آغاز بھی ہو چکا ہے۔

اس صورت حال میں بجائے اس کے کہ ''پوائنٹ آف نو ریٹرن'' کی نوبت آئے، حکمران طبقہ کو خود ہی حقائق کا ادراک کر لینا چاہئے اور ریاستی اداروں کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کر کے اپنے لئے مزید بگاڑ کی فضا پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر جمہوریت کا نام لے کر ملک پر ننگی آمریت اور فسطائیت مسلط کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا ردعمل بھی اتنا ہی خوفناک ہوگا اس لئے حکومت کو پیمرا ترمیمی آرڈیننس فی الفور واپس لے لینا چاہیے اور پرنٹ الیکٹرانک میڈیا کی آزادی کے تحفظ کو یقینی بنانا چاہیے ورنہ صحافی برادری کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کا کوئی بھی فرد ان ناروا پابندیوں اور ظالمانہ قوانین کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ یہ نیا محاذ کھول کر حکومت اپنے لئے خسارے کا سودا ہی کرے گی۔



چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا
ونی کیس کا ازخود نوٹس

روزنامہ خبریں میں شائع ہونے والی ونی کے بارے میں ایک خبر پر سپریم کورٹ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے ازخود نوٹس لیتے ہوئے روزنامہ خبریں کو نوٹس جاری کیا کہ وہ اپنی خبر کا ثبوت پیش کریں۔ روزنامہ خبریں نے عدالت عظمٰی کی تسلی کے مطابق ثبوت مہیا کیے۔ اس صورتحال میں فاضل عدالت عظمٰی نے ڈہرکی پولیس چیف کو معاملہ کی تفتیش کا حکم دیا۔ انہوں نے تفتیش میں روزنامہ خبریں کی خبر کو درست پایا۔ حکم عدالت ذیل میں پیش ہے۔

روزنامہ خبریں میں ایک خبر شائع ہوئی ''ڈہرکی میں 2 وڈیروں نے'' کالا'' کی دس سالہ بیٹی ونی کر دی'' بادی النظر میں یہ خبر اس جرم کی نشاندہی کرتی ہے جو پی پی سی کی دفعہ A-310 کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے لہٰذا آئی جی پولیس کو رپورٹ پیش کرنے کے لئے نوٹس جاری کر دیا گیا کیونکہ یہ فعل ایک نابالغ لڑکی کے ان بنیادی حقوق کی خلاف ورزی میں شمار ہوتا ہے جو آئین پاکستان کی شق 9 کے تحت اسے حاصل ہیں۔ آئی جی پولیس نے ڈی پی او گھوٹکی سے رپورٹ حاصل کی۔ اس رپورٹ کا متعلقہ پیراگراف کچھ اس طرح تھا۔

''ٹی پی او بارہ نے انکوائری کے بعد رپورٹ دی ہے کہ اس نے متعلقہ افراد کے بیانات لئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ نہ تو نظام دین گواہ کو کاروبنا گیا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا جرگہ منعقد ہوا تھا جیسا کہ اخبار کی خبر میں بیان کیا گیا تھا۔ اصل حقائق کچھ یوں تھے کہ علی نواز اور سردار گولو کے درمیان کسی گھریلو معاملے پر تلخی پیدا ہوئی ہے جسے ان کی برادری نے خوش اسلوبی سے ختم کرا دیا۔ اس حوالے سے انہوں نے عبدالغفار ایم آئی بھٹو اوتھ کمشنر تعلقہ ڈہرکی سندھ کے روبرو مورخہ 6-10-2006 کو حلفیہ بیان بھی دیا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اخبار میں شائع ہونے والی خبر ان کے کسی مخالف نے انہیں نقصان پہنچانے کے لیے شائع کرائی ہے۔

2- اس رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ الزام سے انکار کیا گیا تھا کیونکہ یہ خبر ملک کے ایک معروف اخبار روزنامہ ''خبریں'' میں شائع ہوئی تھی لہٰذا ڈی پی او کی رپورٹ پر یقین نہ کیا گیا اور آئی جی پولیس سندھ کو ہدایت کی گئی کہ وہ متعلقہ خبر کی دوبارہ تحقیقات کرائے۔ مزید برآں روزنامہ ''خبریں'' کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر سے کہا گیا کہ وہ اپنی خبر کا ''ذریعہ'' بتائے۔ اس نے پیش ہو کر بتایا کہ یہ خبر اشرف مغل رپورٹر ڈہرکی نے بھیجی تھی۔ جس کے مندرجات کچھ اس طرح تھے۔

3- مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں پولیس نے دوبارہ تفتیش کی جس کے نتیجے میں پتا چلا کہ خبریں میں شائع ہونے والی خبر درست تھی رپورٹ کے متعلقہ پیرے دوبارہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

2- معزز عدالت کے واضح حکم مجریہ 6-11-06 کی روشنی میں ایس ٹی پی منیر احمد لغاری ایس ایچ او ڈہرکی نے واپس آ کر معاملے کی کھلی اور خفیہ انکوائریاں کیں جن سے معلوم ہوا کہ بلا شبہ مورخہ 1-10-2006 کو غوث بخش ولد میر محمد گولو سکنہ نوکوٹ کے ہاں جرگہ منعقد ہوا تھا جس کے سرپرست دو وڈیرے گل حسن ولد غلام محمد گولو اور بھورل ولد جام خاں گولو ساکنان نوکوٹ تعلقہ ڈہرکی تھے۔ لہٰذا ایس ایچ او نے ایف آئی آر نمبری

Crime No. 195/2006 U/S 120-A, 120-B, 143,511, 310, 201 P مورخہ 11-11-06 کے ذریعے مقدمہ درج کیا اور اے پی ایس ڈہرکی تحقیقاتی ٹیم کے حوالے کر دیا۔ تحقیقاتی ٹیم نے تفصیلی تحقیق کے بعد تمام ملزمان کو گرفتار کر لیا یعنی طرفین کے تمام متعلقہ افراد، ڈیرے کے مالک، جرگہ منعقد کرنے والے دونوں وڈیروں (کل آٹھ افراد) اور انہیں عبوری چالان نمبر 145 مورخہ 26-11-06 کے تحت سول جج و جوڈیشل مجسٹریٹ ڈہرکی کی عدالت میں 27-11-06 کو پیش کر دیا۔

3- معزز عدالت کے حکم مجریہ 16-11-06 کے موصول ہونے پر جس میں مزید تفصیلی انکوائری کرانے کا حکم دیا گیا۔ زیر دستخطی نے مزید انکوائریاں کروائیں جن سے پتا چلا کہ جرگہ واقعی منعقد ہوا تھا اور سزا کے طور پر نظام دین کی بیٹی کا ہاتھ دوسرے فریق کو دے دیا گیا تھا اور نظام دین پر 30000 روپے کا جرمانہ کیا گیا تھا۔ حقائق کچھ اس طرح تھے۔

(a) کہ سال ڈیڑھ سال قبل نواب علی ولد سردار علی گوواہ سکنہ نوکوٹ تعلقہ ڈہرکی نے اپنی بیوی مسماۃ شاہری دختر مرحوم غلام حسن گولو پر نظام دین ولد علی نواز گولو کے ساتھ کاروکاری کا الزام عائد کیا اور اسے اپنے گھر سے نکال دیا جو اپنے بھائیوں کے ساتھ رہنے لگی۔

(b) دونوں پارٹیاں جرگے کے لئے اپنے سردار محمد صالح گولو آف کندکوٹ کے پاس گئیں اس نے دونوں فریقوں کو آگاہ کیا کہ کیونکہ سپریم کورٹ آف پاکستان اور ہائی کورٹ نے عورت کے اس طرح دوسرے کے ہاتھ میں دینے کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ اس نے جرگہ منعقد کرنے سے انکار کر دیا۔ محمد صالح گولو نے میرے ساتھ فون پر بھی اس بات کی تصدیق کی لیکن جب میں اس کا بیان لینے کے لئے مورخہ 2-12-2006 کو اس کے گھر گیا تو وہ غائب تھا۔ لہٰذا میں واپس آ گیا۔

(c) پھر دونوں فریقوں مقامی زمیندار سردار الحاج آغا احمد یار خاں شر کے پاس جرگے کیلئے گئیں۔ اس نے بھی سپریم کورٹ آف پاکستان اور ہائی کورٹس کے احکامات کی روشنی میں جرگہ منعقد کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں واپس بھیج دیا۔ الحاج آغا احمد یار خاں شر کا بیان ریکارڈ کیا گیا اور معزز عدالت کی معلومات اور ریکارڈ کیلئے رپورٹ کے ساتھ لف ہے اور لوگ جو اس وقت احمد یار خاں شر کے بنگلے پر موجود تھے جب دونوں پارٹیاں جرگے کیلئے اس کے پاس گئیں اور اس نے جرگہ کرنے سے انکار کر دیا یعنی مشتاق احمد ولد عبیداللہ خواجہ اور محبت علی ولد نا کر خاں شران کے بیانات بھی ریکارڈ کئے گئے اور فاضل عدالت کے ریکارڈ کے ساتھ لف ہیں۔

(d) کیونکہ ہر طرف سے فریقین کی جرگے کیلئے حوصلہ شکنی کی گئی تھی تو انہوں نے مقامی طور پر اپنے ہی گاؤں میں مقامی وڈیروں کی سرپنچی میں (جو کہ ان کے رشتہ تھے) جرگہ منعقد کر لیا۔

(e) مورخہ 1-10-2006 کو بارہ بجے غوث بخش گولو کے ڈیرے پر اس کی موجودگی میں گل حسن ولد غلام محمد گولو اور بھورل ولد جام خاں گولو ساکنان نوکوٹ تعلقہ ڈہرکی نے جرگہ منعقد کیا جس میں متعلقہ فریقوں کے 16-15 لوگوں نے شرکت کی۔ اس جرگے میں کاروکاری کے ملزم نظام دین گولو کی بیٹی جس کی عمر 4-3 سال تھی کا ہاتھ دوسرے فریق کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ 30000 روپے نقد جرمانہ کیا گیا۔ دونوں وڈیروں نے اس میں 5000 روپے کی کمی کر دی بقیہ 25000 روپے میں سے مدعا علیہ نظام دین گولو کے چچا نے مبلغ 10000 روپے موقع پر ادا کئے جبکہ بقیہ 15000 روپے اور لڑکی کا ہاتھ بعد میں دیا جانا تھا۔

(f) نہایت ادب سے گزارش ہے کہ جرگہ واقعی منعقد ہوا تھا جس میں نظام دین گولو پر لڑکی کا ہاتھ دینے کے علاوہ نقد جرمانے کی سزا عائد کی گئی۔

(g) جہاں تک متعلقہ فریقوں کا تعلق ہے تو دونوں جرگے کے انعقاد سے انکاری ہیں کیونکہ وہ دونوں آپس میں رشتہ دار ہیں حتیٰ کہ متاثرہ فریق بھی سچائی تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ متاثرہ خاتون مسماۃ شاہری دختر گل حسن گولو مرحوم زوجہ نواب علی بھی اس سلسلے میں رابطہ کیا مگر اس نے بھی اپنے خلاف کاروکاری اور جرگے کے انعقاد کے الزام کی تردید کر دی اور کہا کہ وہ تو اپنے خاوند کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہی ہے لیکن وہ اپنے خاوند کے گھر نہیں پائی گئی بلکہ اپنے بھائیوں کے پاس رہ رہی تھی۔ اگر حقیقت ہوتی تو وہ اپنے بھائیوں کے بجائے اپنے شوہر کے گھر رہ رہی ہوتی۔ اس کا بیان

بھی ریکارڈ کیا گیا جو فاضل عدالت کے ریکارڈ کے ساتھ لف ہے۔

(h) سب سے پہلے یہ حقائق سائیں داد ولد گل محمد گولو سکنہ نوکوٹ تعلقہ ڈہرکی نے اخباری نمائندے کے گوش گزار کئے ۔ اسکا بیان بھی لیا گیا اس نے گواہی دی کہ جرگہ منعقد ہوا تھا اور یہ کہ اسی نے یہ خبر اخباری نمائندے کو دی تھی ۔ اسکا بیان بھی فاضل عدالت کے ریکارڈ کے ساتھ لف ہے ۔

(i) اخباری نمائندے محمد اشرف ولد محمد صدیق مغل سکنہ ڈہرکی کا بیان بھی لیا گیا۔ اس نے بھی سائیں داد گولو کے موقف کی تائید کی ۔ لیا گیا بیان فاضل عدالت کے ریکارڈ کے ساتھ لف ہے۔

(j) جہاں تک گاؤں کے مکینوں اور دیگر رشتہ داروں کا تعلق ہے وہ متعلقہ فریقوں کے ساتھ ممکنہ دشمنی کے خوف سے کوئی بات بتانے یا انکشاف کرنے سے گریزاں ہیں۔

(k) تمام متعلقہ افراد کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا ہے اور انہیں عبوری چالان نمبر 145 مورخہ 2006-11-26 کے تحت سول اینڈ جوڈیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

(l) بیان کردہ حقائق میری معلومات کے مطابق صحیح اور درست ہیں ۔

4- مذکورہ بالا رپورٹ میں لگائے گئے ''ونی'' کے الزامات درست ہیں اور بذریعہ ایف آئی آر نمبری 95 آف 2006 پولیس سٹیشن ڈہرکی مقدمہ درج کر لیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں آٹھ افراد مسان گل حسن، غوث محمد ولد میر پور، بھورل ولد جام خان، علی نواز ولد گلو، نظام دین ولد گلو، غلام اکبر ولد گلو، نواب ولد سردار علی اور سردار کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور چالان عدالت کے روبرو پیش کر دیا گیا ہے۔ ان حقائق سے صوبہ سندھ کی پولیس کی درج ذیل خامیاں سامنے آئیں۔

(i) IGP/PPO کو مناسب تفتیش کے بغیر اس رپورٹ کو 2006-11-1 کو Endorse نہیں کرنا چاہیے تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ رپورٹ سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہونے جارہی ہے ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس امر کو یقینی بناتے کہ فاضل عدالت کو غلط معلومات نہ فراہم ہو جائیں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ذاتی دلچسپی کے بغیر ڈہرکی کے TPO سے یہ رپورٹ منگوالی۔

(ii) ڈی پی او جو ایک ذمہ دار پولیس آفیسر ہے بھی فاضل عدالت کو غلط معلومات فراہم کرنے اور اپنے ماتحت کی بھیجی ہوئی رپورٹ کی توثیق کرنے کا برابر کا ذمہ دار ہے جو بعد میں جھوٹی ثابت ہوئی اور اگر اس رپورٹ کو قبول کر لیا جاتا تو یہ جرم نوٹس میں آئے بغیر رہ جاتا جو معاشرے کے خلاف جرم ہے اور پی پی سی کی دفعہ 310-A کے تحت قابل سزا ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ایس ایچ او منیر احمد لغاری بھی برابر کا ذمہ دار ہے۔ تاہم سارا کریڈٹ روزنامہ ''خبریں'' کو جاتا ہے جس نے مذکورہ بالا خبر کو سچ ثابت کیا۔ روزنامہ خبریں کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ مذکورہ اخبار معاشرے میں ہونے والے جرائم کی نشاندی یونہی کرتا رہے گا۔ ٹی پی او علی حیدر حاضر ہے اور بیان دیا ہے کہ اس نے پہلی رپورٹ کی تصدیق کی تھی لیکن 2006-11-6 کو عدالت کے واضح حکم کی روشنی میں اس نے ذاتی طور پر اس سارے معاملے کی دوبارہ تفتیش کی اور اسے اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کا علم ہوا۔

5- آئی جی سندھ ڈی پی او گھوٹکی اور ایس ایچ او تھانہ ڈہرکی کو نوٹس جاری کئے جائیں کہ وہ وضاحت کریں کہ ان کے خلاف قانونی مضمرات جانے بغیر سپریم کورٹ آف پاکستان کے روبرو جھوٹی رپورٹ پیش کرنے پر کیوں نہ کارروائی کی جائے۔ نوٹس کے ہمراہ اس حکم کی کاپی بھی انہیں بھیجی جائے۔ کیس 10 جنوری 2007ء تک ملتوی کر دیا گیا اور اسے ونی پر زیر التوا کیس کے ہمراہ پیش کیا جائے۔ متعلقہ کیس میں پیش ہونے والے فاضل وکیل اور ایڈووکیٹ جنرل سندھ کو بھی نوٹس جاری کیا جائے۔



عدلیہ کے ساتھ کس دور میں کیا ہوا؟

مختلف ادوار میں اعلیٰ عدلیہ میں اہم تبدیلیاں ہوتی رہیں اس ضمن میں ایک مختصر سا خاکہ اس طرح ہے،

سانگھڑ کے سول جج اویس مرتضیٰ کو سابق وزیر اعظم بھٹو کی ہدایت پر گرفتار کر کے گھر پر نظر بند کر دیا گیا۔ حروں کی ضمانت لینے پر سابق وزیر اعظم مجھ سے ناراض تھے۔ اس موقع پر حکومت نے کہا کہ انہوں نے جج کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ چیف کورٹ سندھ میں ایک بڑا سیاسی مقدمہ سپیکر قومی اسمبلی مولوی تمیز الدین نے پیش کیا۔ بنچ کے سربراہ جسٹس کانسٹن ٹائن تھے جبکہ جسٹس (ر) بچل، جسٹس (ر) محمد میمن اور جسٹس (ر) ویلانی بنچ کے ارکان میں شامل تھے۔ انہوں نے اسمبلی توڑنے کے متعلق صدارتی حکم کالعدم قرار دیا گیا اس وقت کی حکومت نے اسے فیڈرل کورٹ میں چیلنج کر دیا، اپریل 1955ء میں فیڈرل کورٹ نے سندھ کی چیف کورٹ کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا۔ اس بنچ کے سربراہ جسٹس منیر تھے جبکہ دیگر ارکان میں جسٹس (ر) ایس اے ایم اکرم، جسٹس (ر) اے آر کارنیلیس، جسٹس (ر) ایس اے رحمٰن اور جسٹس (ر) محمد شریف شامل تھے۔ جسٹس (ر) اے آر کارنیلیس نے اختلافی نوٹ لکھا، انہوں نے دیگر رفقاء کار سے اختلاف کیا۔ یہ فیصلہ آج بھی مختلف انداز میں زیر بحث ہے۔ اس فیصلے میں نظریہ ضرورت کی بنیاد پر اسمبلی برطرف کرنے کو درست قرار دیا گیا۔ سابق جسٹس (ر) رستم کیانی نے 1958ء میں مارشل لاء کے نفاذ پر تنقید کی جس پر انہیں 1962ء میں عدلیہ سے ریٹائر کر دیا گیا۔ سابق مشرقی پاکستان میں جنرل (ر) ٹکا خان گورنر کا حلف اٹھانے گئے تو ڈھاکہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ جسٹس (ر) ایم ارشد کے خلاف حکومت کارروائی کرنا چاہتی تھی۔ عاصمہ جیلانی کیس میں بھی عدالت عظمیٰ نے حکومت کے خلاف فیصلہ دیا، یہ فیصلہ حکومت کے خاتمے کے بعد سنایا گیا۔ لہٰذا اس کے سیاسی ثمرات مرتب نہ ہو سکے۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد عبوری آئین کے ذریعے متعدد ججوں کو گھر بھیج دیا گیا۔ کچھ ججوں کو حلف اٹھانے کے لئے بلایا ہی نہیں گیا، جبکہ کچھ ججوں نے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ چیف جسٹس یعقوب علی خان کو حلف لینے کی دعوت ہی نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مارشل لاء کے نفاذ کے حق میں نہیں تھے۔ انہیں 23 ستمبر 1977ء کو سبکدوش کر دیا گیا۔ ان کی جگہ جسٹس (ر) انوار الحق چیف جسٹس بن گئے۔ نصرت بھٹو کیس میں انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کو جائز قرار دے دیا۔ انہوں نے مارشل لاء کے نفاذ کو درست قرار دے کر حکومت کو وعدے کے مطابق 90 دن میں انتخاب کروانے اور آئین کو بحال کرنے کی ہدایت کی تھی۔ انہوں نے مارشل لاء کے نفاذ کو تسلیم تو کر لیا تھا مگر اسے مقررہ مدت میں انتخابات سے مشروط کر دیا تھا۔ جسٹس دراب پٹیل اور جسٹس فخر الدین جی ابراہیم بھی مارشل لاء کے نفاذ سے متفق نہیں تھے۔ انہوں نے عبوری آئین کے تحت حلف اٹھانے سے گریز کیا۔ اس طرح عبوری آئین جنرل ضیاء اور نواز شریف حکومت کے خاتمے کے بعد 2000ء میں اہم ججوں کی عدلیہ سے علیحدگی کا سبب بن گیا۔ کچھ خود الگ ہو گئے اور کچھ کو حلف کیلئے بلایا ہی نہیں گیا۔ جنرل (ر) ضیاء الحق کے دور میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف فیصلہ سنانے والے بنچ کے سربراہ مولوی مشتاق حسین بھی عدالت عالیہ سے الگ ہو گئے۔

1993ء میں بے نظیر بھٹو نے جسٹس (ر) سجاد علی شاہ کو چیف جسٹس بنا دیا۔ جبکہ جسٹس (ر) اجمل میاں سینئر موسٹ تھے۔ بعد ازاں وہ دباؤ میں نہیں آئے جس پر ان کے داماد کے گھر پر چھاپہ مارنے کی کوشش بھی کی گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک اجلاس میں انہیں عدلیہ سے الگ کرنے کیلئے مختلف تجاویز پر غور کیا گیا اس دوران ایک سابق وفاقی وزیر نے رائے دی کہ انہیں بیرون ملک سے دعوت نامہ بھجوا دیا جائے تاکہ ان کی عدم موجودگی میں کارروائی کر لی جائے۔ تاہم سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے ان تجاویز سے اتفاق نہیں کیا۔

جنرل پرویز مشرف نے بھی ججوں کو عبوری آئین کے تحت دوبارہ حلف لینے کی دعوت دی۔ سعید الزمان صدیقی جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن، جسٹس (ر) اسلم ناصر زاہد، جسٹس (ر) وجیہہ الدین، جسٹس مامون قاضی اور جسٹس (ر) صفدر علی شاہ نے حلف اٹھانے سے انکار کیا جس پر انہیں ریٹائر کر دیا گیا۔ چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی کا موقف تھا کہ آئین منسوخ نہیں ہوا، لہٰذا دوبارہ حلف اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ انہیں حلف لینے کیلئے بلایا ہی نہیں گیا۔

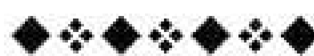
1992ء میں سندھ آپریشن کے خلاف فیصلہ دینے پر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج شبیر احمد کے چیمبر پر چھاپہ مارا گیا۔ سرکاری اعلامیے میں بتایا گیا کہ وہ بھارت کے شہری ہیں۔ اپنے فیصلے میں انہوں نے ہدایت کی تھی کہ آپریشن میں قانون سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اور شہریوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ انتظامیہ کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی۔ جس پر یہ کارروائی کی گئی۔ جسٹس (ر) راشد عزیز نے بھی بے نظیر بھٹو کے خلاف ایک ریفرنس کیس کے بعد استعفیٰ دے دیا تھا۔

نواز شریف کے دور حکومت میں جسٹس سجاد علی شاہ اور حکومت کے مابین بعض آئینی نکات پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ جس کے بعد ہر روز نئی خبر سننے کو ملتی تھی۔ سپریم کورٹ نے جسٹس سجاد علی شاہ کی سربراہی میں ایک بنچ نے آٹھویں آئینی ترمیم معطل کر دی۔ دس رکنی بنچ نے چیف جسٹس (ر) سجاد علی شاہ کا فیصلہ معطل کر دیا۔ جسٹس (ر) اجمل میاں نے چیف جسٹس کے اختیارات سنبھال لیے۔ 26 نومبر کو کوئٹہ بنچ نے سجاد علی شاہ کی تقرری منسوخ کر دی۔ جس کے بعد جسٹس (ر) اجمل میاں کو چیف جسٹس سپریم کورٹ بنا دیا گیا۔

بے نظیر بھٹو دور میں ہی عدالت عالیہ نے ایک فیصلہ دیا کہ مارشل لاء دور میں کیے گئے اقدامات پر عدالتیں نظر ثانی کر سکتی ہیں، اس وقت بعض لوگوں نے عدالت عالیہ میں ایڈہاک ججوں کی تقرری کے بارے میں آراء دینی شروع کر دیں۔ اس بحران پر بڑی مشکل سے قابو پایا گیا۔ اس موقع پر وہاب الخیری نے بے نظیر بھٹو دور میں ایڈہاک ججوں کی تقرری کا معاملہ سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا، جو ججز کیس کے نام سے مشہور ہوا، اس رٹ کی سماعت جسٹس (ر) سجاد علی شاہ کی سربراہی میں ایک فل بنچ نے کی، اپنے فیصلے میں اس بنچ نے ان تقرریوں کو غیر قانونی قرار دے دیا جس کے بعد عدالتی فیصلے کی روشنی میں سابق صدر فاروق لغاری کے حکم پر تمام ایڈہاک ججوں کی تقرری ختم کر دی گئی۔

جوڈیشل کونسل میں اب تک چار ججوں کے خلاف ریفرنس دیئے گئے ہیں آخری ریفرنس 1971ء میں دائر کیا گیا ان میں سے صرف سابق جسٹس شیخ شوکت علی نے ریفرنس کا سامنا کیا۔ پہلا ریفرنس سابق جسٹس صفدر شاہ کے خلاف دائر کیا گیا۔ وہ افغانستان کے راستے برطانیہ چلے گئے اور پھر منظر عام پر نہیں آئے۔ انہوں نے ریفرنس کا سامنا نہیں کیا۔ سابق جسٹس اخلاق حسین اور جسٹس فضل غنی نے ریفرنس کی سماعت سے قبل استعفے دے دیئے تھے۔ اب پانچواں ریفرنس غیر فعال چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف لگایا گیا ہے جسکی سماعت سپریم جوڈیشل کونسل کر رہی ہے۔

غیر فعال چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے 1974ء میں وکالت کا آغاز کیا۔ 1976ء میں انہوں نے ہائی کورٹ میں اور 1976ء میں سپریم کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ 1989ء میں انہیں ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان مقرر کر دیا گیا۔ 6 نومبر 1990ء کو وہ اسی عدالت عالیہ کے ایڈیشنل جج بنا دیئے گئے۔ انہیں 1992ء اور پھر 1998ء میں بلوچستان لوکل کونسل اراکین اتھارٹی کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا۔ 22 اپریل 1999ء بلوچستان ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا گیا۔ 4 فروری 2000 کو سپریم کورٹ کے جج اور 30 جون 2005ء کو چیف جسٹس بنا دیئے گئے۔ وہ بلوچستان کے صوبائی ریویو بورڈ کے صدر اور دو مرتبہ ہلال احمر سوسائٹی بلوچستان کے چیئرمین بھی بنے۔ انہوں نے بنکنگ جج، فوری انصاف کی خصوصی عدالت کے جج اور سسٹم اپیلٹ کورٹ کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیں۔



چیف جسٹس سجاد علی شاہ سے
چیف جسٹس افتخار محمد چودھری تک

چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کے خلاف ریفرنس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس سے قطع نظر، یہ کہنا مناسب ہے کہ پاکستان کی عدلیہ، فعالیت کے ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے انداز فکر و عمل نے عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان تعلقات کو ایک ایسا رخ دے دیا ہے جس میں بلاشبہ ایک نیا پن ہے۔ جرنیلی سڑک پر 'کاروان عدل' کا سفر ایک عرصے تک یاد رکھا جائیگا۔

20 مارچ 1996ء کا دن، پاکستان کی عدلیہ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، جب عدالت عظمیٰ نے راولپنڈی کے معروف وکیل حبیب وہاب الخیری کی آئینی درخواست پر یہ اصول حتمی طور پر طے کر دیا کہ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس، ہائی کورٹ کا سینئر ترین جج ہی ہوگا، اور حکومت، جج صاحبان کی تعیناتی کے معاملے میں چیف جسٹس کے مشورے پر عمل درآمد کی پابند ہوگی، ماسوا اس کے حکومت کے پاس عدم تعمیل کا قانونی جواز موجود ہو۔ یاد رہے کہ مذکورہ آئینی درخواست 23 اپریل 1994ء کو دائر کی گئی، جب چیف جسٹس نسیم حسن شاہ کی ریٹائرمنٹ کے بعد سپریم کورٹ کے سینئر ترین جج جسٹس جناب سعد سعود جان کو قائم مقام چیف جسٹس مقرر کیا گیا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ انہی کو بعد ازاں مستقل کر دیا جائے گا۔ بہ قول حبیب وہاب الخیری کے حیرت انگیز طور پر، ابتداء اس آئینی درخواست کو رجسٹرار سپریم کورٹ نے وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ رجسٹرار کا کہنا تھا، قائم مقام چیف جسٹس (سعد سعود جان) ہی نے اس کی ممانعت کی ہے۔ 27 اپریل 1994ء کو رجسٹرار سپریم کورٹ کے حکم نامے کے خلاف اپیل داخل کی گئی، جس پر 2 مئی 1994ء کو جسٹس سعید الزمان صدیقی نے رجسٹرار کا حکم منسوخ کرتے ہوئے آئینی درخواست کو باضابطہ رجسٹر کرنے کی ہدایت جاری کر دی۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ایک مدت تک، باقاعدہ سماعت کی نوبت نہ آسکی، اور اسی عرصے میں بے نظیر بھٹو حکومت نے جسٹس سجاد علی شاہ کا تقرر بہ طور مستقل چیف جسٹس آف پاکستان کر دیا۔ جناب رفیق احمد تارڑ، جو انہی دنوں سپریم کورٹ کے جج تھے ان کا کہنا ہے ''جسٹس سعد سعود جان سپریم کورٹ کے سینئر ترین جج تھے۔ ان سے اگلا نمبر جسٹس عبدالقدیر چودھری کا تھا، جو تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ریٹائر ہو رہے تھے۔ ان کے بعد جسٹس اجمل میاں تھے، مگر ان تینوں جج صاحبان کو 'بائے پاس' کر کے جسٹس سجاد علی شاہ کو چیف جسٹس آف سپریم کورٹ مقرر کر دیا گیا۔'' یہ درست ہے مگر یہ امر بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ جسٹس سجاد علی شاہ کے بہ طور چیف جسٹس تقرر پر ان تینوں جج صاحبان میں کسی ایک نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ یوں بھی ججز کیس کے فیصلے سے پہلے یہ ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جسٹس جناب سعد سعود جان اور جسٹس جناب عبدالقدیر خان دونوں اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد، خاموشی سے ریٹائر ہو گئے۔ 20 مارچ 1996ء کو جب عدالت عظمیٰ کا تاریخ ساز فیصلہ سامنے آیا تو اس وقت تک ایک جسٹس جناب اجمل میاں ہی جسٹس سجاد علی شاہ سے سینئر جج باقی رہ گئے تھے، اور خود بہ طور چیف جسٹس ان کی ریٹائرمنٹ کچھ زیادہ نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے 20 مارچ 1996ء کے عدالتی فیصلے میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے تقرر کا معاملہ زیر بحث نہیں آیا تھا۔ بہ قول ایس ایم ظفر کے، اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ اس سے خود چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ مگر یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ خود حبیب وہاب الخیری اعتراف کرتے ہیں کہ یہ استدعا ان کی تھی ہی نہیں۔ ہاں، البتہ اگر ان کی آئینی درخواست کی بروقت سماعت ہو جاتی تو ایک بار سینیارٹی کا اصول طے پا جانے کے بعد یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔ جسٹس سجاد علی شاہ نے غالباً اس لیے بھی جزئیات میں

جانے سے اجتناب کیا کہ یوں ان کی بنچ میں موجودگی بجائے خود متنازعہ ہو جاتی، اور ان کی عدم شمولیت سے شاید مذکورہ بنچ کے لیے اس فیصلہ تک پہنچنا آسان نہ ہوتا۔ پھر انہی دنوں پشاور ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کے خلاف اس حوالے سے ایک رٹ بھی زیر سماعت تھی۔ گویا، چیف جسٹس سجاد علی شاہ کی نیت پر شک کرنے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایس ایم ظفر ان دنوں حکومت پارٹی کے سینیٹر تھے اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے روبہ رو زیر سماعت ایک مقدمے میں وزیر اعظم نواز شریف کے وکیل بھی تھے، لہٰذا ممکن ہے ان کی رائے میں اپنے موکل کی کچھ ہم دردی بھی کارفرما ہو۔

یہ کہنا مناسب ہے کہ پاکستان کی عدالتی تاریخ میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ کا یہ فیصلہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ پاکستان کی عدلیہ کو صحیح معنوں میں ریلیف جسٹس سجاد علی شاہ کے اسی فیصلے سے میسر آیا ہے۔ جسٹس سجاد علی شاہ نے ضمناً یہ ریمارکس دے کر کہ سینیارٹی کے اس اصول کو سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کے تقرر کے معاملے میں بھی اپنایا جا سکتا ہے ایک طرح سے یہ اشارہ دے دیا تھا کہ اصولاً وہ اپنے آپ کو اس فیصلے سے مستثنیٰ نہیں سمجھتے ہیں اور فی الوقت اگر انہوں نے اس فیصلے کا اطلاق اپنے اوپر نہیں کیا ہے تو ان میں ان کے پیش نظر عدلیہ ہی کا مفاد ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنے کی گنجائش بہر حال باقی رہتی ہے کہ اگر جسٹس سجاد علی شاہ ججز کیس کے فیصلے کی روشنی میں اپنے تئیں بھی کسی فیصلے تک پہنچ جاتے تو شاید (یعنی یقینی طور پر نہیں) اس ناخوشگوار صورت حال سے بچا جا سکتا تھا، جو بعد کو پیدا ہوئی، یا پیدا کر دی گئی، اور جس میں ان کے دامن پر ایسے چھینٹے اڑائے گئے کہ خدا کی پناہ۔ ان دنوں، چیف جسٹس سجاد علی شاہ لازماً سوچتے ہوں گے کہ ایسا میں نے کیا غلط کہہ دیا ہے کہ اس طرح میرا گھیراؤ کر لیا گیا ہے۔

نواز شریف حکومت اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے درمیان اختلاف کا نقطہ آغاز ظاہری طور پر وہ واقعہ بنا، جب وزیر اعظم نے فیصل آباد میں ''کھلی کچہری میں عوامی سماعت'' کے دوران ایک محکمے کے دو اہل کاروں کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے سرعام ہتھکڑیاں لگوا دیں اور انہیں اسی حالت میں فوری طور پر جیل بھجوا دیا۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے اس واقعے کا ازخود نوٹس لیتے ہوئے ان اہل کاروں کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ ان کا کہنا تھا، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے وزیر اعظم نواز شریف کو ان کے مشیروں نے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی احساس دلا دیا کہ چیف جسٹس کے اس اقدام سے ان کی سبکی ہوئی ہے۔ بعد کو، غالباً اسی تجربے کے پیش نظر، نواز شریف حکومت نے جولائی ۱۹۹۷ء میں فرقہ واریت میں ملوث ملزمان پر خصوصی عدالتوں میں مقدمات چلانے کے لیے ''انسداد دہشت گردی کا بل'' پارلیمنٹ میں پیش کر دیا۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے اس پر شدید ردعمل ظاہر کیا، اور حکومت کو ہدایت کی کہ متوازی عدالتی نظام قائم کرنے کی بجائے وہ زیریں اور اعلیٰ عدالتوں میں جج صاحبان کی تعداد میں اضافہ کرے۔ زیریں عدالتوں سے کہا جائے گا کہ وہ فرقہ واریت کے مقدمات کو ترجیحی بنیادوں پر نمٹائیں۔ حکومت نے چیف جسٹس کی ہدایت کو درخور اعتنا نہ سمجھا، اور اگست ۱۹۹۷ء میں خصوصی عدالتوں کے قیام کا بل پارلیمنٹ میں پیش کر دیا۔ کہنے والے کہتے ہیں، اس بل میں پولیس کو وسیع اختیارات دے کر عملی طور پر پولیس مقابلوں کو لیگل کور فراہم کر دیا گیا۔ حکومت اور عدلیہ کے مابین یہ معاملہ ابھی حل طلب تھا کہ سپریم کورٹ کے ججوں کی تعیناتی کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے حکومت کو، سپریم کورٹ میں تعیناتی کے لیے ہائی کورٹ کے پانچ ججوں کی فہرست فراہم کی اور ان کی خدمات سپریم کورٹ کے سپرد کرنے کی ہدایت کی۔ حکومت نے نہ تو سپریم کورٹ کی ہدایت پر عمل کیا اور نہ کسی نام پر اعتراض کیا، جو ججز کیس کے فیصلے کی رو عدم تعمیل کی حالت میں لازمی تھا۔ اس کے برعکس حکومت نے چیف جسٹس کی سفارشات کو غیر موثر کرنے کے لیے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے سپریم کورٹ کے جج صاحبان کی تعداد ۱۷ سے کم کر کے ۱۲ مقرر کر دی۔ (تاہم بعد ازاں حکومت کو یہ نوٹیفکیشن واپس لینا پڑا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے)

چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے زچ ہو کر صدر پاکستان کو اس کی نسبت ایک خط لکھ دیا۔ اسی اثناء میں سپریم کورٹ کے چھ جج صاحبان نے اعلانیہ یہ موقف اختیار کر لیا کہ چیف جسٹس آف پاکستان نے پانچ ججوں کی فہرست حکومت کو بھجوانے سے پہلے ان سے مشورہ نہیں کیا۔ سننے میں یہ بھی آ رہا کہ حکومت چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲۰۹ کے ماتحت سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر کرنے کا منصوبہ بھی بنا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے چیف جسٹس کے خلاف حکومت کا یہ منصوبہ ایوان صدر کی مداخلت سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ ادھر سپریم کورٹ نے ایک

آئینی درخواست پر فیصلہ کرتے ہوئے آئین کی ۱۴ ترمیم کو آئینی روح کے خلاف قرار دے کے کالعدم قرار دے دیا اور وزیر اعظم کے ریمارکس پر ان کو توہین عدالت کا نوٹس جاری کر دیا۔ معلوم ہوتا تھا حکومت اپنی ہٹ دھرمی کے باعث دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔ پس حکومت نے عافیت اسی میں سمجھی کہ چیف جسٹس کی ہدایت کے بموجب چیف جسٹس کی طرف سے موصول ہونے والی فہرست کے مطابق ہائی کورٹ کے پانچ جج صاحبان سپریم کورٹ بھجوانے کا نوٹیفیکیشن جاری کر دے۔ مگر حکومت اور چیف جسٹس کے درمیان جو بدمزگی پیدا ہو چکی تھی، اس کے ختم ہونے کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

وزیر اعظم نواز شریف کو توہین عدالت کے جرم میں پیش ہونے کا حکم صادر کرتے وقت چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے معاملے کے سیاسی پہلو کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر دیا۔ وزیر اعظم کسی ملک کا انتظامی سربراہ ہی نہیں، ایک عوامی رہنما بھی ہوتا ہے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ وزیر اعظم اپنے حامیوں کے جلو میں سپریم کورٹ پہنچے اور گول مول انداز میں یہ کہہ کے جان چھڑانے کی کوشش کی کہ ان کا عدلیہ کی توہین کا ارادہ نہیں تھا، اس کے باوجود اگر عدالت نے توہین محسوس کی ہے تو انہیں اس کا افسوس ہے۔ صاف ظاہر تھا، حکومت اور چیف جسٹس کے مابین معاملات بتدریج سیاسی رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے صدر پاکستان کو خط لکھا اور ان سے درخواست کی کہ ان کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظامات کیے جائیں۔ صدر نے چیف جسٹس کا خط "کانفیڈنشل، پرسنل اور فوری" لکھ کر ملٹری سیکرٹری کے ذریعے وزیر اعظم کو بھجوا دیا۔

اس اثناء میں وزیر اعظم کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی جاری تھی، چیف جسٹس آف پاکستان کو اپنے ہی دو ساتھی جج صاحبان کی جانب سے ایک ایسے "فوری فیصلے" کا سامنا کرنا پڑا، جس کی عدالتی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ہے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۹۷ء کو سپریم کورٹ کے کوئٹہ بنچ کے دو جج صاحبان جسٹس جناب ارشاد حسن خان اور جسٹس جناب خلیل الرحمان خان نے ملک اسد علی خان نامی ایک آدمی کی استدعا پر حکومت سے نبرد آزما چیف جسٹس آف پاکستان کو تا حکم ثانی عدالتی اور انتظامی امور نمٹانے سے روک دیا، دوسرے لفظوں میں "معطل" کر دیا۔ یاد رہے کہ کوئٹہ بنچ تین جج صاحبان پر مشتمل تھا، جسٹس ارشاد حسن خان، جسٹس خلیل الرحمان خان، جسٹس ناصر اسلم زاہد۔ (آخر الذکر سماعت میں شریک نہیں ہوئے۔) جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، پاکستان کی عدالتی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا واحد فیصلہ ہے کہ سپریم کورٹ کے ۱۷ میں سے ۲ جج صاحبان نے اپنے ایک عدالتی حکم کے ذریعے فوری سماعت کرتے ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان کو "پابند" کر دیا ہو اور صدر کی جانب سے فوری طور پر نیا چیف جسٹس مقرر نہ ہونے کی صورت میں، حکومت کو "قائم مقام چیف جسٹس آف پاکستان" دلوانے کی ہدایت جاری کی ہو۔ حیرت انگیز طور پر حکومت نے کوئٹہ بنچ کی ہدایت کی روشنی میں فوراً سمری تیار کر کے ایوان صدر بھجوا دی۔ مگر اس سے پہلے کہ ایوان صدر کی جانب سے حکومت سمری پر مہر تصدیق ثبت ہوتی، سپریم کورٹ کے ۵ رکنی بنچ نے چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف کوئٹہ بنچ کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ کے بنچ کا کہنا تھا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف اس نوعیت کی درخواست صرف سپریم کورٹ کی پرنسپل سیٹ پر دائر کی جا سکتی ہے۔ سپریم کورٹ نے کوئٹہ بنچ کو تا حکم ثانی کام کرنے سے روک دیا۔ اگلے روز سپریم کورٹ کے پشاور بنچ کے جج صاحبان جسٹس سعید الزمان صدیقی اور جسٹس فضل الٰہی خان نے مقامی حکومتی رہنما اخونزادہ بہرہ سعید ایڈووکیٹ کی ایک درخواست پر چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف کوئٹہ کے دو رکنی بنچ کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ پشاور بنچ تین جج صاحبان پر مشتمل تھا، جسٹس سعید الزمان صدیقی، جسٹس فضل الٰہی خان اور جسٹس مختار علی جونیجو۔ (آخر الذکر سماعت میں شریک نہیں ہوئے۔) اخباری اطلاعات کے مطابق، اخونزادہ کی درخواست ۱۱ بجے دائر ہوئی، سوا گیارہ بجے باقاعدہ سماعت شروع ہو گئی، سوا بارہ بجے چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف زبانی فیصلہ سنایا گیا اور ڈھائی بجے اسے تحریری طور پر جاری کر دیا گیا، اسے کہتے ہیں سستا اور فوری انصاف۔ پہلے کی طرح، سپریم کورٹ کی پرنسپل سیٹ نے پشاور بنچ کا فیصلہ بھی اس بناء پر کالعدم قرار دیا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف اس نوعیت کی درخواست صرف پرنسپل سیٹ پر دائر کی جا سکتی ہے۔ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف کراچی اور لاہور بنچ میں بھی اس نوعیت کی درخواستیں دائر کر کے فیصلہ لینے کی کوشش کی گئی، مگر بہ وجوہ یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

یہ بات اہم ہے، پشاور اور کوئٹہ بنچوں نے سپریم کورٹ کی بنچ کا "جوابی فیصلہ" ماننے سے انکار کر دیا، اور اگلے روز حسب معمول اپنا عدالتی کام

جاری رکھا۔ ادھر چیف جسٹس آف پاکستان، جسٹس سجاد علی شاہ کو وزیراعظم نواز شریف اور ان کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی اس وقت مجبوراً ملتوی کرنا پڑی، جب وزیراعظم کے حامی سپریم کورٹ کی عمارت پر چڑھ دوڑے۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے اس صورت حال میں صدر کو ایک اور خط لکھا اور ان سے کہا کہ جسٹس ارشاد حسن خان، جسٹس خلیل الرحمان خان اور جسٹس سعید الزماں صدیقی کے خلاف ریفرنس سپریم جوڈیشل کونسل میں بھجوانے کے لیے اقدامات کئے جائیں۔ جسٹس اجمل میاں کی جانب سے اظہار معذوری کے بعد، پشاور بنچ کے جسٹس سعید الزماں صدیقی نے از خود عملی طور ''چیف جسٹس آف پاکستان'' کے اختیارات سنبھال کر کے ''چیف جسٹس آف پاکستان'' سجاد علی شاہ کے خلاف آئینی درخواست کی سماعت کے لیے ''فل کورٹ'' بنا دیا، جس نے چیف جسٹس کے خلاف کوئٹہ بنچ کے فیصلے کی توثیق کر کے جسٹس اجمل میاں کو سپریم کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ جسٹس سعید الزماں صدیقی نے ان سے حلف لیا۔ اس پر چیف جسٹس سجاد علی شاہ احتجاجاً ۳ دسمبر سے ۲۳ دسمبر ۱۹۹۷ء تک رخصت پر چلے گئے۔ ۲۴ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۷ء تک سرکاری چھٹیاں تھیں۔ ۱۶ مارچ ۱۹۹۸ء کو ان کی ریٹائرمنٹ ہونا تھی۔ گویا، اگر چیف جسٹس آف پاکستان کو ان کے ساتھی بہ دستور کام کرنے دیتے، جب بھی ڈھائی ماہ بعد وہ ریٹائر ہو رہے تھے، اور ان کے بعد سپریم کورٹ کے سینئر ترین جج کے طور پر جسٹس اجمل میاں ہی کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بننا تھا۔

اور پھر چیف جسٹس آف پاکستان کے ''آن لیو'' ہونے کے عرصے ہی میں ان کا مقدمہ سنا گیا۔ چیف جسٹس آف پاکستان کو عضو معطل بنا دیے جانے کے باوجود ٹیپ کے مصرعے کی طرح گاہ گاہ یہ سننے میں آتا رہا (آج کل کی طرح) کہ جسٹس سجاد علی شاہ ہی چیف جسٹس آف پاکستان ہیں، البتہ مخصوص حالات میں ان کو کام سے روک دیا گیا ہے۔ سپریم کورٹ کا فل کورٹ ۱۷ جج صاحبان کی شمولیت سے مکمل ہوتا تھا۔ مگر جسٹس سجاد علی شاہ کو اس لیے شامل نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کیس انہی سے متعلق تھا، اور جسٹس اجمل میاں کو اس لیے شریک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے خلاف فیصلہ آنے کی صورت میں انہی کو چیف جسٹس بننا تھا۔ اس طرح باقی ۱۵ جج صاحبان رہ جاتے تھے۔ پندرہ میں سے پانچ جج صاحبان نے چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف اس ''عدالتی کارروائی'' میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ گویا فل کورٹ (۱۷ میں سے ۱۰ جج صاحبان پر مشتمل تھا) جن میں سے ۶ جج صاحبان کوئٹہ اور پشاور بنچوں کے تھے۔ یوں ۲۳ دسمبر ۱۹۹۷ء کو ''۱۰ رکنی فل کورٹ'' نے متفقہ طور پر سجاد علی شاہ چیف جسٹس آف پاکستان کو عہدے سے ہٹا دیا اور حکومت کو ان کی جگہ جسٹس اجمل میاں کو مستقل چیف جسٹس مقرر کرنے کی سفارش کر دی۔ حکومت نے سمری پر قائم مقام صدر مملکت وسیم سجاد نے بغیر کسی حیل و حجت کے دستخط کر دیے اور اسی روز سہ پہر کو ایوان صدر میں ان سے حلف لے لیا۔ یہ امر معنی خیز تھا کہ چیف جسٹس کو ان کے ذمے داریوں سے سبک دوش کرنے کے فیصلے میں وہ جج صاحبان بھی شامل تھے جن سے خود چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے حلف لیا تھا۔

یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ عدلیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے، چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے انتظامیہ کے مقابل جو دم خم دکھایا، یہ ایک طرح سے آنے والے دنوں کی طرف ایک اشارہ تھا کہ انتظامیہ کے لیے اب عدلیہ کو پہلے کی طرح پابند رکھنا مشکل ہے۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے نعرۂ مستانہ ہی کا یہ اعجاز ہے کہ آج عدالتی فعالیت کے اگلے مرحلے میں چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری نے انتظامیہ کی مداخلت سے مکمل آزاد عدلیہ کی منزل کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔

تیز ترک گام زن ، منزل ما دور نیست



لاہور ہائی کورٹ بار سے چیف جسٹس کا خطاب

اور والہانہ استقبال

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے کہا ہے کہ آمرانہ نظام حکومت کا تصور اب ختم ہو چکا ہے۔ جو قومیں تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتیں وہ تباہ ہو جاتی ہیں انتظامیہ بنیادی حقوق کے خلاف قانون سازی نہیں کر سکتی کیونکہ بنیادی حقوق اور آزادی لازم و ملزوم ہیں، ہمارے بعض فیصلے ہمیں آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔ عدلیہ انسانی حقوق اور آئین کے مخالف قانون سازی کو کالعدم قرار دینے کا اختیار رکھتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے لاہور ہائی کورٹ بار کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ چیف جسٹس نے کہا کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں بنیادی انسانی حقوق ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسانی حقوق کا احترام نہ کرنے والی حکومتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ آئین کے آرٹیکل تین اور چار کو ہنگامی حالت میں بھی معطل نہیں کیا جا سکتا اور انصاف تک رسائی ہر شہری کا حق ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے بعض فیصلے ہمیں آزمائش میں ڈال دیتے ہیں، آمرانہ نظام حکومت کا تصور اب ختم ہو چکا ہے، ہم قانون کو سمجھتے ہیں اور ان پر عمل کرنا جانتے ہیں۔ میں سیاسی نہیں قانون سے تعلق رکھنے والی تقریبات میں شرکت کرتا ہوں اور لاہور ہائی کورٹ سے خطاب لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی دعوت پر کر رہا ہوں۔ انہوں نے خطاب کی دعوت دینے پر ہائی کورٹ بار کا بھی شکریہ ادا کیا۔ چیف جسٹس نے تقریب میں شریک ججز اور وکلاء کا بھی شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں میڈیا کے کردار کو بھی سراہتے ہوئے کہا کہ اگر میڈیا ساتھ نہ ہوتا تو اتنا بڑا اجتماع جمع نہ ہو سکتا۔ چیف جسٹس نے کہا کہ وہ اپنے خلاف صدارتی ریفرنس کے حوالے سے کوئی بات نہیں کریں گے لیکن جن لوگوں نے آئین کی بالادستی اور عدلیہ کی آزادی کی تحریک میں جو قربانیاں پیش کی ہیں انہیں اور وکلاء کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ چیف جسٹس نے گرفتار وکلاء کے حوالے سے کہا کہ امید ہے کہ عدالتیں گرفتار وکلاء کے ساتھ انصاف کریں گی اور ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا میں اور ججز صاحبان آپ میں سے ہیں، بار اور جج گاڑی کے دو پہیے ہیں، یہ اکٹھے چلیں تو گاڑی چلے گی۔ انہوں نے کہا کہ بارش، دھوپ اور آندھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہم عدلیہ کی آزادی اور قانون کی بالادستی کیلئے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ چیف جسٹس نے بنیادی انسانی حقوق کے حصول میں سپریم کورٹ کے کردار کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی مہذب معاشرے کی تشکیل میں انسانی حقوق ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آئین کی بالادستی قانون کی حکمرانی بنیادی انسانی حقوق اور آئین میں فراہم کی گئیں ہیں شخصی آزادی کے تحفظ کے بغیر مہذب معاشرے کی تشکیل ناممکن ہے۔ انہوں نے کہا کہ انسانی شخصیت کی تشکیل اور افراد کے محفوظ اور پرامن زندگی کے حصول کا انحصار بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی پر ہے، ایسی زندگی جہاں ہر شخص کو زندہ رہنے کا حق شخصی آزادی، جائیداد کا تحفظ، اظہار خیال، نقل و حرکت اور اجتماع کی آزادی حاصل ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں تاریخ کے حوالے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کسی بھی قوم کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کا دارومدار آئین کی بالادستی، جمہوریت کے حصول اور قانون کی حکمرانی پر ہوتا ہے۔ وہ قومیں اور ریاستیں جن کی بنیاد آئین کی بالادستی، قانون کی حکمرانی اور بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت کی بجائے آمرانہ نظام حکومت پر قائم ہوں وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ جو قومیں تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتیں اور غلطیوں کو دہراتی ہیں انہیں ان کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ پاکستان کے آئین میں بنیادی انسانی حقوق کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے، یہ بنیادی

انسانی حقوق نہ صرف تمام پاکستانی شہریوں بلکہ ان تمام افراد کو بھی حاصل ہیں جو فی الوقت پاکستان میں موجود ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آئین میں ان تمام بنیادی انسانی حقوق جنہیں تحفظ فراہم کیا گیا کی تفصیلی فہرست موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکمت عملی کے حصول اور آئین کی آرٹیکل تین اور چار میں بھی بنیادی انسانی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے اور سپریم کورٹ نے بھی اپنی بنیادی انسانی حقوق جو کہ آئین کے کئی ابواب پر مشتمل ہیں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ بنیادی انسانی حقوق ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آئین میں بیان کی گئی تمہید جسے آئین کا لازمی جز قرار دیا گیا ہے میں یہ بیان کیا گیا کہ پاکستان کے جمہور کی منشاء ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں مملکت اپنے اقتدار اور اختیارات کو جمہوری طریقے سے منتخب کردہ نمائندے کے ذریعے استعمال کرے گی۔ جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری، عدل و حکمرانی کے اصولوں پر جس طرح اسلام میں اس کی تشریح کی گئی ہے پوری طرح عمل کیا جائے گا جس میں مسلمانوں کو انفرادی حلقہ عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق گزاریں گے اور قرآن وسنت کے ذریعے اس کا تعین کیا گیا ہے انہوں نے کہا کہ اقلیتیں آزادی سے اپنے مذہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دے سکیں۔ انہوں نے کہا کہ آئین میں بنیادی انسانی حقوق کو اہم حیثیت حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ انتظامیہ کوئی ایسا فعل اور مقننہ کوئی ایسی قانون سازی نہیں کر سکتی جو انسانی حقوق کے متصادم ہو اور اگر ایسا ہو تو یہ آئین کے تحت کالعدم تصور ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اعلیٰ عدلیہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر ایسے انتظامی عمل اور قانون سازی کو کالعدم قرار دے جو آئین کے متصادم ہوں۔ آئین میں عدلیہ کو یہ اختیار عدالتی نظر ثانی کے حصول کے تحت حاصل ہے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ آئین کے آرٹیکل (3) میں محفوظ انسانی حقوق کا احاطہ کیا گیا ہے اس آرٹیکل کے تحت مملکت کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ ہر قسم کے استحصال کے خاتمے اور بنیادی حقوق کی بتدریج فراہمی کو یقینی بنایا جائے گا اس طرح آئین کے آرٹیکل (4) کے تحت ہر شہری کا یہ حق ہے کہ اس کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے۔ عدالت عظمیٰ کو بنیادی انسانی حقوق کے نفاذ کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ انہوں نے کہ کہ عدالت عظمیٰ نے اپیل پر بنا حق اور درخواست برائے اپیل اجازت کے مقدمات کے علاوہ خطوط کے ذریعے موصول ہونے والی شکایات پر بھی قانونی کارروائی کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بطور چیف جسٹس میں نے موصول ہونے والی لاتعداد درخواستوں پر از خود کارروائی کی ہے۔ عدالت میں کام کی زیادتی بھی ہمیں انسانی حقوق کے مقدمات کو نمٹانے میں رکاوٹ نہ بن سکی کیونکہ ہم کسی بھی ایسے مجبور اور لاچار افراد کے لئے عدالت کے دروازے بند نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ونی جیسی غلط رسومات کے خلاف بھی کارروائی کی گئی۔ چیف جسٹس نے کہا کہ اس ملک میں دو طبقے ہیں ایک وہ جو اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتا ہے اور دوسرا وہ جو قانون کی الف ب تک نہیں جانتا۔ انہوں نے کہا کہ عدالتوں نے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنے والوں کے خلاف کارروائی کی اور غریبوں کی دادرسی بھی کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ ناجائز حراست، ماحولیاتی آلودگی، قومی اداروں کی نجکاری اور پولیس کے قبضے کے خلاف بھی کارروائی ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ قانون کی نظر میں سردار، وڈیرے اور بیوروکریٹس سب برابر ہیں کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ اگر کسی نے بھی ایسا کیا تو اس کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے جب سے چارج سنبھالا تو انسانی حقوق سمیت دیگر مقدمات پر مبنی 12000 درخواستیں سپریم کورٹ میں لائی گئیں جن میں سے 6000 مقدمات کا فیصلہ سنا کر لوگوں کو انصاف فراہم کیا گیا۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے کہا کہ میرا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی میں سیاست کرتا ہوں تاہم جو فعل انسانی حقوق سے متصادم ہو وہ غیر آئینی ہوگا۔ انہوں نے مزید کہا کہ ملک میں ہنگامی حالات کے باوجود کسی چیف جسٹس کو معطل نہیں کیا جا سکتا اور میں آج بھی چیف جسٹس ہوں اور اگر حوصلے بلند ہوں تو آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے کہا کہ بار اور بنچ ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں اور اگر ان میں سے ایک بھی خراب ہو تو انصاف نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ ہر کسی کو بنیادی حقوق کا پتہ ہونا چاہئے۔ آئین کی بالادستی کے بغیر شخصی آزادی اور صحت مند معاشرہ کا وجود ممکن نہیں۔



سپریم کورٹ بار کے سیمینار سے چیف جسٹس

اوران کے وکلا کے خطابات

چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار چودھری نے کہا ہے کہ عوام کی آواز کو زیادہ دیر تک نہیں دبایا جا سکتا، وہ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن میں ''اختیارات کی تقسیم اور عدلیہ کی آزادی'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کر رہے تھے۔ دورہ کراچی کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے کسی تقریب میں شرکت کی۔ اس سیمینار میں شرکت کے لئے پہلی مرتبہ 50 ممالک کے سفیروں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی جس میں سے ناروے، ڈنمارک، سویڈن، جرمنی اور جاپان سمیت متعدد ممالک کے سفیروں اوران کے نمائندوں نے شرکت کی۔ سیمینار کے آغاز میں سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار حماد رضا اور کراچی میں جاں بحق ہونے والوں کے لئے فاتحہ خوانی کی گئی۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے کہا کہ وہ ریفرنس سے متعلق کچھ نہیں کہیں گے۔ میں صرف آئینی اور قانونی نکات پر بات کروں گا، یہی میری ترجیح ہے۔ ریفرنس پر میرے وکلاء، میڈیا کی رہنمائی کریں گے۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے کہا کہ عدلیہ کی آزادی کا بحال ہونا ضروری ہے۔ ملکی آئین میں چیک اینڈ بیلنس کے نظام کو واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، اختیارات کی تقسیم کا اصول ملکی آئین میں واضح طور پر موجود ہے، ان کا کہنا تھا کہ شخصی حکمرانی میں اختیارات اور طاقت کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ عدلیہ آئین کے تحت دی گئیں ذمہ داریاں پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ عدلیہ کی آزادی کی پاکستان آئین میں بھی ضمانت دی گئی ہے۔ بطور چیف جسٹس عدلیہ کی آزادی یقینی بنانا میری ذمہ داری ہے، چیف جسٹس نے کہا کہ فیصلے کی آزادی نہ ہونے کے باعث عدلیہ صحیح طور پر اپنا کردار ادا نہیں کر پاتی۔ بہترین نظام کے لئے بھی عدلیہ کا آزاد ہونا ضروری ہے۔ چیف جسٹس نے کہا ہے کہ آئین میں عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ کے اختیارات واضح ہیں کسی ایک شخص یا ادارے میں تمام اختیارات ہونا خطرناک ہوتا ہے، عدالتوں کو انتظامیہ کے دباؤ کے بغیر کام کرنا چاہئے۔ وکلاء کے بعد پوری قوم بھی عدلیہ کی آزادی کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی ہے عدالتیں کسی قسم کا کوئی بیرونی دباؤ قبول نہ کریں۔ سستے، فوری اور معیاری انصاف کی فراہمی کیلئے عدالتوں کا آزاد ہونا انتہائی ناگزیر ہے۔ ایک پیشہ ورانہ تقریر کروں گا لہٰذا کوئی نعرہ بازی نہ کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ سیمینار کا موضوع آج کے دور کی ضرورت ہے سب ججز پر ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کے دائرہ کار میں رہ کر اپنی تقاریر کریں۔ میں نے ہمیشہ قانون اور قواعد کی پابندی کی ہے۔ وکلاء عدلیہ کی آزادی کیلئے جنگ لڑ رہے ہیں۔ پوری قوم عدلیہ کی آزادی کیلئے اٹھ کھڑی ہو۔ عدلیہ کی آزادی کیلئے جدوجہد نے عوام کی توجہ بھی حاصل کر لی ہے۔ لوگوں کو سستا، تیز اور فوری انصاف ملنا چاہئے۔ اختیارات کی تقسیم آرٹیکل 175 میں کر دی گئی ہے جس میں کئی چیک اینڈ بیلنس ہیں۔ عدلیہ کی آزادی اور آزاد عدالتوں کیلئے اصول واضح ہیں۔ آئین میں اختیارات کی تقسیم واضح ہے۔ عدلیہ کی آزادی ضرور بحال ہونی چاہیے تاکہ لوگوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہو۔ اختیارات کی تقسیم کا ڈاکٹرائن واضح ہے۔ گورننس کا نظام بھی اختیارات کی تقسیم کے تحت ہیں۔ 1973ء کے آئین میں واضح ہے قانون ساز، عدلیہ اور انتظامیہ کے تین اداروں کا آزاد ہونا ضروری ہے اور کوئی بھی ایک دوسرے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ آئین کی پابندی تینوں میں لازمی ہے۔ عدالتیں دباؤ میں رہ کر سستا، فوری انصاف

نہیں کرسکتی۔انہوں نے کہا کہ انصاف ہوتا ہوا نظر آنا چاہئے اور عدالتیں بلا خوف وخطر فرائض سرانجام دیں اور انتظامیہ کے دباؤ میں آئے بغیر عدلیہ کام کرے۔آئین میں واضح ہے کہ عدلیہ آزاد ہوگی، کسی ایک شخص یا ادارے کی مطلق حکمرانی ہوتو اختیارات کا ناجائز استعمال بڑھ جاتا ہے۔کورٹس کسی قسم کا بیرونی دباؤ قبول نہ کریں۔میں نے بطور چیف جسٹس عدلیہ سپریم کورٹ، ہائی کورٹس اور ماتحت عدالتوں کی آزادی کیلئے کام کیا کیونکہ یہ گڈ گورننس کیلئے بھی ضروری ہے تاکہ پسماندہ طبقے تک بھی انصاف کی رسائی ہو اور ہمیں ضرورت ہے کہ ان ایشوز کی طرف تمام سٹیک ہولڈرز کو ملا کر ایک مقصد بنائیں۔شہریوں کے مسائل اور انصاف کی فراہمی پر توجہ دیں آزاد عدلیہ سے غربت کم ہوگی اور اقوام عالم میں بھی ہمارا مقام بلند ہوگا۔ ہمارے عدالتی نظام میں معیاری اور کم وقت میں انصاف ملنا چاہئے۔انہوں نے کہا کہ عدلیہ کو درپیش مسائل کثیر الجہتی ہیں اس کیلئے ایک آئینی و قانون پیکج ضروری ہے۔وسائل کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ جوڈیشل سروسز کی فراہمی میں عدالتیں کام کرسکیں۔اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے چودھری اعتزاز احسن نے کہا کہ جب سندھ ہائیکورٹ نے ایک ٹوٹنے والی اسمبلی کو بحال کیا تو چیف جسٹس منیر نے یہ کہہ کر اس کی تنسیخ کرائی کہ ہائیکورٹ کو یہ اختیار نہ تھا،لیکن جسٹس پٹیل کے کیس میں چیف جسٹس نے نظریہ ضرورت کی اصطلاح ایجاد کردی،اس وقت الیکشن ہونے تھے لیکن نظریہ ضرورت نے عوام کی امنگوں کو دبا دیا۔عاصمہ جیلانی کیس سے لوگوں نے امیدیں لگالیں کہ شاید مارشل لاء دفن ہوچکا لیکن 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے ایک منتخب وزیراعظم کو تخت سے اتار کر تختہ دار پر لٹکا دیا،اس وقت بیگم نصرت بھٹو کیس میں پھر جنرل کو تقویت دے دی گئی۔ 1981ء میں سب جماعتوں نے تحریک چلائی،وکلاء کا عظیم الشان جلوس نکلا کہ جنرل ضیاء الحق نے کورٹ کے اختیارات سلب کرلئے،ہم نے عدلیہ کی آزادی کے لئے جیلیں کاٹیں،عدلیہ نے ظفر علی شاہ کے کیس میں سرتسلیم خم کردیا لیکن پھر 9 مارچ 2007ء کا دن آیا جب ایک شخص نے انکار کردیا ،اس انکار کی طاقت دیکھیں وہ صاحب جنہوں نے ایک وردی والے کے سامنے بیٹھ کر اور محاصرے میں استعفیٰ طلب کرنے والوں کو انکار کرکے اور ریفرنس کا سامنا کرکے جو عزت کمائی وہ پوری قوم اور وکلاء کے سامنے ہے۔چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اسلام آباد سے پشاور کے لئے نکلتے ہیں تو یہ سفر دس گھنٹے میں طے ہوتا ہے،راستے میں کوئی مزدور اور کوئی بچہ کوئی انسان ایسا نہیں جس نے اپنی آنکھیں فرش راہ نہ کی ہوں،جب 5 مئی کو لاہور کے لئے نکلے تو مجھے حکم تھا کہ چیف صاحب کو 11 بجے تک پہنچانا ہے،26 گھنٹے کی مسافت دنیا نے دیکھی،میں نے دوست کو کہا کہ مجھے یقین نہیں آتا تو انہوں نے کہا کہ یقین مجھے بھی نہیں آتا لیکن میڈیا نے ہرانچ اور ہرمنٹ ٹیلی کاسٹ کیا تو میں بھی نہ مانتا اور کہتا کہ تو جھوٹ بولتا ہے لیکن شکر ہے کہ محمد علی غلط بیانی معاف کیجئے گا محمد علی درانی جیسی غلط بیانی نہیں ہوئی لیکن ابرار حسن صاحب کے کہنے پر کراچی گئے تو غدر مچا،اس کے آپ گواہ ہیں کہتے ہیں کہ چیف جسٹس کراچی کیوں آئے ان کے آنے کی وجہ سے ایسا ہوا،میں نے کہا کہ پھر کل آپ یہ کہیں گے کہ چیف جسٹس سانس کیوں لیتے، کھاتے کیوں ہیں،یہ ہمارا شہر ہے،کراچی کے لاڈلوں نے اگر اسے سزا دی ہے تو اس میں ہمارا قصور نہیں،ہم جج صاحبان کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم آزاد عدلیہ کے لئے لڑ رہے ہیں۔میں عدلیہ کی آزادی کے لئے 40 سال سے جدوجہد کررہا ہوں،عدلیہ آزاد اس وقت ہوگی جب جج اپنے آپ کو آزاد سمجھیں گے اور قربانی دینے کے لئے تیار ہوں گے۔یہ صلیب صرف وکلاء اور بار ایسوسی ایشن نے نہیں اٹھا رکھی،عدلیہ کی آزادی کی صلیب جب تک ایک جج اپنے کندھوں پر اٹھا کر اسے بوجھ نہیں محسوس کرتا،یہ عدلیہ آزاد نہیں ہوگی۔عدلیہ بہت جلد آزاد ہونے والی ہے۔جب عدلیہ آزاد ہوگی تو کوئی جج پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھائے گا۔ہم اگر آزاد عدلیہ کی جنگ لڑ رہے ہیں تو ہماری شرائط ہیں کہ عدلیہ طالع آزماؤں کی غلامی کرنا چھوڑ دے۔عدلیہ کی آزادی اور تقسیم اختیارات کا تقاضا ہے کہ اس ریاست کو قائداعظم نے سوشل ریاست کہا تھا لیکن بڑے غیر محسوس انداز سے بہت سے وکلاء،ادیبوں،شاعروں نے حکومت سے وظیفے لے کر اسے قومی سلامتی کی ریاست میں تبدیل کردیا،ہر شہری ریاست کا حصہ ہوتا ہے ریاست کا فرض ہے کہ اسے چھت،روزگار اور لباس فراہم کرے۔قائداعظمؒ جس کے پاس دردِ دل بھی تھا ملک بناتے ہوئے کہا کہ انہوں نے جاؤ تم آزاد ہو،جاؤ

جہاں چاہے عبادت کرو، اب آپ نے یہ جھنڈا اٹھالیا ہے، اس قومی فلاحی ریاست کو دوبارہ قومی سلامتی کی ریاست نہ بننے دینا۔

سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر منیر اے ملک نے کہا کہ عدلیہ کی آزادی کے پہلے سپاہی سر ایڈورڈ کک تھے جنہوں نے آج سے چار سو سال پہلے عدلیہ کو ایک بادشاہ کے چنگل سے آزاد کرایا۔ وہ جب جج بنے تو اس کے ساتھ وہ بادشاہ سے متصادم ہو گئے اور اس کی پاداش میں اسے اپنی سروس اور عہدے سے ہاتھ دھونا پڑے اور بادشاہ نے انہیں ستر سال کی عمر میں جیل بھیج دیا۔ سر ایڈورڈ کک نے کہا تھا کہ بادشاہ کو قانون اور خدا کے ماتحت ہونا چاہئے تا کہ بادشاہ عدلیہ کو اپنے اختیار میں چلانے کی کوشش کرے۔ منیر اے ملک نے کہا کہ آج چار سو سال بعد عدلیہ نے اپنی تاریخ کو خود دہرایا۔ انہوں نے کہا کہ سر ایڈورڈ کک کی یہ قربانی آج تک معاشروں کو رہنمائی فراہم کرتی رہی ہے۔ ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں کہ یا ہم ہتھیار ڈال دیں یا پھر عدلیہ کی آزادی کیلئے اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور عدلیہ کی آزادی کے پہلے سپاہی کے اس پیغام کو آئندہ آنے والی نسلوں تک پہنچائیں۔ کک نے قربانی دے کر اس تحریک کو یہاں تک پہنچایا۔ ہم اپنی جدوجہد کے ذریعے آئندہ نسلوں تک پہنچائیں۔ ہم نے اپنی جدوجہد کے ذریعے آئندہ نسلوں تک عدلیہ کی آزادی پہنچائی ہے اور وکلاء نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم اس تحریک کو جاری رکھیں گے۔

سابق صدر سپریم کورٹ بار حامد خان نے کہا ہے کہ پہلی مرتبہ وکلاء نے عدلیہ کی آزادی کیلئے مشترکہ طور پر تحریک شروع کی جو کامیابی کے قریب ہے۔ اس تحریک کے شروع ہونے پر ہمیں چیف جسٹس پر فخر ہے۔ 9 مارچ کو چیف جسٹس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کی گئی اسی جرأت مند چیف جسٹس اور باضمیر وکلاء نے ثابت کر دیا کہ دوسروں کو بے آبرو کرنے والے جلد خود بے آبرو ہو کر اقتدار سے نکلیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار چودھری پر فخر ہے کہ انہوں نے ایک فوجی آمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی بات ماننے سے انکار کیا اور پانچ گھنٹے مسلسل دباؤ میں رہنے کے باوجود وہ اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹے اور ملکی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک چیف جسٹس نے اپنی آزادی کی تحریک شروع کی اور پہلی دفعہ ہی وکلاء نے عدلیہ کی آزادی کیلئے مشترکہ طور پر ایک تحریک شروع کی جو اب کامیابی کے قریب ہے۔ اس میں اہم کردار سندھ ہائی کورٹ کے ججوں نے ادا کیا کہ انہوں نے بارش کے پہلے قطرے کا کردار ادا کیا اور دیگر وکلاء اور ججوں کو حوصلہ دیا اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سندھ کی عدلیہ آزاد ہے۔ اس کے بعد پشاور سپریم کورٹ نے بھی عدلیہ کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا کہ جب چیف جسٹس پشاور گئے تو پشاور ہائی کورٹ کے سینئر ججوں نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے کہا کہ پشاور کے بعد لاہور کے فنکشن میں بھی اٹھارہ جج شامل ہوئے اور لاہور ہائی کورٹ نے تاریخ کا قرضہ چکا دیا اور یہ داغ بھی دھو دیا کہ پنجاب کے چیف جسٹس ہوتے ہوئے عدلیہ کو ہمیشہ نقصان پہنچتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ملک بھر کے وکلاء اور جج آئین کے محافظ ہیں اور اس کی حفاظت بھی کریں گے۔

جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکیل علی احمد کرد نے کہا بہت پہلے ہم نے اس شخص سے کہا تھا کہ اس بار اس جنگ کا آغاز چیف جسٹس کے ساتھ بدسلوکی کر کے تم نے کیا ہے، یہ کوئی معمولی جنگ نہیں یہ دو رویوں کی جنگ ہے، ہم نے خبردار کیا تھا کہ کسی غلط فہمی میں نہ رہنا، یہ ملک اور اس کے عوام کسی کے باپ کی جاگیر نہیں۔ آج یہ جرنیل جو کچھ میٹر کے فاصلے پر ہے وہ خود دیکھے، ہم یہ اعلان کرتے ہیں ہم اس تاج، تخت کو نہیں مانتے جس میں عدلیہ کی آزادی نہیں۔ انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ ہم عدلیہ کی آزادی کے لئے کام کرتے رہیں گے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری کے ساتھ حکومت کے وفادار نہیں جو جگہ جگہ جھوٹ بولتے ہیں۔ چیف صاحب کے پینل آف کونسل میں ایک شخص ایسا نہیں جسے کہا جائے کہ جن کا ماضی داغدار ہو۔ ہم لوگوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ یہ تمہارے اور پاکستان کی بقاء کی جنگ ہے اگر یہ ہار گئے تو کسی کو انصاف نہیں ملے گا۔ ہم اپیل کرتے ہیں سیاسی جماعتوں اور سوسائٹیوں سے کہ اس جدوجہد میں ہمارا ساتھ دیں۔

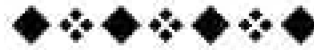
پاکستان بار کونسل کے صدر مرزا عزیز بیگ نے کہا کہ پاکستان بار کونسل جنرل پرویز مشرف کو کبھی صدر تسلیم نہیں کرتی ہمیشہ اسے غاصب کہتی

ہے۔ پی بی سی آئین کی حکمرانی عدلیہ کی آزادی پر یقین رکھتی ہے۔ 9 مارچ 2007ء پاکستان کی تاریخ کا اہم دن ہے پہلے ملٹری ڈکٹیٹر کے سامنے بہت سے ججز جھکتے رہے ہیں لیکن اس بار چیف جسٹس آف پاکستان نے جھکنے سے انکار کر کے ہمیں جرأت دی کہ تحریک چلائیں۔ ایک بار میں کوئٹہ گیا تو لوگوں نے کہا کہ آپ عدلیہ کی آزادی کی بات کرتے ہیں جو لوگ عدلیہ میں ہیں وہ نہیں کرتے لیکن میں نے کہا کہ عدلیہ آزاد ہوگی تو ہمارے مسائل حل ہونگے ہم عدلیہ کی آزادی کیلئے جنگ لڑ رہے ہیں اور آزادی تک جنگ جاری رہے گی۔ کراچی سے خیبر تک تمام وکلاء متحد ہیں ہمیں انشاء اللہ عنقریب فتح نصیب ہوگی۔

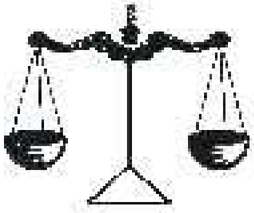
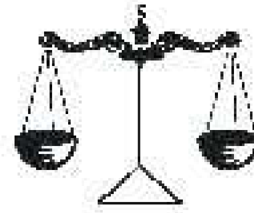
سینئر وکیل رشید اے صدیقی نے کہا کہ آزاد عدلیہ اور تقسیم اختیارات کا خواب بار بار فوج کی مداخلت سے پورا نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ عدلیہ ان فوجی حکمرانوں کا ساتھ دیتی رہی۔ عدلیہ کا ایک فرض یہ ہے کہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرنے دے۔ اگر عدلیہ خود مختار ہوگی تو پارلیمنٹ بھی خود مختار ہوگی لیکن بدقسمتی سے میاں نواز شریف اور حاجی سیف اللہ کیس میں اور بینظیر کیس میں سپریم کورٹ نے حکمرانوں کے غلط اقدام کا ساتھ دیا۔ 9 مارچ کی تاریخ نے پاکستان کی تاریخ بدل دی پہلی بار ملک میں وکلاء قانون کی حکمرانی کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں نے یہ جانا کہ ملک کا بچاؤ تقسیم اختیارات ہی میں ہے۔ حکمران جماعت کے صدر نے پھر افواہ پھیلائی ہے کہ اس نے صدر کو تازہ حلف لینے سے منع کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ موجودہ ججوں کو ڈرایا گیا ہے اس وقت پوری قوم عدلیہ کی طرف دیکھ رہی ہے وہ چاہتے ہیں کہ آزاد عدلیہ اور تقسیم اختیارات ہو۔ میں یہ کہوں گا کہ ریاست کا ایک عضو دوسرے عضو پر مسلط نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو تباہی آئے گی۔ اگر ریاست کے ستونوں میں سے کوئی ایک گر جائے تو پھر چھت نیچے آ جاتی ہے۔

کراچی بار کے صدر ابرار حسن نے کہا کہ یہ فیصلہ کن گھڑیاں ہیں، اب عدلیہ پر پابندیوں کا دور ختم ہونے والا ہے اور قانون کی حکمرانی اور آئین کی برتری کا دور آنے والا ہے جسے فوجی حکمرانوں نے پامال کر دیا ہے۔ سپریم کورٹ نے مولوی تمیز الدین خان کیس سے ظفر علی شاہ کیس تک تخت دباؤ کا سامنا کیا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ آزاد عدلیہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک جمہوریت نہ ہو، ہم ان ججز کا احترام کرتے ہیں جنہوں نے پی سی او کے تحت حلف نہیں لیا لیکن ان کا بھی احترام کرتے ہیں جنہوں نے بعض مجبوریوں کے تحت حلف اٹھایا۔ سپریم کورٹ کی تاریخ میں 9 مارچ کا وہ وقت بھی آیا جب ایک ڈکٹیٹر کو اس وقت شاک پہنچا جب چیف جسٹس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا، اپنے پامال کئے جانے کے بعد بھی آئین کا وقار قدرے بحال ہے۔ سپریم کورٹ نے سٹیل ملز سمیت بہت سے مقدمات میں انصاف کے مطابق فیصلے کئے، میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس نازک موڑ پر جوڈیشری اکیلی اور تنہا نہیں، وکلاء خیبر سے کراچی تک اس کی آزادی کے لئے مظاہرے کر رہے ہیں۔ یہی عدلیہ کے محافظ بھی ہیں۔ آئین کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اگر ایسا کیا جائے گا تو تمام قانونی طاقت کے ساتھ اسے روکا جائے گا۔ ہم اپنی جدوجہد کو قانونی اور آئینی رخ دینا چاہتے ہیں۔ عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری کی جدوجہد میں وکلاء اکیلے نہیں ہیں انہیں پاکستان کے عوام اور دیگر جماعتوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ ہم ایسا پاکستان چاہتے ہیں جہاں عدلیہ کے سربراہ کو انصاف کا طلبگار نہ ہونا پڑے، جہاں حکمران خود انصاف کے لئے آئیں گے۔ سیمینار میں سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے ریٹائرڈ جج صاحبان کی بڑی تعداد موجود تھی۔ سپریم کورٹ آڈیٹوریم میں صرف وکلاء کو آنے کی اجازت تھی تاہم آڈیٹوریم میں حمید گل بھی موجود تھے۔ لاہور ہائیکورٹ بار اور لاہور بار سے سینکڑوں وکلاء پر مشتمل دو قافلے 6 بسوں اور درجنوں گاڑیوں پر لاہور سے اسلام آباد پہنچے۔ صبح دس بجے لاہور بار سے بار کے محمد شاہ اور سیکریٹری شمیم ملک، نائب صدر میاں عصمت اللہ و دیگر وکلاء رہنماؤں کی سربراہی میں وکلاء دو بسوں اور گاڑیوں پر اسلام آباد روانہ ہوئے جبکہ لاہور ہائیکورٹ بار سے سپریم کورٹ بار، لاہور ہائیکورٹ بار اور مسلم لیگ (ن) لائرز فورم کے سینکڑوں وکلاء پر مشتمل 4 بسوں اور درجنوں گاڑیوں پر قافلہ صبح دس بجے لاہور سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہوا جبکہ اس کے

علاوہ بھی درجنوں وکلاء انفرادی طور پر اپنی اپنی گاڑیوں پر اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ اس ضمن میں پنجاب بار کونسل سے بھی وکلاء کے قافلے اسلام آباد گئے۔ سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کے خطاب کے موقع پر انتظامی امور وکلاء نے سنبھالے، سپریم کورٹ کے داخلی گیٹ سے لے کر آڈیٹوریم ہال تک تمام راستوں میں نوجوان وکلاء کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو کہ شرکاء سے ان کے دعوت نامے اور کارڈ چیک کرتے رہے۔ نوجوان وکلاء انتظامیہ کے بیج لگائے، داخلی گیٹ پر بھی موجود تھے۔ جہاں پر انہوں نے سپریم کورٹ میں داخل ہونے والے تمام لوگوں کی خصوصی چیکنگ کی۔ سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کے خطاب کے موقع پر ان کا خطاب سنانے کے لئے سپریم کورٹ کی عمارت کے باہر بجلی کے سٹریٹ پول پر لاؤڈ سپیکر نصب کئے گئے تھے جن پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اعلان کیا جاتا رہا ہے کہ انتظامی امور کو ٹھیک رکھنے کے لئے شرکاء انتظامیہ سے تعاون کریں۔ لاؤڈ سپیکر پر یہ بھی اعلان کیا گیا کہ آڈیٹوریم ہال میں صرف وکلاء ہی چیف جسٹس کا خطاب سن سکیں گے کسی بھی غیر متعلقہ فرد کو آڈیٹوریم حال میں داخلے کی اجازت نہیں ہوگی۔ قبل ازیں چیف جسٹس سپریم کورٹ پہنچے تو ہزاروں افراد نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ شاہراہ دستور پر خاکسار تحریک کے سینکڑوں کارکنوں نے قائد خاکسار تحریک حمید الدین المشرقی کی زیر قیادت وکلاء، عدلیہ اور چیف جسٹس کے ساتھ بھرپور یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ خاکساروں نے ہاتھوں میں احتجاجی بینرز، پلے کارڈز اور خاکسار تحریک کے سرخ ہلالی پرچم تھامے ہوئے تھے۔ حمید الدین المشرقی نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ چیف جسٹس نے حق کی آواز اور آمر وقت کے سامنے جرأت مندانہ انکار کر کے دراصل پاکستانی قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔



عدلیہ کی آزادی حقیقت یا خواب

عدالتی بحران کے حوالے سے چند اہم شخصیات کے انٹرویوز

سپریم کورٹ بار کے صدر منیر اے ملک کا انٹرویو

(یہ انٹرویو ممتاز شفیع نے روزنامہ پاکستان کے لیے کیا)

رات کا پچھلا پہر تھا، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے کمپیوٹر اور قانون کی کتابیں بند کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ کافی تھکن ہو رہی ہے اور نیند اچھی آئے گی، اب سونا چاہئے۔ اسی وقت مجھے یہ خیال آیا کہ اوپر والی منزل پر میری بیٹی شہزادبھی کمپیوٹر پر کام کر رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے آواز دے کر پوچھوں کہ اس نے اپنا کام ختم کر لیا ہے اور وہ کب سوئے گی؟...... میرے آواز دینے سے پہلے ہی ایک دم فائرنگ کی زور دار آواز نے خاموش فضا میں خوفناک دھماکہ کر دیا۔ گولیاں میرے اپنے گھر کی کھڑکیوں اور دیواروں کو چھلنی کر رہی تھیں۔ میں اوپر کی جانب بھاگا تو سیڑھیوں میں بیٹی شہزادمل گئی۔ پھر ہم چاروں فیملی ممبر یعنی میں، میری بیگم، بیٹی اور بیٹا اکٹھے ہو گئے۔ تیزی سے گولیاں برس رہی تھیں، جن سے کمروں کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ رہے تھے۔ گولیاں کمروں کی بیرونی دیوار کے علاوہ اندر کمرے کی دیوار اور چھت میں بھی پیوست ہو رہی تھیں۔ یہ کام منٹوں میں مکمل ہوا اور پھر حملہ آور وہاں سے چلے گئے۔ ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں اس فائرنگ میں محفوظ رکھا۔ میری بیٹی شہزاد نے بتایا کہ کئی گولیاں اس کے قریب سے گزر گئیں۔ ان گولیوں کی سنسناہٹ وہ محسوس کر سکتی تھی۔ میرا بیٹا احسان بھی سراسیمگی اور خوف و ہراس کی حالت میں دکھائی دیا۔ میں نے اور بیگم نے بچوں کو حوصلہ دیا اور اس کے بعد میں نے دوست احباب اور اتھارٹیز کو اس فائرنگ کی اطلاع دی۔

پاکستان سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر اور صدارتی ریفرنس میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکیل منیر اے ملک اپنے گھر پر ہونے والی فائرنگ کی تفصیلات بیان کر رہے تھے تو وہ بالکل نارمل حالت میں تھے۔ خوف کی کوئی علامت ان کے چہرے یا لہجے سے عیاں نہیں ہو رہی تھی۔ حسب معمول وہ گفتگو کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی ایک آدھ شگفتہ جملہ بھی کہہ رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ شکر ہے، آپ لوگ اس حملے میں محفوظ رہے۔ ویسے اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

انہوں نے جواب میں کہا۔ ''میں بالکل فٹ ہوں۔ حملہ آوروں کی گولی کے لئے نہیں بلکہ حالات جو بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے فٹ ہوں''۔

ہم نے کہا کہ جس طرح فائرنگ ہوئی، اس وقت تو آپ چاروں میں سے کسی کو بھی گولی لگ سکتی تھی۔

وہ کہنے لگے۔ ''اللہ کی بہت زیادہ مہربانی ہے کہ ہم گولیوں سے محفوظ رہے۔ آپ جیسے دوستوں کی دعائیں ہمارے شامل حال ہیں۔ ویسے ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی حرکتوں سے میں خوفزدہ ہونے والا نہیں ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ موت برحق ہے اور ضرور آئے گی۔ اس لئے جب اور جو گھڑی مقرر ہے، اس گھڑی، اس لمحے کو آنے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ بالکل اسی طرح دنیا کی کوئی طاقت مقررہ وقت سے پہلے موت کا پیغام لے کر نہیں آسکتی۔ کسی کا باپ بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے! آپ جیسے بہت سے دوستوں نے رابطہ کیا ہے، بڑی خوشی ہوئی ہے۔ چیف صاحب (چیف جسٹس افتخار محمد چودھری) نے بھی مجھے فون کر کے کہا ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ حوصلہ رکھیں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ سب کچھ میرا ساتھ دینے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ چیف صاحب کی ان باتوں سے یقیناً مجھے اور میری فیملی کو بڑا حوصلہ ملا ہے''۔

منیر اے ملک سے گفتگو شروع ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ بچپن میں آپ اپنی والدہ سے کیا کچھ کھانے کی فرمائش کیا کرتے تھے؟ یہ سوال انہیں کچھ اداس کر گیا۔ وہ کہنے لگے کہ والدہ تو مجھ سے اسی طرح بہت زیادہ پیار کیا کرتی تھیں، جیسے ہر ماں اپنے بچے سے کرتی ہے۔ وہ میری ہر فرمائش پوری کرتی تھیں، لیکن یوں ہوا کہ مجھے چھ سال کی عمر میں ہی لارنس کالج گھوڑا گلی کے بورڈنگ میں داخل کروا دیا گیا۔ اسی طرح میں اپنی والدہ سمیت تمام گھر والوں سے دور چلا گیا اور پھر پندرہ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرنے کے لیے گھر والوں سے دور رہا۔ دراصل میرے والد غلام محمد ملک خود زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن وہ تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ علم کی طاقت کے قائل تھے چنانچہ اس زمانے میں میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے باوجود انہوں نے وسیع مطالعہ کیا اور پھر کئی کتابیں ان کے نام سے شائع ہوئیں، میرے والد صاحب بہت ذہین اور باصلاحیت تھے۔ انہوں نے ہم تمام بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ہم کل آٹھ بہن بھائی ہیں۔ میری سب سے بڑی بہن نے جالندھر سے اس دور میں انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں تقریباً اٹھارہ سال بڑی ہیں۔ دوسری بہن سعیدہ ملک ڈاکٹر ہیں اور آج کل سندھ حکومت میں بطور وزیر شامل ہیں۔ ان سے چھوٹی بہن رفعت ملک بھی ڈاکٹر ہیں۔ وہ سائیکالوجسٹ ہیں اور ایک کالج کی پرنسپل ہیں۔ میرا چھوٹا بھائی سعید ملک مجھ سے زیادہ فعال ہے۔ وہ سیاست میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس نے کراچی یونیورسٹی میں "لبرلز" کی ایک پارٹی بھی بنائی تھی۔ میرا ایک بھائی ظفر ملک امریکہ میں بزنس کرتا ہے، اس کی اپنی ایک فرم ہے۔ میرا سب سے چھوٹا بھائی طاہر ملک ہے، جسے ہوائی جہاز اڑانے کا بڑا شوق ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے والد نے میری والدہ کے بھرپور تعاون سے اپنے تمام بچوں کو اچھی تربیت دی اور اعلیٰ تعلیم دلوائی۔

میں نے پوچھا کہ آپ والدہ کے زیادہ قریب تھے یا والد کا قرب آپ کو زیادہ ملا ہے؟

منیر ملک نے کہا کہ والدہ اور والد دونوں ہی قریب تھے، لیکن والدہ کو مجھ سے بہت زیادہ پیار تھا۔ ایک بات یونہی مثال کے طور پر بتاتا ہوں کہ جب چھ سال کی عمر میں مجھے بورڈنگ ہاؤس بھیجا گیا تو میری والدہ کو دکھ تھا کہ میں ان سے دور ہو جاؤں گا، مگر وہ اس بات پر اپنے دل کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئیں کہ میں اچھی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں گا۔ ان کی محبت کا اندازہ آپ یوں لگائیں کہ انہوں نے میرے لیے خاص طور پر کپڑوں کا انتخاب کیا۔ میں ڈریس اپ ہوا اور جب چلنے لگا تو والدہ رو پڑیں۔ میں بھی رونے لگا۔ بہر حال میرے اور ان کے آنسو میری قمیص کو بھگوتے رہے۔ پھر میں چلا گیا۔ بعد میں چھٹی پر واپس آ تو انہوں نے وہ قمیص جسے پہنا کر انہوں نے مجھے رخصت کیا تھا، اسے سنبھال کر رکھا اور میں نے تیس سال بعد بھی ان کے پاس اس قمیص کو محفوظ دیکھا، وہ اسے بڑی محبت سے چومتی تھیں۔

اس سوال پر کہ آپ کی والدہ آپ کو لوری سنایا کرتی تھیں اور کہانیاں سنایا کرتی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ چھ سال کی عمر سے پہلے یقیناً لوریاں بھی سنائی ہوں گی، مگر مجھے یاد نہیں ہے۔ میری والدہ نے اچھی اچھی کہانیاں بھی سنائی ہوں گی۔ وہ ان پڑھ تھیں، مگر میرے والد کہا کرتے تھے کہ بیگم! اگر میں اتنا تعلیم یافتہ ہوتا، جتنا تم ہو تو میں سیدھا جنت میں پہنچ جاتا۔

والدہ کو میری نظر کمزور ہونے کی وجہ سے پریشانی تھی۔ بچپن ہی میں مجھے نظر کا چشمہ لگانا پڑا، آج میری نظر کے چشمے کا نمبر 5-7 ہے۔ بہر حال، جب میں نے لارنس کالج گھوڑا گلی سے تعلیم مکمل کر لی تو اس کے بعد مختصر عرصے کے لیے سائنس کالج اور این ای ڈی کالج میں پڑھتا رہا۔ پھر والد صاحب نے مجھے کیمیکل انجینئر بنانے کا فیصلہ کیا اور مجھے امریکہ بھجوایا گیا۔ جہاں میں نے دس سال گزارے اور اس عمر میں ہی میں نے اپنے آپ کو خود مختار سا محسوس کیا تھا اور زندگی کے تجربات کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ یہ تجربہ آج بھی جاری ہے۔ جب میں سولہ سال کا تھا تو میں سمجھتا تھا کہ شاید مجھے بہت کچھ معلوم ہے لیکن آج 57 سال کی عمر میں ہوں تو اس وقت بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے ابھی کچھ زیادہ معلوم نہیں، زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلوم کرنا ابھی باقی ہے۔ بہر حال میں نے وکالت سے بہت کچھ سیکھا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس فیلڈ میں ہونے کی وجہ سے مجھے زیادہ بہتر تجربہ حاصل ہوا اور میں نسبتاً بھرپور انداز میں زندگی گزار رہا ہوں۔

منیر ملک بچپن اور نوجوانی کی کچھ اداس کر دینے والی یادوں سے باہر نکلے تو ہم نے ان کے ساتھ باقاعدہ سوالات کا سلسلہ کیا۔ قارئین کی

خدمت میں اس کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

سوال: منیر ملک صاحب آپ نے باقاعدہ وکالت کیسے شروع کی، آپ اس پیشہ میں کیسے داخل ہوئے؟ وہ کون سے عوامل تھے جو آپ کو اس طرف لے آئے؟

منیر ملک: جب میں امریکہ سے تعلیم حاصل کر کے واپس پاکستان آیا تو بنیادی طور پر میں اکاؤنٹنٹ تھا، میں نے انسٹیٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹینٹس کو درخواست دی کہ میری انرولمنٹ کریں۔ انتظامیہ نے مجھے انرول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے سندھ ہائیکورٹ میں اس انکار کے خلاف رٹ پٹیشن دائر کر دی کہ پوری دنیا میری کوالیفکیشن کو تسلیم کرتی ہے پاکستان کیوں تسلیم نہیں کرتا۔

میرے اس مقدمے کی پیروی مرحوم نظام احمد صاحب نے کی۔ اچھا، میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میں خالد اسحاق اینڈ کمپنی کے دفتر میں شام کے وقت جایا کرتا تھا، وہاں پر میری جسٹس صبیح الدین احمد سے بھی ملاقات ہوئی۔ بعد میں صبیح الدین احمد اور میں پارٹنر بنے۔ بہر حال سندھ ہائی کورٹ سے میری رٹ پٹیشن مسترد ہوگئی۔ بنیاد یہ بنائی گئی کہ رٹ پٹیشن انسٹیٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹینس کے خلاف نہیں ہوسکتی۔ اب آپ دیکھیں کہ اس وقت کیا زمانہ تھا اور اب قانون نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ذرا سی بھی کوئی بات ہو جائے تو رٹ پٹیشن دائر ہوسکتی ہے۔ بہر حال سندھ ہائیکورٹ میں میری رٹ پٹیشن کی سماعت جسٹس ایس اے نصرت کے بنچ میں ہوئی اور اسے بنچ نے مسترد کر دیا۔ اس فیصلے کے خلاف میں نے سپریم کورٹ میں درخواست دی۔ 1975ء کا زمانہ تھا اور بھٹو صاحب نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر رکھی تھی اس وقت آئینی اور قانونی صورت حال یہ بتائی جاتی تھی کہ ایمرجنسی نافذ ہو تو شہریوں کے بنیادی حقوق معطل ہو جاتے ہیں سپریم کورٹ میں میں نے اپنی وکالت خود ہی کی میری درخواست کی سماعت 1976ء کے اوائل میں ہوئی۔ سپریم کورٹ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ تمہاری رٹ پٹیشن قابل پذیرائی ہے لیکن بنیادی حقوق معطل ہیں اس لئے تمہیں کوئی ریلیف نہیں دی جاسکتی۔ ہم نے اپنے لئے ریلیف کی گنجائش کے حوالے سے دلائل پیش کئے سپریم کورٹ کے جس بنچ نے میری پٹیشن کی سماعت کی اس میں جسٹس دراب پٹیل بھی شامل تھے انہوں نے کہا کہ ینگ مین تم وکالت کا پیشہ باقاعدہ طور پر اختیار کیوں نہیں کر لیتے؟''

میں نے انہیں بتایا کہ جناب میں وکیل بھی ہوں لیکن میری پہلی ترجیح اکاؤنٹینسی تھی اس لئے یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال اس کے بعد میں نے باقاعدہ وکالت شروع کر دی۔ یہ تھے وہ حالات اور عوامل جو مجھے اس پیشے میں لے آئے۔

سوال: اچھا، اب آپ وہ واقعات بھی بتادیجئے کہ جب آپ کیمیکل انجینئر بنتے بنتے رہ گئے اور اچانک وکالت کے پیشے کو ترجیح دینے لگے؟

منیر ملک: ہاں۔ یہ آپ نے اچھا سوال کیا ہے۔ ہوا یوں کہ جب میں امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو میرا ایک دوست برکلے میں رہتا تھا۔ وہ مجھے ایک دن کھینچ کر ایک جلسے میں لے گیا۔ ڈاکٹر اقبال احمد کی تقریر کا پروگرام تھا۔ ان کے خلاف الزام تھا کہ انہوں نے وہائٹ ہاؤس کے تہہ خانے میں بم دھماکہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے میں چھ افراد کو ملزم بنایا گیا۔ اس شام ڈاکٹر اقبال احمد کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں کیمیکل انجینئر نہیں بنوں گا، اسی دوران مجھے ایک سکالرشپ کی آفر ہوئی تو میں نے چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کر لی اور ساتھ ہی وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ اور بھی آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ جب میں امریکہ میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا تو 1860ء کا ایک کیس سامنے آیا۔ اس میں لکھا ہے کہ سیاہ فام اور سفید فام شہری ہوتو وہ کسی ایک جگہ پر بیٹھ تو سکتے ہیں، کام تو کر سکتے ہیں مگر ان کے لیے کام کرنے کی جگہ الگ الگ ہوگی۔ جو سہولتیں اور مواقع ہوں گے، وہ مختلف ہوں گے۔ مثلاً ہم یہاں ہوٹل میں ناشتہ کر رہے ہیں۔ اگر کوئی سیاہ فام ہوگا تو وہ اس میز پر بیٹھے گا اور سفید فام کے لیے علیحدہ میز ہوگی۔ یہ فارمولا ''الگ الگ لیکن برابر'' کہلاتا تھا۔ عملی طور پر یہ ہوتا تھا کہ اس فارمولے کے تحت سفید فام کو تو اچھا اچھا آملیٹ اور عمدہ مکھن اور توس ملتا تھا جبکہ سیاہ فام کو دوسرے درجے کی اشیاء ملتی تھیں یعنی ناشتے کے لیے دال ملتی تھی۔ اس امتیازی سلوک پر ایک جج

مارشل نے جو رائے خاص طور پر دی تھی، اس میں لکھا تھا کہ اس ناانصافی پر تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اس فیصلے کے ایک سو سال بعد امریکہ کی سپریم کورٹ میں ایک کیس پیش ہوا، جس میں انہوں نے کہا کہ ''الگ الگ مگر برابر'' کا فارمولا غیر منصفانہ ہے۔'' بہر حال میں اس ''الگ الگ مگر برابر'' فارمولے والے کیس سے بہت زیادہ متاثر ہوا تو میں نے اسی وقت تہیہ کیا تھا کہ ہمیشہ حق کے لیے لڑوں گا اور انصاف حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کروں گا۔ چاہے، مجھے اس میں کامیابی کے لیے ایک سو سال کیوں نہ لڑنا پڑے۔ اس طرح میرا ذہن وکالت اور اس کی ترجیحات کے حوالے سے پختہ ہو رہا تھا اور جب میں نے پریکٹس شروع کی تو اپنے ذہن کے مطابق عملی جدوجہد کا آغاز کر لیا۔

سوال: منیر صاحب! آپ نے تیس بتیس سال لاء پریکٹس کی ہے۔ اس عرصے کے دوران آپ نے بہت سے مقدمات جیتے ہوں گے۔ آپ اپنے چند ایسے مقدمات کی نشاندہی کر سکتے ہیں، جن میں کوئی ایسا لاء پوائنٹ موجود تھا، جس کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی یا جس پر آپ فخر کر سکتے ہوں؟

منیر ملک: ممتاز صاحب! تیس بتیس سال کافی عرصہ ہوتا ہے۔ اس دوران اللہ کے فضل و کرم سے بہت سے مقدمات میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن میں اپنی ذات کو نمایاں نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک آئین اور قانون کے حوالے سے آپ نے بات کی ہے تو میرے نزدیک پاکستان کی تاریخ میں کوئی ایسا کیس نہیں ہے، جس کو میں بڑے فخر سے پیش کر سکوں۔ ہماری عدلیہ ہمیشہ فوج کی ''بی ٹیم'' رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ فوج نے کتنے سال حکومت کی ہے۔ کیا یہ قابل فخر کام ہو سکتا تھا؟ اب مجھے اور آپ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عدلیہ میں جو لوگ ہیں، وہ آسمان سے تو نہیں آتے۔ اسی معاشرے سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہی کچھ لوگ عدلیہ میں جاتے ہیں۔ اچھا...... میں آپ کو ایک مثال دے کر سمجھاتا ہوں۔ ایک چھوٹا سا آئی لینڈ فجی ہے، وہاں پر فلائیٹ لیفٹیننٹ رولنگز نے اس کے منتخب وزیراعظم کو نکال باہر کیا اور سپریم کورٹ کے دفاتر کو تالا لگا دیا۔ اس بہت ہی چھوٹے سے ملک فجی کے سپریم کورٹ کے تمام جج صاحبان ایک درخت کے نیچے بیٹھے اور پھر فلائیٹ لیفٹیننٹ رولنگز اور اس کے ایکشن کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ ان ججوں کے پاس بڑی بڑی اور قیمتی گاڑیاں، گارڈز اور پروٹوکول وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا، لیکن ان میں جرأت تھی، انہوں نے آئین اور قانون کے مطابق اپنا فیصلہ دے دیا۔ اب ہم جو اپنی عدلیہ سے چاہتے ہیں، وہ کوئی ناممکن بات کی خواہش نہیں بلکہ ہم تو انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ بھائی! خدارا، آپ تو فجی کے ججوں کی طرح جرأت کا مظاہرہ کرو۔

سوال: یہ بتائیے کہ ہماری عدلیہ کا جو بھی امیج ہے، یہاں جو بھی خرابی ہے، اسے کیسے بہتری کی طرف لایا جا سکتا ہے۔ آپ کے پاس کیا تجاویز ہیں؟ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن نے کیا کوئی سفارشات تیار کی ہیں؟؟ میرا مطلب ہے کہ وہ سب کچھ جو آپ لوگ چاہتے ہیں اور جس کی عوام کو بھی شدید خواہش ہے بلکہ جج صاحبان بھی ایسا ہی چاہتے ہوں گے۔

منیر ملک: دیکھئے، میں ماضی کے حوالے سے بات نہیں کروں گا کہ وہ وقت گزر گیا، جو بھی ہوا۔ اسے ایک طرف رکھ دیجئے اور اس وقت جو صورت حال ہے، اس کے مطابق بات کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ہماری عدلیہ کے پاس بہت ہی سنہری موقع ہے کہ وہ اپنا امیج بہتر بنا سکتی ہے۔ ماضی میں جو کچھ بھی ہوا۔ اس کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ آج عدلیہ کے پاس گولڈن چانس ہے کہ وہ خود کو سرخرو کر سکتی ہے۔ تاریخ میں یہ بات درج ہو رہی ہے کہ موجودہ حالات میں کون کہاں اور کس طرف کھڑا ہے؟ وہ کہتے ہیں نا کہ دیر آید درست آید۔ آپ ذرا جائزہ لیں اور خود ہی اندازہ لگائیں کہ کس قدر سنہری موقع ہے، ہمارے ججز کے لیے کہ آپ پورے ملک میں کہیں بھی چلے جائیں، اگر کسی علاقے میں صرف پانچ چھ وکیل بھی ہیں، تو ان کے جذبات بھی وہی ہیں، جو راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور، کراچی، پشاور یا کوئٹہ میں موجود وکلاء کے جذبات ہیں۔ اتنی بڑی تحریک جاری ہے۔ روزانہ درجنوں بیسیوں جگہوں سے فون آتے ہیں، میڈیا کے ذریعے ان کا پیغام

پہنچتا ہے وہاں کے وکیل کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ میری ذات کے ساتھ نہیں بلکہ جس مقصد اور مشن کے تحت ہم نے یہ تحریک شروع کر رکھی ہے، اس کی حمایت کرتے ہیں اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہمارا مشن ہے، ہمارا کاز ہے کہ اب عدلیہ آزاد ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک ایسا ستون وجود میں آ جائے، جس سے اس ملک کے حالات بہتر ہو سکیں، وہ ستون اس ملک کو استحکام دے سکے۔ گزشتہ روز ہی میں نے کراچی کی ملیر بار ایسوسی ایشن کے اجلاس میں کہا تھا کہ اگر عدلیہ فوج کی ''بی ٹیم'' نہ بنے اور عوام کی ''اے ٹیم'' بنے تو اس ملک میں کسی انقلاب کی ضرورت نہیں۔ صرف حوصلے کی ضرورت ہے۔

سوال: آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ ہمارے جج کس طرح حوصلے اور جرأت سے کام لے سکتے ہیں؟

منیر ملک: دیکھئے، ہمارے ججوں کو چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس افتخار محمد چودھری کی مثال اپنے سامنے رکھنی چاہیے۔ صدر جنرل پرویز مشرف اور چیف جسٹس سپریم کورٹ کی ملاقات ہی پر بات کرتے ہیں کہ وردی میں جنرل مشرف بیٹھے ہیں، ان کے پیچھے بھی ایک جنرل بیٹھا ہے۔ ان کے سامنے الٹے ہاتھ پر چیف جسٹس صاحب بیٹھے ہیں۔ اس وقت ایک چیف جسٹس نے جو فیصلہ کیا، وہی جرأت اور حوصلے والی بات ہے۔ جب تک اس ملک کے جج صاحبان یہ بات ذہن سے نہیں نکالیں گے کہ وہ نوکری کر رہے ہیں اور وہ تو ملازم ہیں۔ اس وقت تک کوئی جج خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی جرأت اور حوصلے سے کام لے سکتا ہے۔ ہمارے ججوں کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ اگر وہ بطور جج کام کر رہے ہیں اور جج کی کرسی پر بیٹھے ہیں اور ان کے پاس ایک آئینی عہدہ ہے اور وہ آئین اور قانون کے تابع ہیں۔ انہیں جس آئین کے تحت مقرر کیا جاتا ہے اور جس آئین کے تحت وہ حلف اٹھاتے ہیں، ججوں کو اس کا دفاع کرنا چاہیے۔ ہماری عدلیہ نے ہر آمر کو سپورٹ کیا اور اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری۔ اس طرح وہ ہر ڈکٹیٹر کی ''بی ٹیم'' کا کردار ادا کرتی رہی ہے۔

سوال: منیر اے ملک صاحب! آپ ہماری عدلیہ کے کون سے فیصلوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟

منیر ملک: سب سے پہلا تو مولوی تمیز الدین کیس تھا۔ پھر سٹیٹ بنام دوسا کیس تھا۔ اس کے بعد تو ایسا وقت بھی آیا کہ چیف جسٹس صاحب جن کا نام ارشاد حسن خان تھا ان کی حالت یہ تھی کہ فیصلہ فائل میں لے کر ادھر ادھر پھرتے رہتے تھے۔ وہ ظفر علی شاہ والا کیس تھا ناں۔ اس کی بات کر رہا ہوں۔ کتنی شرم کی بات تھی۔

سوال: کیا ایسی بات آپ کے ذہن میں بھی ہے کہ جج صاحبان نے جب زیادہ تعداد میں از خود نوٹس لینا شروع کیے، حکومتی مشینری کے بارے میں ریمارکس دیئے گئے اور بعض بیورو کریٹس کی کارکردگی اور محکمانہ صورت حال پر تنقید ہوئی تو اس کے بعد ہی چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف کارروائی ہوئی؟

منیر ملک: دیکھئے...... میں کسی خاص شخصیت کے لئے کام نہیں کر رہا ہوں۔ چیف جسٹس افتخار چودھری نے بھی پی سی او پر حلف اٹھایا ہوا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ دیر آید درست آید۔ چلیے، ماضی کو چھوڑیں، حال کی بات کریں۔ اب تو آپ جج صاحبان اصل کردار ادا کریں۔ جہاں تک بہت زیادہ از خود نوٹس لینے والی بات پر ایکشن کا تصور ہے، تو یاد رکھیئے ہماری مملکت اور حکومت کو ایک خاص ٹولہ چلا رہا ہے۔ اس میں سٹاک ایکسچینج کے بروکرز ہیں، اس میں سرمایہ دار اور جاگیر دار بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فوج بھی ہے۔ ان لوگوں نے ہر ادارے پر قبضہ کر رکھا ہے، جب کوئی کسی شے پر قابض ہوتا ہے تو وہ اپنے اختیارات کی وجہ سے کرپٹ ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ایک ایسی رسک فری سوسائٹی چاہتے ہیں، جس میں انہیں کوئی چیلنج نہ کر سکے۔ بہر حال، بار نے انہیں چیلنج کیا ہے، انشاء اللہ ہم کامیاب ہوں گے۔

سوال: اعلیٰ عدلیہ میں چیف جسٹس صاحبان کو انتظامی اختیارات حاصل ہیں۔ ان کے حوالے سے کچھ شکایات کے خاتمے کے لیے ریفارمز کی ضرورت ہے آپ کس قسم کی ریفارمز چاہتے ہیں، کیا آپ (بار ایسوسی ایشنز) کی طرف سے کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں یا اپنی تجاویز اب

پیش کرنا چاہتے ہیں؟

منیر ملک: جی ہاں۔ ریفارمز کی ضرورت تو ہے۔ میں ریفارمز کے حق میں ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا کہ روسٹر کیا ہو، کون سے مقدمات کس جج کو بھیجے جائیں گے، یہ ایسا کام ہے کہ ٹھیک طریقے سے ہوسکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ جب کوئی وکیل سپریم کورٹ میں پریکٹس کرنا چاہتا ہے تو اسے مقدمات کی پیروی کے لیے سپریم کورٹ میں پیش ہونے کی اجازت دینے یا اجازت نہ دینے کا فیصلہ فردِ واحد نہیں کرتا۔ اس کے لیے باقاعدہ طریقہ کار ہے۔ مثلاً میں سندھ ہائی کورٹ سے ہوں اور سپریم کورٹ میں پیش ہونے کی اجازت چاہتا ہوں تو اس کے لیے سپریم کورٹ میں اپلائی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح پاکستان بار کونسل میں یہ معاملہ آتا ہے۔ میں اداروں کی بالادستی کے حق میں تو ہوں لیکن کسی قسم کی ڈکٹیٹر شپ کو قبول نہیں کرسکتا۔ چاہے وہ چیف جسٹس کی ڈکٹیٹر شپ ہو یا صدر جنرل پرویز مشرف کی آمریت ہو۔ میں دونوں کا مخالف ہوں۔ دیکھئے ناں، جب روسٹر بنتا ہے تو اس کو فائنل کرنے کے لیے سپریم کورٹ کے پانچ سینئر موسٹ جج صاحبان کو بیٹھنا چاہیے۔ وہ کیوں نہیں بیٹھتے؟ اگر وہ بیٹھتے ہیں اور کوئی متفقہ یا قابل قبول فیصلہ نہیں کرپاتے تو پھر وہ پانچوں جج صاحبان خود مقدمات سن لیا کریں۔

سوال: ایک اور سنگین مسئلہ عدلیہ کے حوالے سے بڑی اذیت کا باعث بنتا ہے، وہ یہ ہے کہ ججوں کی کمی ہمیشہ رہتی ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی کیا وجہ ہے، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لائق وکیل دستیاب نہیں ہوتے ہیں، حکومت کی طرف سے گڑبڑ ہوتی ہے یا پھر چیف جسٹس صاحبان اور حکومت میں اتفاق رائے نہیں ہوتا؟

منیر ملک: ممتاز شفیع صاحب! واقعی یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ کوئی شخص مقدمہ دائر کرتا ہے تو اسے پندرہ ہزار روپے تک کورٹ فیس کے طور پر جمع کروانا پڑتے ہیں۔ جج صاحبان اور بار ایسوسی ایشنز کی طرف سے ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے کہ عدلیہ کو مالی طور پر آزاد اور خوشحال بنایا جائے۔ عدلیہ پر بہت کم رقم خرچ کی جاتی ہے۔ جب تک ڈیمانڈ اور ضرورت کے مطابق فنڈز نہیں دیئے جائیں گے، عدلیہ اپاہج رہے گی۔ ہر ہاؤسنگ سوسائٹی میں فوجیوں کے لیے پلاٹ ہوتے ہیں، چاہے وہ جنگ جیت کر آئیں یا اپنے ہی لوگوں پر گولی چلائیں۔ آپ ذرا جائزہ تو لیں کہ کون سے ایسے ادارے ہیں جن کو حکمرانوں نے مالی طور پر مضبوط اور مستحکم بنایا ہے۔ آپ ججوں کی کمی کی بات کرتے ہیں تو آپ یہ بھی دیکھیں کہ ایک کامیاب اور مایہ ناز وکیل جب وہ پریکٹس چھوڑ کر جج بنتا ہے تو اس کی آمدن ایک چوتھائی رہ جاتی ہے پھر جج اس وقت بنتا ہے، جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو مالی ضروریات اتنی ہوجاتی ہیں کہ تنخواہ وغیرہ میں گزارہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے بعض اوقات بعض جج کرپشن کی طرف چلے جاتے ہیں۔ انہیں بھی بہرحال اپنا گھر اور خاندان چلانا ہوتا ہے۔

سوال: منیر صاحب! آپ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے چاہتے ہیں کہ ججوں کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے اور ان کی مراعات بڑھادی جائیں؟

منیر ملک: میں یہ مسئلہ اس طرح حل کرنا چاہتا ہوں کہ جب ایک جمہوری حکومت آئے تو وہ آئین میں یہ بات شامل کرے کہ ہر سال عدلیہ کا علیحدہ اور خودمختار بجٹ تیار کیا جائے۔ دیکھیں آپ ججوں کو وہ مراعات کیوں نہیں دیتے، جو دوسرے اداروں کے سربراہوں کو حاصل ہیں۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری پر الزام بھی ہے کہ وہ مرسیڈیز گاڑی میں سفر کرنے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ اب حالت یہ ہے کہ فوج کا میجر جنرل بھی مرسیڈیز گاڑی استعمال کرتا ہے تو چیف جسٹس اگر اس گاڑی میں بیٹھ جائے تو کیا ہوجائے گا۔ ویسے ان دونوں کے عہدوں میں کتنا فرق ہے، آپ اس کو بھی ذہن میں رکھیں۔ ہمیں اپنے سسٹم میں ذرا بیلنس تو لانا پڑے گا۔

سوال: جج صاحبان کے حوالے سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ماضی میں تو کسی جج نے اتنی سوشل لائف نہیں گزاری جتنی آج جج صاحبان گزار رہے ہیں پہلے تو جج صاحبان کی زندگی عدلیہ تک ہی محدود رہا کرتی تھی۔ جج خاص طور پر حکومتی تقریبات میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح وہ عام لوگوں سے بھی دور رہتے تھے جبکہ اب تو جج صاحبان ایسا نہیں کرتے۔ کیا آپ ماضی کی طرح ججوں کی محدود زندگی

کے حق میں ہیں یا حکومتی اور سماجی تقریبات میں ان کی شرکت کو مناسب سمجھتے ہیں؟

منیر ملک: عام لوگوں میں گھل مل کر زندگی بسر کرنا اور سرکاری ظہرانے اور عشائیے قبول کرنا غلط ہے۔ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ سیزر کی بیوی تک کسی کی رسائی نہیں ہونی چاہیے یہ دعوتیں وغیرہ کھانا اور ہر جگہ چلے جانا درست نہیں ہے۔

سوال: کبھی کبھی ججوں کی طرف سے وکلاء کے ساتھ ناراضگی کا اظہار کر دیا جاتا ہے اور کبھی وکلاء کسی معاملے میں روایت سے ہٹ کر جج کے سامنے ریمارکس دے دیتے ہیں یا کبھی ردعمل ظاہر کر دیتے ہیں تو بنچ اور بار کے رشتے میں ایسی باتیں نقصان دہ نہیں ہیں۔ ان کو ختم کرنے یا روکنے کی کوشش نہیں ہونی چاہیے؟

منیر ملک: (ہنستے ہوئے) بنچ اور بار ایک خاندان کا حصہ ہیں۔ ان کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ آپ یہ بتایئے کہ کبھی میاں اور بیوی میں جھگڑا نہیں ہوتا ہے۔ ان دونوں کا رشتہ کتنا گہرا اور پیارا ہوتا ہے۔ پھر اگر کبھی کسی جج اور وکیل میں جملے بازی ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ ویسے اب تو ہم ایک ایسی تحریک اور ایک ایسے مشن کے لیے کام کر رہے ہیں کہ یہ ایشو بعد میں آنا چاہیے۔ اگر افتخار چودھری مجھے ڈانٹ دیں یا کبھی میں انہیں جواب دے دوں تو ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اسے سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔ اس وقت تو عدلیہ کی آزادی اور خودمختاری کو بحال کرنے کی جدوجہد میں ہم دونوں (بنچ اور بار) مصروف ہیں۔

سوال: منیر صاحب! یہ بتایئے کہ آپ فیڈرل شریعت کورٹ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کیا اس کی افادیت اب بھی ہے؟

منیر ملک: دیکھیے جی علی احمد کرد صاحب، حامد خان، اعتزاز احسن، قاضی انور، میں اور دوسرے دوست لبرل ڈیموکریٹس ہیں ہمارا تو یہ موقف ہے کہ پاکستان ایک ترقی پسند قوم ہے۔ ہمارے سامنے قائداعظمؒ کی ایک تقریر ہے کہ مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس، میں اس سوال کے جواب میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں۔

سوال: آپ اس پیشے میں کس وکیل سے زیادہ متاثر ہوئے؟

منیر ملک: ایک مشکل سوال ہے اگر آج کے دور میں سے انتخاب کیا جائے تو میں کہوں گا کہ فخر الدین جی ابراہیم سے میں بہت زیادہ متاثر ہوں۔ ماضی میں، میں میاں محمود علی قصوری صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ وہ پیپلز پارٹی کے اولین دور میں بھٹو صاحب کے ساتھی تھے اور جب بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا تو انہیں وفاقی وزیر قانون بنایا گیا تھا۔

سوال: جو وکلاء ذرا خطرناک اور حساس قسم کے مقدمات لڑتے ہیں تو انہیں دھمکیاں وغیرہ ملتی ہیں اور ان کو خطرات کا احساس دلا کر روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیا آپ کو بھی اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

منیر ملک: جیسا کہ آپ نے بتا دیا کہ دھمکیاں ملتی ہیں۔ یہ درست ہے اور مجھے بھی فون پر بڑی دھمکیاں ملتی ہیں۔ کئی بار مجھے کہا گیا کہ کراچی سے باہر نکلنے سے پہلے صدقہ دے دینا۔ میں تو اب ان باتوں کا عادی ہو گیا ہوں۔ ایسی دھمکیاں تو زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔

سوال: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وکلاء کو اپنے مقدمات کی تیاری کے لیے بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے اور دن رات قانون کی کتابوں کا کیڑا اور عدالتوں کا مسافر بننا پڑتا ہے۔ گھر والوں اور دوستوں کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کا کیا تجربہ اور مشاہدہ ہے؟

منیر ملک: ایک وکیل کی زندگی اتنی مشکل نہیں، جتنی ایک ریڑھی والے کی ہے۔ ریڑھی والا ہم وکیلوں سے کم از کم تین گھنٹے پہلے اٹھتا ہے اور ریڑھی تیار کر کے ریگل چوک پہنچتا ہے تو پولیس والا اس سے بھتہ مانگتا ہے۔ پھر دن بھر وہ ناجائز تجاوزات کے خلاف کارروائی کرنے والوں سے بچنے کے لیے دوڑتا بھاگتا رہتا ہے۔ شام تک وہ مسلسل کام کرتا رہتا ہے۔ اس کے بعد کبھی اسے بس والا اور کبھی ویگن والا یا کار والا راستے کی رکاوٹ سمجھ کر برا بھلا کہتا ہے۔ اتنی محنت اور مشقت اور سولہ یا اٹھارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد وہ ایک سو یا دو سو روپے نہ کمائے تو اس کے بچوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک وکیل کی زندگی تو اس ریڑھی والے کے مقابلے میں ہزار گنا بہتر ہے۔

سوال: منیر صاحب! کبھی آپ گرفتار ہوئے اور جیل بھی گئے؟

منیر ملک: جی ہاں۔ ہم جیسے لوگوں کو جدوجہد کرتے ہوئے گرفتار ہونے اور جیل میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ کرد صاحب عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور ویسے بھی طویل عرصے سے جدوجہد کر رہے ہیں تو میرا خیال ہے کہ جیل میں رہ کر انہوں نے کوئی اضافی ڈگری ضرور لی ہوگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں 1980ء میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں جیل گیا تھا۔ پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ ''ذہنی جیل'' بھی کافی ہے بلکہ پچھلے بیس سال سے تو اسی جیل کی اذیت برداشت کر رہا ہوں۔

سوال: آپ نے کبھی عملی سیاست میں بھی حصہ لیا؟

منیر ملک: جی نہیں۔ مجھے اس سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

سوال: کیا وجہ بتانا پسند کریں گے؟

منیر ملک: دیکھیں، میں ایک پروفیشنل وکیل ہوں۔ میری پارٹی تو وکلاء پارٹی ہے۔ اس لیے عملی سیاست میں نہیں آیا۔

سوال: یہ بتایئے کہ چیف جسٹس محمد افتخار چودھری سے آپ کا اکثر رابطہ رہتا تھا؟

منیر ملک: جی نہیں۔ کوئی خاص رابطہ نہیں تھا۔ شاید آپ اس موومنٹ کے شروع ہونے کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دوں کہ انصاف کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ایک پہیہ اگر خراب ہو جائے، یا کام کرنے میں دشواری ہو تو دوسرے پہیے کا فرض ہے کہ وہ اس کا ساتھ دے۔ میرا افتخار چودھری سے ذاتی طور پر کوئی تعلق نہ پہلے تھا اور نہ ہی ذاتی طور پر اب بھی کوئی تعلق ہے۔ ایک ادارے کی آزادی اور بالادستی پر حملہ ہوا تو ہم ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ چودھری صاحب سے اس واقعہ میں میرا رابطہ اسی طرح ہوا کہ جس روز انہیں پولیس والوں نے زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کی، ان کے سر کے بال نوچے گئے اور ان کا کوٹ پھاڑا گیا تو انہوں نے انتظامیہ سے یہ کہا کہ میں سپریم کورٹ میں تب جاؤں گا، اگر صدر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن مجھے لینے کے لیے آئے گا۔ چنانچہ اس وجہ سے میری ان کی ملاقات ہوئی۔ پھر میں انہیں لینے کے لیے بلوچستان ہاؤس گیا۔ اکٹھے گاڑی میں آئے اور اس دوران ہم نے یہ طے کیا کہ اس معاملے میں حکمرانوں سے کوئی کمپرومائز نہیں ہوگا۔ جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔ بار اور بنچ ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اگر ایک پہیہ پنکچر ہوتا ہے تو دوسرے پہیے کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ گاڑی کو کسی نہ کسی طرح پنکچر لگانے والے تک پہنچا دے۔ چنانچہ ہم یہی کام کر رہے ہیں۔

سوال: جب آپ کی چیف جسٹس سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے سب سے پہلے آپ سے کیا کہا تھا؟

منیر ملک: تھینک یو......منیر بھائی! آپ کے آنے کا شکریہ!

(Thank you Munir Bhai for comming

سوال: صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف ریفرنس جس طرح بھیجا گیا، اسے دیکھتے ہوئے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وکلاء اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ شدید ردعمل کا اظہار کریں گے؟ اور کوئی تحریک شروع ہو جائے گی؟

منیر ملک: دیکھیں، یہ بہت اچھی بات ہے اور پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ پاکستان بار کونسل اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی قیادت ہم خیال لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمارا متفقہ فیصلہ اور لائحہ عمل ہے۔ اگر مجھے چھوڑ کر آپ کرد صاحب، اعتزاز یا کسی دوسرے ساتھی کو انٹرویو کریں گے تو ہمارے خیالات بہت زیادہ ملتے اور ایک جیسے ہوں گے۔

سوال: آپ لوگوں پر کسی جانب سے کوئی دباؤ آیا؟

منیر ملک: جی نہیں۔ دباؤ اسی پر آتا ہے جو بکنے کے لیے تیار ہو، ہمارے بارے میں حکمران جانتے ہیں کہ ہم بکنے والے نہیں ہیں۔ میرا مؤقف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جو مطالبات ہماری طرف سے کیے گئے ہیں، ان پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

سوال: آپ کی بڑی بہن سعیدہ ملک صاحبہ سندھ حکومت میں شامل ہیں۔ آپ ان کے بارے میں بتائیں گے۔

منیر ملک: ہاں۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار ملنے کی کوشش کی ہے لیکن میں ان سے نہیں ملا۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ جب سے یہ تحریک شروع ہوئی ہے۔ اس کے بعد سے میں نے ان سے کوئی ملاقات نہیں کی اور نہ ہی میری ان سے فون پر کوئی گفتگو ہوئی۔ وہ میری بڑی بہن ہیں بلکہ بڑی چہیتی بہن ہیں۔ میں نے انہیں پیغام بھیجا کہ آپا! ابھی ملاقات نہیں ہو سکتی میں اس تحریک کے ختم ہونے کے بعد آپ کو ملوں گا"۔ میں آپ کو اور سب کو بتا دوں کہ یہ مسئلہ بہن اور بھائی کا نہیں ہے۔ میں نے شکل دکھانا ہے علی احمد کرد کو، حامد خان کو اور دوسرے ساتھیوں کو اور میں بہن بھائی کا مسئلہ بیچ میں نہیں لانا چاہتا۔ ہمارے بچوں کے مستقبل کا سوال ہے۔ میری اگر ان سے فون پر بات ہوئی تو کہوں گا کہ آپا! وزارت سے استعفیٰ دے دو۔

سوال: منیر ملک صاحب! وکلاء کی تحریک چل رہی ہے اور ہر بار جب یوم احتجاج منایا جاتا ہے، خصوصاً اسلام آباد میں احتجاج کے دوران سیاسی جماعتیں بھی اپنے کارکنوں کو اس میں شامل کرتی ہیں، کیا سیاسی جماعتوں کو اس احتجاج میں شامل ہونا چاہیے اور کس حد تک ہونا چاہیے۔

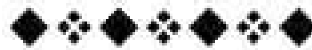
منیر ملک: کیا اس بات پر دو آراء ہو سکتی ہیں کہ صدر جنرل پرویز مشرف کا الیکشن غیر قانونی اور غیر آئینی ہے۔ ہر وہ شخص جو باضمیر ہے، اسے آواز بلند کرنا پڑے گا۔ میں، یا کرد صاحب اپنا پلیٹ فارم کسی سیاسی پارٹی کو ہائی جیک کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ سیاسی جماعتوں والے ضرور آئیں، ان کا بھی حق ہے۔ ان کا بھی فرض ہے۔ یہ لوگ سپریم کورٹ کے باہر آئیں۔ وکلاء کی تحریک اپنی جگہ ہے۔ وکلاء اپنی تحریک چلا رہے ہیں، سیاسی جماعتوں والے بھی اپنی جگہ اپنے مقام سے تحریک چلائیں۔ ہم تو خود چاہتے ہیں کہ وہ آگے آئیں، لیکن ہمارے ایجنڈے پر آئیں۔ وہ لوگ اپنے حلقوں میں آئیں۔ موچی گیٹ میں آئیں، نشتر پارک میں آئیں، لیاقت باغ میں آئیں۔ پریڈ گراؤنڈ میں آئیں اور وہاں مورچے لگائیں۔

سوال: کیا آپ کو یہ خطرہ ہے کہ وکلاء کی تحریک ہائی جیک بھی ہو سکتی ہے؟

منیر ملک: نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جب تک منیر ملک اور علی احمد کرد صاحب اور ہمارے دوسرے دوست ہیں، وکلاء کی تحریک ہائی جیک نہیں ہو سکتی۔

سوال: یہ بتائیے کہ پاکستان بننے کے بعد جتنی بھی تحریکیں چلی ہیں، ان میں سے یہ تحریک کس قدر اہمیت کی حامل ہے؟

منیر ملک: یہ تحریک پاکستان کی تحریکوں میں سنہرے حروف سے درج ہوگی۔ یہ تحریک خیبر سے کراچی تک چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی بڑی شان سے چل رہی ہے۔



جسٹس (ر) رشید اے رضوی کا انٹرویو

جسٹس (ر) رشید اے رضوی 18 دسمبر 1947 کو بمبئی میں پیدا ہوئے اور 1957 میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے بی اے (آنرز) اور ایم اے (معاشیات) کیا، ایل ایل بی کے امتحان میں فرسٹ کلاس سیکنڈ پوزیشن حاصل کی۔ وہ 1973 میں وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ مؤقر قانونی جرائد میں ان کے سینکڑوں فیصلے، مضامین اور رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ 8 اپریل 1995 سے 26 جنوری 2000 تک سندھ ہائی کورٹ کے جج رہے اور پھر ایل ایف او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کیا اور مستعفی ہو گئے۔ کئی بار کراچی بار ایسوسی ایشن اور سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن میں صدر اور دوسرے عہدوں پر فائز رہے۔ سندھ بار کونسل اور پاکستان بار کونسل کے وائس چیئر مین رہے۔ ان دنوں وہ پاکستان بار کونسل کی ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن ہیں، جو وکلاء کی موجودہ تحریک کی رہنمائی کر رہی ہے۔ عدلیہ میں انہیں ایک ممتاز قانون دان کی حیثیت حاصل ہے۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار چودھری کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں صدر مملکت کی طرف سے دائر ہونے والے ریفرنس کے خلاف ملک بھر کے وکلاء نے جو محاذ بنایا ہے، اور جس طرح تمام سیاسی جماعتیں اس مسئلے پر تقریباً یکساں مؤقف رکھتی ہیں۔ ہڑتالیں، احتجاج اور مظاہرے جاری ہیں، اس سے ملک میں ایسی فضا تخلیق ہوئی ہے، جو موجودہ حکومت کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے۔ چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کرنے کا پس منظر کیا ہے، اس حوالے سے صحیح آئینی صورتِ حال کیا ہے، اس بحران کے ملک پر کیا اثرات مرتب ہوں گے، اس سارے منظر نامے کے حوالے سے ہم نے ممتاز قانون داں جسٹس (ر) رشید اے رضوی سے ملاقات کی جو وکلاء کی جاری تحریک میں صفِ اول میں شامل ہیں۔ جسٹس (ر) رشید اے رضوی نے اس سارے تناظر میں جو گفتگو کی، وہ قارئین کے استفادے اور دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہے۔

سوال: سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس کی آئینی حیثیت کیا ہے اور آپکے نزدیک ریفرنس کا پس منظر کیا ہے؟

رشید رضوی: آئین کے آرٹیکل 209 کے تحت صدر سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے کسی بھی جج کے خلاف ریفرنس بھیج سکتا ہے۔ 2002ء میں آئین میں 17 ویں ترمیم ہوئی، جس کے بعد اب کوئی عام آدمی بھی کسی بھی جج کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں رجوع کر سکتا ہے اور سپریم جوڈیشل کونسل کو یہ اختیار بھی حاصل ہو گیا ہے کہ کسی بھی جج کے خلاف سوموٹو ایکشن لے سکتی ہے۔ سترہویں ترمیم سے پہلے یہ اختیار صرف صدر مملکت کو حاصل تھا۔ سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل بھی انہوں نے آرٹیکل 209 میں ظاہر کی ہے۔ اس سارے سینیاریو کا آغاز 15 فروری سے شروع ہوتا ہے، جب سپریم کورٹ کے ایک وکیل مسٹر نعیم بخاری نے چیف جسٹس افتخار چودھری کے خلاف ایک کھلا خط لکھا، جو انٹرنیٹ پر بھی جاری کیا تھا، میرے پاس بھی وہ خط آیا ہے۔ اس خط میں چیف جسٹس پر جو الزامات لگائے گئے ہیں، وہ من وعن وہی ہیں جو چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس میں موجود ہیں۔ اس صورت حال میں کچھ لوگوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ کسی اتھارٹی نے نعیم بخاری سے یہ خط لکھوایا ہے۔ اس توہین آمیز خط پر مشہور پٹیشنر مولوی اقبال حیدر نے توہین عدالت کی ایک پٹیشن سپریم کورٹ میں داخل کی تھی۔ جس کی 8 مارچ کو سماعت ہونی تھی، مگر مولوی اقبال حیدر نے بوجوہ اپنی

درخواست واپس لے لی۔ مگر چیف جسٹس نے کمال شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پٹیشن واپس لینے پر خاموشی اختیار کی، حالانکہ قانون یہ ہے کہ جب عدالت عظمیٰ یا کسی بھی عدالت میں توہین عدالت کی پٹیشن دائر ہو جائے تو عدالت اسے عدم پیروی یا واپس لینے پر خارج نہیں کرتی، کیونکہ توہین عدالت کی پٹیشن دائر کرنے والے کا کام صرف عدالت کو مطلع کرنا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کے کہنے پر مولوی اقبال حیدر نے پٹیشن واپس لی تھی، اور اس کے اگلے ہی دن چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس آ گیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مولوی اقبال حیدر کے خفیہ ایجنسیوں سے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ وہ پرویز مشرف حمایت تحریک کے بانی بھی ہیں۔ انہیں سپریم کورٹ میں بیٹھنے کے لیے باقاعدہ ایک کمرہ دیا گیا ہے۔ جب وہ سفر کرتے ہیں تو انہیں مکمل پروٹوکول ملتا ہے۔ مولوی اقبال حیدر ایک Habitual Petitioner ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم قانونی زبان میں 'پروگونو پبلیکو' کہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو پبلک کاز کے لیے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے مفادِ عامہ کے تحت اچھی پٹیشنز بھی دائر کی ہوں گی لیکن اس بار 8 مارچ کو ان کا پٹیشن واپس لینا اور 9 مارچ کو ریفرنس آنا ایسے معاملات ہیں، جنہیں الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

سوال: چیف جسٹس نے 8 مارچ کو توہین عدالت کی پٹیشن واپس لینے پر خاموشی اختیار کی، کیا آپ کے خیال میں ان پر اس وقت تک دباؤ آ چکا تھا؟

رشید رضوی: نہیں، میرے خیال میں دباؤ تو نہیں آیا تھا، لیکن اگر وہ چار پانچ ججوں کی ایک بنچ بنا دیتے کہ اس معاملے کی تحقیق کی جائے تو پھر میرے خیال میں 9 مارچ کو ان کے خلاف ریفرنس آنا مشکل ہو جاتا، کیوں کہ یہ سارے معاملات عدالتِ عظمیٰ میں زیر سماعت آ جاتے اور اس صورت حال میں یہ بڑا نزاعی معاملہ ہو جاتا کہ ریفرنس دائر ہو سکتا ہے یا نہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں وہ اتھارٹیز کون ہیں، جنہوں نے نعیم بخاری سے خط لکھوایا؟ ان اتھارٹیز کو آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ ہم آپ کے منہ سے سننا چاہتے ہیں؟

رشید رضوی: ظاہر ہے، ایجنسیاں جو ماورائے قانون اقدامات کرنے میں آزاد ہیں۔ ایجنسیوں ہی نے نعیم بخاری سے چیف جسٹس کے خلاف کھلا خط لکھوایا۔

سوال: کیا نعیم بخاری ایجنسیوں کے آلہ کار ہیں؟

رشید رضوی: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انہوں نے خط میں جو نکات اٹھائے وہی نکات ریفرنس میں شامل ہیں تو انہیں کیسے پتا چلا کہ ان بنیادوں پر ریفرنس بنایا جا رہا ہے، چیف جسٹس کے خلاف مواد جمع ہو رہا ہے۔ 15 فروری کو انہوں نے جو خط لکھا، وہی سب لب لباب اور وہی زبان ریفرنس کی ہے اور 9 مارچ کو جب ریفرنس آیا تو اسکے متعلق کابینہ کے بہت سے وزراء کو بھی نہیں پتہ تھا۔

سوال: صدر مملکت کے مطابق انہوں نے وزیر اعظم کے مشورے سے یا ان کے کہنے پر ریفرنس بھیجا؟

رشید رضوی: حکومت نے بعد میں یہ ڈیفنس اختیار کیا ہے۔ 10 مارچ کو جب شدید عوامی ردعمل سامنے آیا تو وزیر قانون وصی ظفر اور وزیر اطلاعات ونشریات محمد علی درانی نے بتایا کہ چیف جسٹس کو صدر صاحب نے بلایا تھا، سوال و جواب میں دیر ہو گئی اور چونکہ چیف جسٹس سوالات کے تسلی بخش جوابات نہیں دے سکے، اس لیے صدر نے وزیر اعظم کے مشورے سے ان کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر کر دیا، حالانکہ سربراہ مملکت خواہ چیف آف آرمی سٹاف ہو یا منتخب صدر، اسے یہ اختیار ہی نہیں ہے کہ چیف جسٹس تو کجا، ہائی کورٹ کے بھی کسی جج سے پوچھ گچھ کرے۔ سربراہ مملکت صرف کسی جج کے خلاف وزیر اعظم کے مشورے سے ریفرنس بھیج سکتا ہے، اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ چیف جسٹس کو آرمی ہاؤس میں پانچ گھنٹے بٹھایا جائے اور ان کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا جائے۔ سربراہ مملکت کو چیف جسٹس کو معطل کرنے، غیر فعال کرنے یا چھٹیوں پر بھیجنے کے اختیارات حاصل نہیں ہیں، جب کہ یہاں تو چیف جسٹس کو

باقاعدہ نظر بند کیا گیا۔ 9 مارچ کو ریفرنس کے بعد انہیں ان کے چیمبر میں جانے سے روکا گیا، جو بالکل غیر قانونی ہے۔ ریفرنس میں بھی لکھا گیا ہے کہ چیف جسٹس کو Restrain کیا گیا ہے یعنی انہیں کام کرنے سے روکا گیا ہے، غیر فعال کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی ہے۔

سوال: کیا آئین کے تحت چیف جسٹس کو غیر فعال کیا جا سکتا ہے؟

رشید رضوی: بالکل نہیں۔ آئین میں ایسی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں، جس جج کے خلاف ریفرنس آ جائے، وہ جوڈیشل پریکٹس نہیں کر سکتا، اسے باقی سارے اختیارات اور مراعات حاصل ہوتی ہیں، مگر یہاں تو ریفرنس دائر کرنے کے بعد گویا سزا بھی سنا دی گئی۔ چیف جسٹس کا دفتر سیل کر دیا گیا، ان کے مکان پر پہرا بٹھا دیا گیا، ٹیلی فون کاٹ دیئے گئے، ان سے ان کے موبائل فون لے لئے گئے۔ میں، منیر ملک، علی احمد اور تقریباً 40 وکلاء ساتھیوں کے ساتھ چیف جسٹس کے دروازے پر شام ساڑھے چار بجے سے رات ساڑھے دس بجے تک کھڑے رہے مگر ہمیں ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ سارے اقدامات حکومت کی بدنیتی ظاہر کرتے ہیں کہ معاملہ صرف ریفرنس کا نہیں، بلکہ کچھ اور ہے۔

سوال: ریفرنس میں چیف جسٹس پر جو الزامات لگائے گئے ہیں، ان کے خلاف ریفرنس صرف ان ہی وجوہات کی بناء پر بھیجا گیا ہے یا اصل وجوہات کچھ اور بھی ہیں؟

رشید رضوی: بالکل۔ یہ اصل معاملہ ہے، جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا۔ بات یہ ہے کہ عدلیہ ریاست کا اہم ترین ستون ہے اور حکومت صرف ایسی وکٹ چاہتی ہے جس پر وہ اپنی مرضی سے کھیل سکے، حکومت کسی بھی طرف سے کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہے، جب کہ چیف جسٹس افتخار چودھری نے سٹیل ملز اور حسبہ کیس کے کیسوں میں ایسے فیصلے دیئے تھے جو حکومت کو پسند نہیں آئے تھے۔ وہ گم شدہ لوگوں کے معاملے پر بھی ایکشن لے رہے تھے۔ حکومت کو خطرہ تھا کہ وہ کسی پاپولر سٹینڈ کی طرف نہ چلے جائیں، جب کہ جنرل پرویز مشرف ان ہی اسمبلیوں سے دوبارہ باوردی صدر منتخب ہونا چاہتے ہیں، کیوں کہ انہیں یقین ہے کہ اگلے الیکشن میں ان کے حامی اسمبلیوں میں نہیں پہنچ سکیں گے، اب یہ کتنی بڑی زیادتی کہ آپ اگلی اسمبلیوں سے صدر منتخب کرنے کا حق چھیننا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف کسی نجی محفل میں افتخار چودھری صاحب نے کہہ دیا تھا کہ وکلاء اور سیاست دانوں کی جو یہ رائے ہے کہ صدر وردی میں نہیں ہو سکتا، اپنے اندر وزن رکھتی ہے۔ لہٰذا اس سارے سیاق و سباق سے صاف نظر آتا ہے کہ چیف جسٹس کو گھر بٹھانے کا اصل مقصد کیا ہے۔

سوال: چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس صدر مملکت نے بھیجا ہے، جن کی اپنی پوزیشن متنازع ہے، کیوں کہ بہرحال باوردی صدر ہیں، جس کی آئین کی رو سے وہ خود بھی Justification نہیں دے سکے ہیں، کیا انہیں یہ ریفرنس دائر کرنے کا حق یا اختیار حاصل تھا؟

رشید رضوی: جی ہاں، صدر مملکت نے چیف جسٹس پر Misconduct کے الزامات لگائے ہیں، مگر خود انہوں نے جو Misconducts کیے ہیں، اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔ وہ ایک جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار میں آئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ فلاں تاریخ تک وردی اتار دیں گے، نہیں اتاری۔ انہوں نے شکوہ کیا کہ مجھے چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے سے جس طرح برطرف کرنے کی کوشش کی گئی، اس طرح تو کوئی عام کلرک کو بھی نہیں نکالتا لیکن خود انہوں نے کتنے لوگوں کو برطرف کیا، نوکریوں سے نکالا، چیف جسٹس کے ساتھ انہوں نے کیا کیا۔ ان کے Misconducts کی فہرست بہت طویل ہے۔

سوال: کیسی سیاست دان نے اسے عدلیہ اور فوج کی لڑائی قرار دیا ہے، آپ کیا کہتے ہیں؟

رشید رضوی: جی ہاں، چودھری شجاعت اس وقت نیویارک میں تھے، ان سے کسی نے پوچھا کہ چیف جسٹس کے خلاف جو ریفرنس بھیجا گیا ہے، یہ کیا

معاملہ ہے تو انہوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ یہ عدلیہ اور فوج کی لڑائی ہے۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا کہ نو مارچ کے دن کئی وزراء کو بھی علم نہیں تھا کہ چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیا جا رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت میں جو Civil Fabric ہے، اسے معاملات سے دور رکھا جا رہا ہے، اس ملک پر در پردہ ایجنسیاں ہی حکومت کر رہی ہیں۔ اب آپ دیکھ لیں کہ سول سوسائٹی تار تار ہو گئی ہے۔ جس ادارے میں بھی جائیں وہاں آپ کو فوجی بیٹھا ہوا ملے گا تو اس حکومت کے بھی سیاہ کارنامے کچھ کم نہیں ہیں۔

سوال: کیا آپ کو یعنی وکلاء برادری کو سپریم جوڈیشل کونسل پر اعتماد ہے، وہ جو بھی فیصلہ دے آپ کو قبول ہوگا؟

رشید رضوی: اس وقت جو سپریم جوڈیشل کونسل تشکیل دی گئی ہے، آرٹیکل 209 کے تحت ہی تشکیل دی گئی ہے۔ سوال کونسل پر اعتماد یا عدم اعتماد کا نہیں ہے، ہمارا کہنا ہے کہ چیف جسٹس کی موجودگی میں قائم مقام چیف جسٹس مقرر نہیں ہو سکتا۔ یہاں دو قائم مقام چیف جسٹس بنائے گئے۔

سوال: کیا جسٹس جاوید اقبال کو قائم مقام چیف جسٹس بنانا درست تھا؟

رشید رضوی: بالکل غلط تھا۔ کیا جسٹس بھگوان داس کے ملک سے باہر جانے کا انتظار تھا۔ آپ نو مارچ کے سارے Episode کو دیکھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چیف جسٹس اپنی مرضی سے صدر سے ملنے گئے تھے، اگر وہ اپنی مرضی سے گئے تو انہیں پانچ گھنٹے بٹھا کر کیوں رکھا گیا۔ پھر ان کے خلاف ریفرنس دائر کرتے ہی آدھے گھنٹے کے اندر جسٹس جاوید اقبال کو قائم مقام چیف جسٹس بنا کر ان سے حلف بھی اٹھوا لیا گیا، اور سپریم جوڈیشل کونسل بھی تشکیل دے دی گئی۔ تو بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ چیف جسٹس کو بلوایا گیا تھا، بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔

سوال: اس سارے سینیاریو میں آپ سپریم کورٹ کے دوسرے جج صاحبان کا کیا کردار دیکھ رہے ہیں؟

رشید رضوی: میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ وقت جب جج صاحبان کو عدلیہ کی آزادی اور Rule of Law کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ ورنہ میں نے ایک ٹی وی ٹاک میں بھی کہا تھا کہ اگر اب عدلیہ نے اپنا کردار ادا نہیں کیا تو ہمارے ملک کا یہ اہم ستون بہت، بہت، بہت زیادہ پیچھے چلا جائے گا۔ آپ بھارت میں دیکھیں، وہاں عدلیہ نے جمہوریت کو تقویت دینے میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے، جب کہ ہمارے ہاں عدلیہ نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز کو حکومت کرنے کے جواز فراہم کیے ہیں، اب عدلیہ کو اپنے منہ پر لگی کالک صاف کرنا ہوگی۔

سوال: آپ کی توقعات کیا ہیں؟

رشید رضوی: میری تو توقع ہے کہ سپریم کورٹ ثابت کرے گی کہ عدلیہ آزاد ہے۔

سوال: اس سارے سینیاریو میں جسٹس بھگوان داس بڑا اہم کردار بن گئے ہیں؟

رشید رضوی: ہاں، مجھے بھی ایک میل موصول ہوئی تھی، جس میں لکھا تھا کہ "اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سولہ کروڑ عوام انصاف کے لیے بھگوان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔" میں انہیں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ ایک Independent جج ہیں۔ وہ پریشر میں نہیں آتے۔ مجھے توقع ہے کہ وہ قانون کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

سوال: فرض کریں کہ سپریم جوڈیشل کونسل چیف جسٹس افتخار چودھری کو انکے عہدے پر بحال کر دیتی ہے، تو پھر مستقبل کا کیا منظر نامہ بنے گا؟

رشید رضوی: تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ جنرل پرویز مشرف کو استعفیٰ دینا ہوگا۔ اگر سپریم جوڈیشل کونسل یہ فیصلہ دے کہ چیف جسٹس پر لگائے گئے الزامات غلط ہیں تو پھر ان کے پاس اقتدار میں رہنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں رہے گا۔

سوال: لیکن ہمارے حکمرانوں کا یہ وطیرہ نہیں ہے، وزیر اعلیٰ سندھ نے بھی ایک ٹی وی پروگرام میں یہ کہا ہے کہ اگر فیصلہ حکومت کے خلاف بھی آیا تو بھی وہ لوگ استعفیٰ نہیں دیں گے، اپوزیشن خوش فہمی میں نہ رہے؟

رشید رضوی: اس ملک کی سڑکوں اور گلیوں میں ایوب خان اور ضیاء الحق کے خلاف لگائے جانے والے نعروں کی گونج ابھی باقی ہے۔ اگر موجودہ حکمرانوں نے ماضی سے کوئی سبق نہیں لیا، اور ملک کو نقصان پہنچا کر اقتدار سے چمٹے رہے تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ فوج کے دامن پر سانحۂ مشرقی پاکستان کے خون کے چھینٹے ہیں، جو کبھی صاف نہیں ہو سکتے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔

سوال: کیا کوئی درمیانی راستہ ہے جس پر چل کر چیف جسٹس بحال ہو جائیں اور حکومت کی سبکی نہ ہو۔ کہا جا رہا ہے کہ چیف جسٹس ہونے کے بعد از خود رضا کارانہ مستعفی ہو سکتے ہیں؟

رشید رضوی: میرے چیف جسٹس افتخار چودھری کے وکلاء سے بڑے قریبی روابط ہیں، ایسی کوئی بات میں نے نہیں سنی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی حکومت ریفرنس واپس لے لے تو عوام شاید اسے غلطی سمجھ کر نظر انداز کر دیں لیکن اگر سپریم جوڈیشل کونسل کا فیصلہ چیف جسٹس کے حق میں آ گیا تو پھر یہ لوگ ملک ہی نہیں بیرون ملک بھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

سوال: کیا ماضی میں اس طرح کی کوئی نظیر نہیں ملتی جیسی صورت حال جسٹس افتخاری چودھری کو درپیش ہے؟

رشید رضوی: فوج داری کیس میں ملوث ایک عام ملزم کے ساتھ بھی بدسلوکی کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ قانون میں ہے کہ جب تک ملزم پر لگایا گیا الزام عدالت میں ثابت نہ ہو جائے، اسے بے گناہ تصور کیا جائے، لیکن یہاں تو چیف جسٹس کے خلاف گو یا ایف آئی آر درج ہوتے ہیں انہیں سزا بھی سنا دی گئی ہے۔ یہ صرف اور صرف حکومت کی بدنیتی ہے۔

سوال: نعیم بخاری نے اپنے خط میں جو الزامات لگائے ہیں، ان سے چیف جسٹس صاحب نے انکار بھی نہیں کیا؟

رشید رضوی: جی نہیں جناب۔ چونکہ سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی ان کیمرہ چل رہی ہے اس لیے اس پر بات نہیں ہو سکتی۔ تاہم بعض اخبارات میں آ چکا ہے کہ افتخار چودھری صاحب نے کونسل میں شامل دو ججز پر شدید اعتراض کیا ہے، ان میں ایک لاہور ہائی کورٹ کے جج ہیں، جن کے خلاف تین ریفرنسز دائر ہیں، ان پر سنگین الزامات لگائے گئے ہیں، مگر ان ریفرنس کی سماعت آج تک نہیں ہوئی۔

سوال: کیا ان کیمرہ پروسیڈنگ قانون کے مطابق ہے؟

رشید رضوی: انہیں یہ اختیار تو حاصل ہے لیکن جب چیف جسٹس افتخار چودھری خود کہہ رہے ہیں کہ ان کا پبلک ٹرائل کیا جائے تو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ آپ دیکھیں نا، جب جسٹس سجاد علی شاہ کے معاملے میں نو ججوں نے یہ فیصلہ دیا کہ چیف جسٹس کا اپائنٹمنٹ اور Access to Chief Justice عام آدمی کا Fundamental Right ہے تو چیف جسٹس کی برطرفی کے معاملے سے بھی عام آدمی کو دور نہیں رکھا جا سکتا۔

سوال: اس معاملے میں وکلاء کی جانب سے جو شدید ردعمل آیا ہے، اور ججوں نے استعفے دیے ہیں تو آپ کے خیال میں وکلاء کی تحریک کب تک چلے گی؟

رشید رضوی: میں سمجھتا ہوں کہ اپنے شعبے کی سب سے بڑی شخصیت کی غیر قانونی برطرفی پر وکلاء نے جس اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ میں نے آج تک وکلاء کے اتحاد کا یہ مظاہرہ نہیں دیکھا۔

سوال: جب سپریم کورٹ پر حملہ ہوا تھا تو اس وقت وکلاء نے اس طرح کی کوئی تحریک کیوں نہیں چلائی؟

رشید رضوی: اگر ماضی میں کسی غلط کام پر خاموشی اختیار کی گئی اور اب اگر ایک غلط کام پر وکلاء متحد ہو گئے ہیں تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ یہ وکلاء جو ملک بھر میں مظاہرے کر رہے ہیں، ان میں سے بیشتر افتخار چودھری صاحب سے خوش نہیں ہوں گے، لیکن وکلاء کسی فرد واحد کو نہیں بلکہ ادارے کو بچانے کیلئے باہر نکلے ہیں۔ جہاں تک یہ الزام کہ چیف جسٹس گاڑیاں استعمال کرتے تھے تو فوج اور حکومت میں

شامل لوگ کتنی گاڑیاں استعمال کرتے ہیں، اس کا حساب کسی نے آج تک لیا۔ چیف جسٹس کے بیٹے کی آؤٹ آف ٹرن پروموشن کو ایشو بنایا گیا ہے، میں بیس ایسے جنرلوں کے بیٹوں کے نام گنوا سکتا ہوں جنہیں آؤٹ آف ٹرن پروموشن ملی ہے، کیا ان کے خلاف کوئی ریفرنس آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں حکومت خدانخواستہ اپنی سازش میں کامیاب ہوگئی تو عدلیہ مجسٹریٹ بن کر رہ جائے گی۔

سوال: وکلاء نے سیاست دانوں کو اپنی تحریک سے دور رہنے کے لیے کیوں کہا؟

رشید رضوی: سیاست دانوں کا مقصد اقتدار میں آنا ہوتا ہے۔ ہماری جنرل پرویز مشرف یا حکومت کے کسی اور آدمی سے ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ ہماری جنگ اصولوں کی جنگ ہے۔ ہم عدلیہ کے ادارے کو بچانا چاہتے ہیں۔ ہمارا کوئی سیاسی ایجنڈا نہیں ہے۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس واپس لے کر انہیں بحال کیا جائے، جو وکلاء گرفتار ہوئے ہیں، انہیں رہا کیا جائے اور ان کے خلاف جو کیس بنائے گئے ہیں وہ واپس لئے جائیں۔ ہم سول سوسائٹی اور سیاست دانوں کو ویلکم کرتے ہیں کہ وہ ہماری تحریک کا ساتھ دیں لیکن وہ اپنے الگ مظاہرے کریں۔ ان کے لیے نشتر پارک، موچی گیٹ اور دوسرے میدان موجود ہیں۔

سوال: عدلیہ کو مقدس گائے کہا جاتا ہے، کیا عدلیہ کو مقدس گائے ہونا چاہیے؟

رشید رضوی: بالکل نہیں۔ کسی بھی ادارے کو مقدس گائے کا درجہ نہیں ملنا چاہئے۔ عدلیہ اور فوج کو قابل احتساب ہونا چاہیے۔

سوال: چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس احتساب نہیں ہے؟

رشید رضوی: اگر یہ احتساب ہوتا تو ان کے خلاف خاموشی سے قاعدے کے تحت ریفرنس بھیجا جا سکتا تھا، یہ جو پانچ گھنٹے میں جو کمانڈو ایکشن ہوا ہے، اس سے حکومت کی بدنیتی کے علاوہ کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا۔ اور اگر ریفرنس کی بات ہے تو کتنے ایسے جج ہیں جن کے خلاف میں Misconduct کے ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ ہمارے ایک ساتھی قاضی انور، جو سینیئر بھی رہے، انہوں نے سرحد کے ایک جج کے خلاف پٹیشن دائر کی تھی، آج تک سماعت نہیں ہوئی، کیوں کہ یہ جج حکومت کی گڈ بک میں ہیں۔

سوال: سپریم جوڈیشل کونسل کا فیصلہ کب تک آنے کی توقع ہے؟

رشید رضوی: پانچ سے آٹھ مہینے تو لگ سکتے ہیں کیونکہ خود چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے کہا ہے کہ وہ جنرل پرویز مشرف کو کونسل میں بلا کر ان سے سوال جواب کرنا چاہتے ہیں۔

سوال: اور آٹھ مہینے میں وکلاء کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے تو ......؟

رشید رضوی: میں نہیں سمجھتا، ایسا ہوگا۔ یہ اصولوں کی جنگ ہے۔ ابھی آپ دیکھیں کہ چیف جسٹس افتخار چودھری نے جب پنڈی میں خطاب کیا تو وہاں کوئی ڈھائی ہزار وکیل اور جج صاحبان انہیں سننے آئے تھے۔ حالانکہ پنڈی میں وکلاء کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ نہیں ہے، لوگ دور دراز سے انہیں سننے آئے تھے۔ یہ جو جنرل پرویز مشرف کہتے ہیں کہ آج کل کالے کوٹ اور ٹائیاں خوب بک رہی ہیں تو کیا انٹیلی جنس ایجنسیوں والوں نے کسی ایک آدمی کی بھی نشان دہی کی، جو وکیل نہ ہوگا، اور کالا کوٹ پہن کر مظاہرے میں شریک ہوگیا ہو۔ ہاں، پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی نے جو جلسہ کیا تھا، اس میں مسلم لیگ ق کے لوگ ضرور کالے کوٹ اور ٹائیاں پہن کر گئے تھے۔ کالے کوٹ اور ٹائیاں ان کے لوگ خرید رہے ہیں۔ ابھی سکھر لیبر کورٹ میں نعیم بخاری ایک مقدمے کی پیشی پر آئے، لوگوں کو پتا چلا تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ سکھر لیبر کورٹ کے باہر جمع ہوگئے اور ان کے خلاف نعرے لگانے لگے، حالانکہ سکھر لیبر کورٹ شہر سے باہر ہے، مجبوراً جج کو پولیس بلانی پڑی۔

سوال: نعیم بخاری کا تو لائسنس منسوخ ہوگیا ہے؟

رشید رضوی: لیبر کورٹ کے جج نے بھی ان سے یہی سوال کیا تھا تو انہوں نے ایک لیٹر پیش کیا کہ انہوں نے لاہور ہائی کورٹ سے استثنیٰ لے لیا ہے

سوال: کیا اس واقعے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملک میں عدلیہ صحیح ٹریک پر آ گئی ہے؟

رشید رضوی: عدلیہ کو صحیح ٹریک پر آ جانا چاہیے۔ کیونکہ عدلیہ کسی بھی قوم کی بقا میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ برطانیہ نے ہم پر ڈیڑھ سو سال حکومت کی، لیکن اس کے دور میں عدلیہ آزاد تھی۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ قومیں کفر میں تو زندہ رہ سکتی ہیں لیکن ظلم میں نہیں۔

سوال: پاکستان کا مستقبل کیسا دیکھ رہے ہیں؟

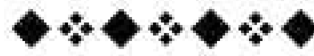
رشید رضوی: میں سمجھتا ہوں، اب وقت آ گیا ہے کہ فوج پوری نیک نیتی سے بیرکوں میں واپس چلی جائے، آزادانہ اور منصفانہ الیکشن ہوں اور جمہوریت کی گاڑی چلنے دی جائے ورنہ شوکت عزیز صاحب کے تو امریکا میں بلین ڈالرز پڑے ہیں وہ واپس چلے جائیں گے۔ جنرل پرویز مشرف بھی طیارے میں آئے تھے، طیارے ہی میں چلے جائیں گے۔ خمیازہ قوم بھگتے گی۔ میں اور آپ بھگتیں گے اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو مشرقی پاکستان جیسا ایک اور سانحہ رونما ہو سکتا ہے، جس کے شواہد وزیرستان، وانا اور بلوچستان کے حالات دے رہے ہیں۔ حکومت کی رٹ بالکل ختم ہو چکی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ لوگ خود جہادی تنظیموں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ حکومت کی ناکامی کا ڈھٹائی سے اقرار ہے۔

سوال: لیکن جو لوگ Replace کریں گے وہ آئیڈیل ہیں؟

رشید رضوی: آئیڈیل تو کوئی نہیں ہے۔ لیکن ایک پروسس تو چلنا چاہیے۔ ہمارے ہاں سوائے ایک الیکشن کے بارے سارے الیکشن انجینئرڈ تھے۔ فیصلے پہلے سے مرتب کر لیے گئے تھے۔ اسی لیے ہمارے ہاں ادارے مضبوط نہیں ہو سکے۔ جب کہ ہندوستان میں آٹھ نو الیکشن ہو چکے ہیں۔

سوال: آپ چیف جسٹس کی تقرری اور ریٹائرمنٹ کے طریقہ کار سے مطمئن ہیں؟

رشید رضوی: جی ہاں، ملک اسد علی کیس میں واضح طور پر اصول مرتب کر دیا گیا ہے کہ جو موسٹ سینئر جج ہوگا، اسی کو چیف جسٹس بنایا جائے گا اور ریٹائرمنٹ کی عمر بھی طے کر دی گئی ہے۔



ممتاز قانون دان ضیاء احمد اعوان کا انٹرویو

انسانی حقوق کے تحفظ کیلئے سرگرم ضیاء احمد اعوان کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بین الاقوامی فورمز پر پاکستان کی پہچان بن چکے ہیں اور خود کو ناانصافی کے خلاف جہاد کیلئے وقف کر چکے ہیں۔ ملک کے قانونی اور سیاسی حلقوں میں ان کا نام احترام اور عزت سے لیا جاتا ہے۔ انہوں نے ظلم و زیادتی کا شکار بے شمار لوگوں کی خدمت کی ہے اور نہ جانے کتنے ہاتھ ان کے حق میں دعا کیلئے اٹھتے ہیں۔ وہ یقیناً ایک ایسی سوسائٹی ہیں جہاں رول آف لاء ناپید ہے۔ ایک بہت ہی مشکل کام کر رہے ہیں لیکن ان کا حوصلہ آج بھی جوان ہے اور ان کے ساتھیوں اور شاگردوں میں بہت اضافہ ہو چکا ہے اور وہ ملک میں انسانی حقوق کے احترام کے لئے آگہی اور شعور پیدا کرنے میں مصروف ہیں اور ساتھ ساتھ عدلیہ کی آزادی اور قانو ن کی حکمرانی کیلئے جاری وکلاء کی جدوجہد میں بھی نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ ضیاء احمد اعوان سے ملک میں جاری وکلاء کی جدوجہد اور عدالتی بحران پر جو گفتگو ہوئی وہ قارئین کی دلچسپی کیلئے یہاں پیش خدمت ہے۔

سوال: آپ اس ساری صورت حال کو کس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، اب تو سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی روک دی گئی ہے اور سپریم کورٹ کے 14 ججوں پر مشتمل فل کورٹ بن گئی ہے، حالات کیا رخ اختیار کر رہے ہیں؟

ضیاء احمد اعوان: حکومت کی جانب سے جو رویہ اختیار کیا گیا اور جس قسم کے اقدامات کئے گئے وہ بہت ہی حیران کن بلکہ شرمناک رہے ہیں۔ چیف جسٹس سے بدسلوکی ایک ناقابل برداشت بات تھی اس لئے وکلاء کا مشتعل ہونا اور احتجاج کرنا فطری تھا۔ جس ملک میں چیف جسٹس کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا جائے اور اسے پانچ گھنٹے تک زبردستی ایک جگہ روکا جائے، استعفیٰ مانگا جائے پھر گھر پر نظر بند کر کے رکھ دیا جائے جہاں کسی کی رسائی نہ ہو، اخبار، ٹیلیفون اور ٹیلی ویژن تک بند کر دیا گیا ہو گاڑیاں ہٹالی جائیں تو یہ صورت حال تو افسوس ناک ہی کہی جائے گی پھر حکومت کے وزراء نے جھوٹ بولنے کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے اور عوام کو بھی ان باتوں پر غصہ آیا۔ اب ایسا دور ہے کہ آپ حقائق کو چھپا نہیں سکتے۔ کیمرہ سب کچھ دکھا دیتا ہے اس کے باوجود وزراء نے جس قسم کے بیانات دیئے وہ حقائق سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور ہر شخص کی ہمدردی چیف جسٹس کے ساتھ ہوتی گئی یہ ایک قدرتی بات تھی اس ساری صورت حال کی ذمہ داری خود حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

سوال: پنجاب میں جس طرح چیف جسٹس کا لاہور تک استقبال ہوا اور وہاں کے جج صاحبان بھی آگے آگئے کیا اس کی توقع وکلاء کر رہے تھے اور اب حکومت بھی ریلیاں کر رہی ہے تصادم کا خطرہ تو نہیں ہوگا؟

ضیاء احمد اعوان: اسلام آباد سے لاہور تک چیف جسٹس افتخار چودھری کا جو والہانہ اور تاریخی استقبال ہوا، اس کے بارے میں وکلاء تو پراعتماد تھے لیکن جس بڑی تعداد میں عوام باہر نکل کر آئے اور انہوں نے چیف جسٹس کے ساتھ اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہر جگہ ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں اس کا شاید حکومت کو ادراک نہیں تھا اور حکومتی پارٹیاں اپنی ریلی نکال کر چیف جسٹس کے استقبال کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ایک عوامی ہیرو کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ لوگ کسی کے کہے بغیر خود ان کے استقبال کیلئے آ رہے ہیں یہ بڑی بات ہے۔ جہاں تک چیف جسٹس کے وکلاء کے خلاف مختلف کارروائیوں اور اقدامات کا تعلق ہے تو یہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مترادف ہے۔ مجموعی طور پر وکلاء نے مثالی اتحاد کا مظاہرہ کر کے جدوجہد

جاری رکھی ہوئی ہے اور اس میں وکلاء تنظیموں کے رہنماؤں کو کریڈٹ جاتا ہے۔ پنجاب میں جو عوامی طاقت کا مظاہرہ ہوا ہے۔ چیف جسٹس کے حق میں ہیں کے بعد حکومت کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا۔ دانشمندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس طرح ایک نجی ٹی وی سے معافی مانگی گئی تھی اسی طرح چیف جسٹس سے بھی معافی مانگ لی جاتی تو صورت حال خود بخود بہتر ہو جاتی لیکن نہ جانے کیوں کنفرنٹیشن کی فضا جان بوجھ کر پیدا کی گئی، دوسری جانب وکلاء کی جدوجہد نے ایشیاء کے اندر ایک منفرد مثال قائم کر دی۔ یہ ڈسپلن اور اصولوں پر مبنی تحریک ہے جب سے وکلاء رہنماؤں نے بہت احتیاط اور سوچ سمجھ کر چلانا ہے اس تحریک میں عام وکلاء بھی شامل ہیں اور کچھ مفاد پرست وکلاء بھی شامل ہیں اس تحریک کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ جو مفاد پرست لوگ ہے ان کے چہروں سے نقاب ہٹ رہا ہے اور ان کا اصل چہرہ عوام کے سامنے آ رہا ہے کچھ سیاسی جماعتیں بھی ہیں جو دوسری طرف کھڑی ہیں اور عدلیہ کی آزادی کیلئے جاری وکلاء کی تحریک سے کنفرنٹ کر رہی ہیں۔ عوام ان سب کو دیکھ رہے ہیں اور حالات کا جائزہ لے رہے ہیں اچھی بات یہ ہے کہ سب کچھ ایسے موقع پر ہو رہا ہے جبکہ یہ الیکشن کا سال ہے اور بہت جلد عوام نے اپنے ووٹ کے ذریعے ملک کی مستقبل کی قیادت کا انتخاب کرنا ہے۔ جو لوگ عدلیہ کی آزادی اور قانون کی حکمرانی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اصولوں پر ڈٹے ہوئے ہیں اور نظریاتی جدوجہد کر رہے ہیں ان کو عوام دیکھ رہے ہیں ہمارا یقین ہے کہ یہ مہم کامیاب ہوگی۔ جب آئین کی آزادانہ تشریح ہوگی تو ملک میں جو بھونچال آیا ہے اس میں اچھے لوگ آئیں گے اور جنہوں نے اپنے چہروں پر نقاب رکھے ہیں وہ بے نقاب ہو جائیں گے یہ انصاف اور عدلیہ کی آزادی کی جدوجہد ہے ویسے بھی جس ملک میں انسٹی ٹیوٹ مضبوط اور آزاد نہ ہوں اس کا قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے یہ تحریک پاکستان کے لیے بہت خوش آئند ہے۔

سوال: کہا جا رہا ہے کہ چیف جسٹس اگر بحال ہو گئے تو ان سب لوگوں کے ساتھ انصاف کیسے کریں گے جو ان کے جلوسوں میں شرکت کر رہے ہیں۔

ضیاء احمد اعوان: چیف جسٹس پاکستان کی سب سے بڑی عدالت کے جج ہیں ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا جو رویہ اختیار کیا گیا اس کی ذمہ داری حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جو کچھ ہوا وہ حکومت کے اقدامات کا شاخسانہ ہے۔ احتساب کے خلاف کوئی بھی نہیں اس لئے ضرور احتساب ہونا چاہئے لیکن جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ بالکل غلط ہے اسے سب نے مسترد کر دیا ہے جبکہ چیف جسٹس نے بار روم کے جتنے بھی پروگرام اٹینڈ کئے ہیں وہاں انہوں نے اپنی تقریر میں کوئی سیاسی بات نہیں کی وہ تو آئین اور قانون کے حوالے سے بول رہے ہیں۔ دوسری جانب وہ لوگ ہیں جنہوں نے حلف لیا تھا کہ سیاست نہیں کریں گے وہ بھی ریلیاں نکال اور ان سے خطاب کر رہے ہیں بلکہ اپنے حامیوں کیلئے ووٹ مانگ رہے ہیں جبکہ چیف جسٹس کے استقبال کیلئے لوگ خود بخود شامل ہو رہے ہیں۔ چیف جسٹس نے تو کسی کو کال نہیں دی۔ بار کے پروگرام میں وکلاء ہوتے ہیں۔

سوال: سیاسی جماعتیں بھی آگے آ رہی ہیں ہر جگہ سیاسی جماعتوں کے جھنڈے نظر آتے ہیں جس پر مخالف حلقے اعتراض کر رہے ہیں؟

ضیاء احمد اعوان: سیاسی پارٹیوں کی اپنی ڈیوٹی ہوتی ہے کوئی بھی سیاسی جماعت جب یہ دیکھے گی کہ ملک کے چیف جسٹس کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا جا رہا ہے تو کیا وہ خاموش بیٹھی رہے گی۔ سیاست دانوں کا کام سیاست کرنا ہے وہ اپنا احتجاج کر رہے ہیں اور ان کا اپنا نکتہ نظر ہوتا ہے۔

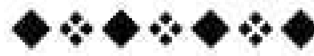
سوال: اخبارات میں اشتہارات بھی چھپوائے گئے ہیں کہ وکلاء کے احتجاج کی وجہ سے مقدمات کی سماعت متاثر ہو رہی ہے اور لوگوں کو انصاف کے حصول میں مشکلات کا سامنا ہے؟

ضیاء احمد اعوان: جو لوگ اب یہ باتیں کر رہے ہیں یا اشتہار شائع کرا رہے ہیں دراصل یہی لوگ اس صورتحال کے ذمہ دار بھی ہیں۔ عدلیہ پر قدغن کس نے لگائی ہے۔ وکلاء کا کیا قصور ہے۔ ریفرنس حکومت نے بنایا ہے۔ بدسلوکی بھی حکومت نے کی اور وکلاء پر حملے بھی انتظامیہ نے کئے ہیں۔ نشریات بھی بند کی جا رہی ہیں۔ وکلاء کو دھمکیاں مل رہی ہیں۔ ساری صورتحال کے ذمہ دار حکومتی لوگ ہیں۔ چیف

جسٹس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اب اسے وکلاء کبھی بھی درست نہیں کہہ سکتے اور اس لئے ان کا احتجاج جاری ہے اور یہ احتجاج غلط نہیں ہے۔ جب چیف جسٹس آف پاکستان انصاف مانگ رہا ہے تو پھر عام لوگوں کو کیسے انصاف ملے گا۔

سوال: آپ مختلف ممالک میں سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنس میں شرکت کرتے ہیں، 9 مارچ کے بعد پاکستان کا امیج کیسا بنا ہے، مختلف ممالک کے لوگ کیا کہتے ہیں؟

ضیاء احمد اعوان: مجموعی طور پر پاکستان کا امیج اور ٹریک ریکارڈ اچھا نہیں رہا ہے لیکن اس پورے واقعہ میں ایک بات ضرور ہوئی ہے کہ پاکستان کے عوام اور وکلاء کے حوالے سے یہ پیغام دنیا کو ملا ہے کہ اب پاکستان میں آزادی اظہار اور عدلیہ کی آزادی کیلئے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور کمٹمنٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور باقاعدہ ایک ماس موومنٹ نظر آنے لگی ہے یہ صرف ایک شخص کی لڑائی نہیں ہے بلکہ پوری عدلیہ کی آزادی کا معاملہ ہے اور لوگ حکومت سے ویسے بھی ناراض تھے۔ مہنگائی اور بے روزگاری نے لوگوں کو تنگ کر رکھا ہے۔ ملک میں غربت بھی بڑھ رہی ہے۔ لوگوں کی زندگی میں مشکلات زیادہ ہیں۔ حکومت ان کو خاطر خواہ ریلیف نہیں دے پا رہی اس لئے لوگوں کی ناراضگی اور غصہ بھی وکلاء کی تحریک کو سپورٹ کر رہا ہے۔ حکومت کیلئے بہتر ہوتا کہ وہ خود ریفرنس واپس لینے کا فیصلہ کر لیتی اور جن لوگوں نے مس ہینڈلنگ کی ان کو سزا دی جاتی تو صورت حال بہتر ہو جاتی لیکن جن لوگوں نے مس ہینڈلنگ کی ان کو سزا دینے کی بجائے پوری قوم کو سزا دی جارہی ہے۔



ممتاز تجزیہ نگار اور دانشور جناب مجیب الرحمٰن شامی کا
عدالتی بحران کے حوالے سے خصوصی انٹرویو

سوال: شامی صاحب! حالیہ دنوں میں میڈیا نے اپنا جو کردار کیا ہے اور اس ضمن میں پابندیوں کے جو واقعات سامنے آئے ہیں' اس کو آپ کس طرح دیکھ رہے ہیں؟

شامی صاحب: بات یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے میڈیا اسے تخلیق نہیں کرتا بلکہ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے اور ہوتا یہ ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں کوئی طے شدہ نظام نہیں ہے' حکومتوں کے آنے اور جانے کے طریقے طے نہیں ہیں' وہاں حکومتیں چھوٹے سے ہنگامے سے بھی جلد گھبرا جاتی ہیں اور وہ سمجھتی ہیں کہ یہ ان کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ گویا ان کو گھر بھیجنے کا کوئی پروگرام بن رہا ہے اور پھر جب وہ میڈیا کی طرف دیکھتی ہیں تو وہ خیال کرتی ہیں کہ میڈیا اس صورت حال کو تخلیق کر رہا ہے اور ان کا سارا غصہ میڈیا پر آ جاتا ہے۔ جب ہمارے ہاں صرف پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات تھے' اس وقت سارا غصہ اخبارات پر نکلتا تھا۔

اب الیکٹرانک میڈیا بھی آ گیا ہے اور اس کے ذریعے آپ کو وہی کچھ دکھایا جا رہا ہوتا ہے جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی جیسے پاکستانی کرکٹ ٹیم ورلڈ کپ ہار گئی۔ یہ ٹی وی کیمرے وہی کچھ دکھا رہے تھے جس طرح سے ٹیم پرفارم کر رہی تھی۔ اب اگر کرکٹ بورڈ ٹیم کے ہارنے کا سارا غصہ میڈیا پر نکالتا ہے کہ اس کے دکھانے کی وجہ سے ہم ہار گئے ہیں تو یہ اور طرح کی بات ہے اور اگر کوئی چینل ایسا ہے جو ڈرامے کو حقائق کے نام پر پیش کر رہا ہے یا لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے' تو یہ اور بات ہے۔

اس وقت جو ہنگامہ اس ملک میں برپا ہے اور یہ کہ چیف جسٹس کے خلاف جو کارروائی ہو رہی ہے اور جس طریقے سے ہو رہی ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔ اصل میں جو ایشو ہے وہ کارروائی سے زیادہ کارروائی کا طریقہ ہے۔ جس طرح چیف جسٹس صاحب کو بلایا گیا اور پھر جس طرح ان کو بٹھایا گیا اور پھر جس طرح ان کو گھر جاتے ہوئے راستے میں روک لیا گیا' سپریم کورٹ کے دروازے چیف جسٹس پر بند کر دیئے گئے اور ان کے گھر کے ٹیلی فون کاٹ دیئے گئے' ان کے موبائل فون بند کر دیئے گئے' ان کے بچوں کو سکول جانے سے روک دیا گیا اور ایک طرح سے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا اور ان کے مہمانوں کو ان سے ملنے سے روک دیا گیا اور پھر جب وہ سپریم کورٹ میں سپریم جوڈیشل کونسل کے سامنے پیش ہونے کیلئے گھر سے نکلے' تو ان کو زبردستی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کی گئی اور پولیس والوں نے انکے بال نوچے۔ اب اگر پرنٹ میڈیا کو تصویر نہیں ملی لیکن خبر مل گئی ہے تو حکومت اس صورت میں کہہ سکتی ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پولیس تو وہاں تھی ہی نہیں اور ایسا کئی معاملہ ہی نہیں ہوا اور اس طرح سے لوگوں کو مغالطے میں ڈال دیا جاتا' اب جو کیمرہ اور الیکٹرانک میڈیا آ چکا ہے تو اسکی وجہ سے چیف جسٹس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ لوگوں نے ٹی۔ وی کی سکرین پر اپنی آنکھوں سے براہ راست دیکھا۔ اب ریفرنس پیچھے چلا گیا ہے۔ اسکے مندرجات بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔

اب جس طرح چیف جسٹس سپریم کورٹ آتے ہیں' جس طرح لوگ وہاں اکٹھے ہوتے ہیں' سیاسی پارٹیاں وہاں اپنے افراد لے کر

آتی ہیں' جو نعرے بازی ہوتی ہے اور جو ہنگامہ ہوتا ہے وہ الیکٹرانک میڈیا لوگوں کو دکھا رہا ہے۔ جب چیف جسٹس نے پشاور کا سفر کیا تو الیکٹرانک میڈیا نے دکھایا کہ کس طرح ان کا استقبال ہو رہا ہے اور جب وہ راولپنڈی بار سے خطاب کیلئے گئے تو وہ مناظر بھی الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے لوگوں کو دیکھنے کو ملے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' یہ آپ ایک طرح سے براہ راست کرکٹ میچ دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے میڈیا صرف وہی دکھا رہا ہے۔ حکومت کو میڈیا کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ جب حکومتیں کمزور ہو رہی ہوتی ہیں اور حالات ان کے قابو میں نہیں آ رہے ہوتے تو سارا غصہ میڈیا پر نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک شعر کا مصرعہ ہے:

''آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے''

ان کو اپنے اقدامات کی طرف دیکھنا چاہئے اور ان کو درست کرنا چاہئے' لیکن غبار میڈیا پر نکالا جا رہا ہوتا ہے۔

سوال: کیا موجودہ عدالتی بحران کی کیفیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس کی کوریج لمحہ بہ لمحہ دکھائیں؟

شامی صاحب: عام طور پر یہ ہوتا رہا ہے کہ سپریم کورٹ میں جب کوئی دلچسپ کیس آتا ہے تو اس سے دلچسپی رکھنے والے لوگ وہاں ضرور جاتے ہیں۔ چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس ہماری تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد کیس ہے۔ اب اگر لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہے' میڈیا ان کو قطعاً تلقین نہیں کر رہا کہ وہ لوگ سپریم کورٹ کے باہر جمع ہوں۔ میڈیا تو صرف یہ کر رہا ہے کہ وہ ملک کی صف اول کی لیڈر شپ جس میں قاضی حسین احمد' عمران خان' مسلم لیگ (ن) کے راجہ ظفر الحق اور چودھری نثار علی خان اور اپوزیشن لیڈر مولانا فضل الرحمٰن بھی شامل ہیں۔ جب یہ صف اول کی لیڈر شپ اپنے اپنے کارکنوں کے ساتھ وہاں موجود ہوگی تو یقیناً ایک بڑا ایونٹ ہوگا اور یہ اتنا بڑا ایونٹ ہے کہ خود حکمران جماعت مجبور ہوگئی کہ وہ بھی اپنے بندے اکٹھے کرے اور اس کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور وزیر اطلاعات محمد علی درانی اپنے کارکنوں کو لے کر اسلام آباد جمع ہوئے۔ لہٰذا سپریم کورٹ جانے اور اس کے باہر کھڑے ہونے کی ایک اہمیت تو ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ کیمرے ایونٹ کو تخلیق نہیں کر رہے بلکہ کسی ایونٹ کو لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔

سوال: پچھلی سماعت میں ایک جج صاحب بھی کیمرہ والوں سے استفسار کر چکے ہیں کہ کیا آپ کو صرف سپریم کورٹ کی عمارت ہی نظر آتی ہے؟ اس حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

شامی صاحب: مجھے بھی ان جج صاحبان سے ہمدردی ہے وہ بیچارے بھی اپنی جگہ پریشان ہوتے ہوں گے۔ یہ انسانی معاملات ہیں اور انسانی معاملات کا ردعمل ضرور ہوتا ہے کیونکہ وہ اس وقت لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں بھی خبریں آ رہی ہیں اور ان پر اعتراضات بھی ہو رہے ہیں جو کہ نشر بھی ہو رہے ہیں اس لیے ان کو پریشانی تو ہوتی ہوگی۔ لہٰذا مجھے ان سے ہمدردی ہے اور میں اس کے علاوہ کیا کر سکتا ہوں۔

سوال: شامی صاحب! اگر ایونٹ دکھانا ضروری ہے تو اخبارات کیوں نہیں دکھا رہے؟

شامی صاحب: دیکھیں جی' اخبارات بھی دکھا رہے ہیں لیکن وہاں ایک اور زاویے سے دکھا رہے ہیں۔ آپ اخبارات میں چھپنے والے کالموں کو پڑھ لیں' ان کی لیڈ اور سپر لیڈ کو دیکھ لیں' کوئی اخبار اٹھا کر اس کا صفحہ اول دیکھ لیں' آپ کو تین چوتھائی حصہ اسی حوالے سے نظر آئے گا۔ یہ ایک طرح سے ڈیمانڈ اور سپلائی کا مسئلہ ہے۔ اگر ٹی وی اور اخبارات معاملہ اٹھا رہے ہیں' کوئی چیز دکھا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ڈیمانڈ موجود ہے اور لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھیں چیف جسٹس کے دورہ پشاور کی صرف ایک ٹی وی

چینل براہ راست کوریج کر رہا تھا لیکن شام تک دوسرے ٹی وی چینل بھی اس کو براہ راست دکھا رہے تھے۔

چیف جسٹس جب اسلام آباد سے پشاور پہنچے تو سارے راستے کی براہ راست کوریج تمام چینلز نے نہیں کی لیکن جب وہ پشاور ہائی کورٹ پہنچے تو سارے ٹی وی چینل براہ راست دکھانے پر مجبور ہو گئے۔ اسی طرح جب چیف جسٹس نے اسلام آباد سے لاہور کا سفر کیا تو زبردست عوامی استقبال کے باعث میڈیا اس کو براہ راست دکھانے پر مجبور تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ انہیں لحہ بہ لحہ باخبر رکھا جائے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کے اس مطالبے کو پورا کیا جا رہا ہے۔

اب تو پی ٹی وی بھی اس دوڑ میں شریک ہو چکا ہے اور وہ صدر کے جلسوں کی براہ راست کوریج کر رہا ہے۔ حکمران مسلم لیگ بھی جلسے جلوسوں کی دوڑ میں شریک ہوگئی ہے اور مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین نے کہا ہے کہ پشاور اور لاہور کے سفر کے دوران جو کچھ ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم بھی سڑکوں پر آنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم عدلیہ کو سیاسی اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گویا وہ دنیا کو یہ بتا رہے ہیں کہ صرف ہمارے مخالف ہی نہیں ہم بھی جلوس نکالنا جانتے ہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ میڈیا کو کسی کی ذاتی زندگی میں نہیں جھانکنا چاہیے جبکہ عوامی معاملات کی کوریج میڈیا کا حق ہے۔

سوال: شامی صاحب! پہلے تو جج کسی کیس کی سماعت کے لیے جیل میں بھی چلا جاتا تھا اب اس کیلئے جیل میں سماعت کرنا خطرناک ہو گیا ہے۔ تو اس کو ویڈیو کیمرہ کے سامنے کھڑا کیا جا رہا ہے۔ کیا ایسی سماعت کی کوریج کی جا سکتی یا کوریج کا حق مانگا جا سکتا ہے؟

شامی صاحب: دیکھیں اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ اخبارات اور ایڈیٹروں کیلئے ہمارا جو ضابطہ اخلاق ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اگر عدالت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کسی کیس کی سماعت "ان کیمرہ" ہو تو آپ لوگ اس کی تفصیلات نہیں چھاپ سکتے۔ جس طرح قومی اسمبلی کی کارروائی سے کوئی چیز حذف کر دی جائے تو آپ اس کو چھاپ نہیں سکتے۔ جس طرح کسی پریس کانفرنس میں جب کوئی کہتا ہے کہ یہ آف دی ریکارڈ ہے تو آپ اس کو نہیں چھاپ سکتے۔

اب عدالت یا سپریم جوڈیشل کونسل میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی تفصیل کسی اخبار میں نہیں چھپی اور نہ ہی کسی ٹی وی نے لحہ بہ لحہ دکھائی ہے۔ کیونکہ جب سپریم جوڈیشل کونسل نے فیصلہ کیا کہ کارروائی ان کیمرہ ہوگی اور ان کے ضابطوں میں بھی طے ہے کہ کارروائی ان کیمرہ ہونی چاہئے۔ شریف الدین پیرزادہ صاحب نے بین الاقوامی جیورسٹس کانفرنسوں کے ریفرنس پیش کیے ہیں اور کہا ہے کہ یہ جو ان کیمرہ سماعت ہے اس کا تعلق جج کی عزت سے ہے۔ اگر جج کے خلاف کوئی مقدمہ چلتا ہے یا اس کے خلاف کوئی انکوائری ہوتی ہے تو اس کو ان کیمرہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی پوزیشن خراب نہ ہو اور فیصلہ آنے سے پہلے ہی کسی نامناسب صورتحال کا سامنا کرنا پڑے۔

اقوام متحدہ کے تحت ہونے والی جیورسٹس کانفرنسوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر جج یہ کہے میرا ٹرائل اوپن ہونا چاہئے تو پھر اسے اوپن ہی ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں جوڈیشل کونسل کے ضوابط کے مطابق کارروائی ان کیمرہ ہو رہی ہے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری نے چونکہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ میرے خلاف کارروائی اوپن ہو اس لیے اوپن ہونی چاہئے' لیکن سکیورٹی کے حوالے سے ہر عدالت میں خواہ وہ سول جج کی عدالت ہو' خواہ وہ سپریم کورٹ ہو یا سپریم جوڈیشل کونسل کی انکوائری ہو۔ اس میں عدالت کے پریزائیڈنگ آفیسر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کارروائی ان کیمرہ رکھنے کا حکم دے۔ اگر وہ ایسا حکم دے تو اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور جو

خلاف ورزی کرے گا ہم اس کی حمایت نہیں کریں گے۔

سوال: کیا میڈیا کے انداز کوریج کی وجہ سے انارکی نہیں پھیل رہی؟

شامی صاحب: بات یہ ہے کہ پہلے کہا جاتا تھا کہ لوگ بیان بازی کے شوق میں ایسا کرتے ہیں' پھر کہا جاتا ہے کہ لوگ تصویر چھپوانا چاہتے ہیں اور اب یہ کہا جارہا ہے کہ لوگ کیمرے کے سامنے آنا چاہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس گرمی کے اندر اپنے پیسے خرچ کرکے' اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر اگر کوئی شخص 25,20 گھنٹے گزارتا ہے تو اس کا اتنا استحقاق تو ہو جاتا ہے کہ وہ کیمرے کے سامنے آجائے۔

سوال: اخبارات تو اے پی این ایس اور سی پی این ای کے دائرہ کار میں کام کرتے ہیں' کیا ٹی وی چینل کی مشروم گروتھ میں کسی ضابطہ اخلاق کی ضرورت نہیں؟

شامی صاحب: اے پی این ایس یا سی پی این ای کی ممبر شپ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو اخبار نکالنے کی اجازت مل گئی ہے۔ ڈیکلیئریشن تو اس ملک میں بہت ہیں اور ڈیکلیئریشن دینے والی اتھارٹی بھی کوئی اور ہے۔ اے پی این ایس اور سی پی این ای کا ایک معیار ہے اور اس معیار کے مطلب جو ریگولر اخبار ہیں ان کو ممبر شپ دی جاتی ہے اور جس نام کا اخبار پہلے سے موجود ہو اس کا ڈیکلیئریشن جاری نہیں کیا جاسکتا اور ملتے جلتے نام کے ڈیکلیئریشن کا مطلب بھی کسی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس لیے ہم سے کوئی شخص مطالبہ نہیں کرسکتا کہ فلاں کو ممبر بنائیں اور فلاں کو نہ بنائیں۔ ہر ادارے کو حق حاصل ہے کہ وہ چند اداروں کے ساتھ مل کر اپنی ایسوسی ایشن بنائے اور ایسوسی ایشن کی ممبر شپ کیلئے کسی عدالت میں نہیں جایا جاسکتا۔ جیسا کہ جم خانہ کلب ہے' اسلام آباد کلب ہے اور سندھ کلب ہے۔ اس کی ممبر شپ کیلئے آج تک کوئی عدالت میں نہیں گیا کہ مجھے اس کی ممبر شپ نہیں دی جارہی۔ بات یہ ہے کہ ان کے اپنے قواعد و ضوابط ہیں جن کے مطابق وہ ممبر شپ دیتے ہیں۔

سوال: صدارتی ریفرنس کے حوالے سے مختلف ٹی وی چینلز پر جتنی بھی بحث اب تک ہوئی ہے' کیا گفتگو اور گفتگو کرنے والوں کو آپ مناسب خیال کرتے ہیں؟

شامی صاحب: بات یہ ہے کہ ہمارا الیکٹرانک میڈیا نیا ہے جبکہ پرنٹ میڈیا برسوں پرانا ہے۔ اتنا پرانا کہ اس نے جنگ آزادی میں حصہ لیا اور ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ مولانا ظفر علی خان' مولانا محمد علی جوہر اور جتنے بھی مجاہدین آزادی تھے' انہوں نے صحافت کو ایک ذریعہ بنایا تھا اور پرنٹ میڈیا کی اپنی ایک تاریخ ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا نیا ہے اور ابھی گھٹنوں کے بل چل رہا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ماشاءاللہ جوان ہو رہا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے قوم کے اندر جو بھڑاس تھی وہ نکل رہی ہے یعنی لوگوں کو جو بات کرنے کا شوق تھا وہ پورا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد انویسٹی گیٹو جرنلزم شروع ہوگا اور کیمرہ وہاں وہاں جائے گا جہاں اس کی ضرورت ہوگی۔ اس سے معاشرے کے حالات بدلیں گے۔ یعنی کہاں سڑک بنی ہے یا نہیں بنی' فنڈ کتنا تھا' کتنا لگا ہے اور کتنا کھا لیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں جو ترقیاتی کام ہو رہا ہے اس میں 100 روپے سے 50 روپے کھا لیے جاتے ہیں۔ یہ صورتحال پنجاب کی ہے۔ ابھی میں دوسرے صوبوں کی بات نہیں کر رہا۔ بات یہ ہے کہ آدھا فنڈ تو بنوانے والوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے جن میں ناظمین' ٹھیکیدار اور دیگر لوگ شامل ہیں۔

سوال: ایک سینئر جرنلسٹ کی حیثیت سے آپ کی رائے کیا ہے' کیا حقیقی ایشوز زیر بحث لائے جارہے ہیں؟

شامی صاحب: پاکستان کا حقیقی ایشو اس وقت ملکیت کا معاملہ ہے۔ جس پلاٹ کی ملکیت کا ہی جھگڑا چل رہا ہو اس پر پلازہ تو بعد میں بنے گا۔ ملک کو بنے ساٹھ سال ہو گئے ہیں۔ بدقسمتی سے ابھی تک جھگڑا یہی چل رہا ہے کہ حکومت کرنے کا حق کس کو ہے اور حکومت کیسے بنتی ہے۔ ہم ساٹھ سال سے پرائمری سکول میں ہیں۔ ایک دستور بناتے ہیں۔ پھر اسکو تبدیل کرتے ہیں پھر اسمیں مزید تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ابھی بھی جو جھگڑا ہمارے ہاں ہے وہ وردی کا جھگڑا ہے اور یہ کہ صدر کب تک یونیفارم میں رہ سکتا ہے اور کب تک نہیں رہ سکتا۔ زیادہ دور نہ جائیں اپنے ہمسایہ ملک میں ہی دیکھ لیں۔ حکومت کا معاملہ ایک طے شدہ طریقہ کار سے چل رہا ہے۔ آپ دیکھیں کہ جب ایک نازیبا کارٹون کی اشاعت کا معاملہ ہوا تو ساری دنیا میں جلوس نکلے۔ پاکستان میں بھی جلوس نکلے اور بھارت میں بھی ایسا ہوا۔ ہمارے وزیراعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی مجھ سے پوچھنے لگے کہ بھارت میں کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ بھارت میں بھی جلوس نکلے ہیں اور لاکھوں مسلمان شریک ہوئے ہیں اور کئی غیر مسلم بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں لیکن بھارت اور پاکستان میں فرق ہے۔ انڈیا میں حکومت کو پتہ ہے کہ ان جلوسوں سے میں نے کہیں نہیں جانا اور وہ ٹھنڈ میں ہے اور جلوس نکالنے والوں کو بھی پتہ ہے کہ ہم نے اس خاص ایشو کے اوپر اپنے جذبات کا اظہار کرنا ہے اور ہمارا مقصد حکومت کو گرانا نہیں ہے۔

پاکستان میں صورتحال یہ ہے کہ اگر جلوس نکلے تو حکومت تھر تھر کانپنے لگتی ہے کہ جلوس مجھے لے ڈوبیں گے اور جو جلوس نکالنے والے ہیں وہ بھی اس خوش فہمی بلکہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہمارے اس جلوس سے حکومت ختم ہو جائے گی۔ پاکستان کے آئین میں صدر مملکت کے جانے کا ایک طریقہ کار موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کا مواخذہ ہوگا اور پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت مخالفانہ قرار داد منظور کر دے گی۔ اسی طریقے سے وزیراعظم کے جانے کا بھی ایک طریقہ ہے کہ قومی اسمبلی کی سادہ اکثریت اس کو فارغ کر دے گی۔ اگر ہمارے ملک میں کوئی طے شدہ طریقہ کار ہوتا اور اس طرح صدر اور وزیراعظم آتے اور جاتے تو لاکھوں جلوس نکال لیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ اس ملک کے آئین کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے اور یہ مذاق اب بھی جاری ہے۔ اگر ہمارے ملک میں ایسا نہ ہوتا تو ہمارے جلسے اور جلوسوں سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہاں تو حکومتیں تبدیل کرنے کے دعوے اور نعرے سکوں کے اوپر ہیں اور یہ وہ بات ہے جس کی کوئی شخص پوری ہوش مندی سے تائید نہیں کر سکتا۔

سوال: کیا میں یہ سمجھوں کہ ہم آگے جانے کی بجائے پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔؟

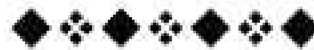
شامی صاحب: بات یہ ہے کہ اگر ہم بلی اور چوہے کی دوڑ میں شریک ہیں اور ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے اس ذریعے سے حکومت تبدیل کرنی ہے یا حکومت یہ سمجھ رہی ہے کہ میں نے اپنی مرضی کا الیکشن ٹھونس دینا ہے پھر تو اللہ تعالیٰ ہی حافظ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام سیاسی جماعتوں کو الیکشن میں حصہ لینے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ یہ تمام پاکستانیوں کا ملک ہے۔ ایک شہری ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں یہ مطالبہ کروں کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک ہونا چاہے جو دوسروں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

تمام سیاسی جماعتوں کا بھی یہ حق ہے اور اس حق کو تسلیم کرنا چاہئے اور کرنا پڑے گا کہ ان کا منصفانہ اور آزادانہ انتخاب کے ذریعے اپنی طاقت منوانے کا موقع دیا جائے۔ حکومت تو ابھی تک الیکشن کمشنر کے اختیارات ہی طے نہیں کر پائی۔ عبوری حکومت بنی ہے لیکن ابھی تک اس کے بارے میں کچھ طے نہیں ہو رہا۔ لہٰذا کب ہم پرائمری سکول سے نکلیں گے اور گریجوایٹ بنیں گے۔ گریجوایٹ اسمبلی تو بنائی ہے لیکن گریجوایٹ رویے نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا ٹی وی چینل انارکی پھیلانے کی تلقین نہیں کر رہے؟

شامی صاحب: کسی ٹی وی چینل یا کسی اخبار نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکومت کو گھر بھیجنے کا ایک اچھا موقع ہے۔ یہ ایک خاموش ایشو ہے جس میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے خلاف صدر کی طرف سے ریفرنس دائر کیا گیا ہے۔ اس کا فیصلہ سپریم کورٹ کے اندر ہی ہونا ہے۔ اب صرف انصاف ہونا ہی نہیں چاہئے بلکہ ہوتا ہوا نظر بھی آنا چاہئے۔ ہمیں تجربوں سے بھی سیکھنا چاہئے۔ تین ججوں پر اعتراض ہوا کہ وہ چیف جسٹس کے کیس میں نہ بیٹھیں۔ اب ان کی مخالفت اور مخاصمت کی کہانی بھی بیان ہو رہی ہے اور طرح طرح کی باتیں بھی سننے میں رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم بیٹھیں گے اور ہم آپ کو ضرور انصاف فراہم کریں گے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو انصاف فراہم رنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ بھٹو صاحب نے بھی اپنے کیس میں مولوی مشتاق پر اعتراض کیا تھا کہ میں نے آپ کو چیف جسٹس نہیں بنایا تھا اس لیے آپ میرے کیس سے ہٹ جائیں لیکن انہوں نے کہا کہ میرا ضمیر مطمئن ہے میں آپ کو انصاف فراہم کروں گا لیکن انہوں نے جو انصاف فراہم کیا وہ سب کے علم میں ہے۔ آج بھی ان کے اس فیصلہ کو تنقیدی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آج وقت نے یہ بتایا ہے کہ مولوی مشتاق صاحب کا وہ رویہ غلط تھا' لوگوں نے اس کو مسترد کیا۔ میں جج صاحبان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہیں انصاف فراہم کرنے کا اتنا شوق کیوں ہے اور اس فرد کو انصاف دینا چاہتے ہیں جو ان سے انصاف کا طالب نہیں۔ بات یہ ہے کہ اب معاملہ سپریم کورٹ کے پاس ہے' وہاں چیف جسٹس کے وکیل بھی پیش ہوں گے اور حکومت کے وکیل بھی اپنے دلائل دیں گے اور جو فیصلہ سپریم کورٹ کرے گی وہ نافذ العمل ہوگا۔ اگرچہ وہ مجھے اور آپ کو قابل قبول ہو یا نہ ہو۔ بھٹو صاحب کے بارے میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ ان کو پھانسی دی جائے لہٰذا وہ پھانسی چڑھا دیئے گئے۔ اب ہم چاہے یہ بحث کرتے رہیں کہ وہ فیصلہ ٹھیک تھا یا غلط تھا' اس میں فلاں چیز غلط تھی لیکن دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ پھانسی تو ہو گئی تھی۔ اب سپریم کورٹ جو بھی فیصلہ کرے گی وہ نافذ العمل ہوگا۔ میں پھر کہوں گا کہ میڈیا نے صرف وہی کچھ دکھایا ہے جو کچھ چیف جسٹس کے ساتھ ہوا ہے لیکن اب فیصلہ سپریم کورٹ نے کرنا ہے۔

(یہ انٹرویو چیف جسٹس کے دورہ کراچی سے پہلے لیا گیا)



عدالتی بحران کے حوالے سے ایک اہم سیمینار

موجودہ بحران ملک کو کمزور کرنے کی سازش ہے اس میں بیرونی ہاتھ بھی ملوث ہوسکتا ہے کیونکہ اس طرح کا بحران نہ تو حکومت اور عدلیہ کے مفاد میں ہے اور نہ ہی ملک کے مفاد میں ہوسکتا ہے۔ اس وقت جو کچھ ہورہا ہے وہ ایک سازش کے تحت ہورہا ہے جو جدوجہد ہورہی ہے اسے قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا چاہئے۔ حکومت وقت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بردباری اور صبر کا مظاہرہ کرے اور وکلاء کی جدوجہد کا بنیادی مقصد آئین کی بالادستی ہونا چاہئے اور اس کی حفاظت ان کا فرض ہے بلکہ لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال کی بہتری ہر شہری کا فرض ہے۔ لیکن بعض شعبے ایسے ہیں جن کی ذمہ داری دوہری ہے اور ذمہ دار لوگوں کو ہی بدامنی پھیلانا زیب نہیں دیتا۔ انہیں محتاط رہ کر دوسرے گروپوں اور سیاسی پارٹیوں کو اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہئے کہ وہ اس مسئلے کو لے کر ناجائز فائدہ اٹھائیں اور اپنی دکانداری چمکائیں۔ وکیل کی حیثیت سے صورتحال کا تجزیہ کرکے قدم اٹھانا چاہئے۔ ان خیالات کا اظہار میر خلیل الرحمٰن میموریل سوسائٹی (جنگ گروپ) اور پنجاب لاء کالج (پنجاب گروپ آف کالجز) کے زیر اہتمام "موجودہ ملکی حالات اور وکلاء کی ذمہ داریاں" کے موضوع پر منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ صدارت جسٹس (ر) عبدالقیوم ملک نے کی۔ دیگر شرکاء میں محمد احسن بھون (صدر لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن)' سید محمد شاہ (صدر ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن)' اختر علی قریشی (اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب)' سرفراز چیمہ (سیکرٹری لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن)' خاور بشیر (سیکرٹری ڈسٹرکٹ کورٹ بار ایسوسی ایشن)' رانا اعجاز احمد (سابق وائس چیئرمین پاکستان بار کونسل)' پروفیسر ظل عاطف (ڈین پنجاب لاء کالج)' پروفیسر ہادیہ اعوان (پرنسپل پنجاب لاء کالج)' عبدالستار نیازی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)' چودھری انور علی گل (ایڈووکیٹ ہائیکورٹ)' میاں محمد حفیظ (ایڈووکیٹ ہائیکورٹ) اور مہرین زہرہ زیدی شامل تھیں۔ تلاوت قرآن پاک کی سعادت قاری شاہد ستار نظامی نے حاصل کی جبکہ ضیاء الرحمٰن بیگ نے ہدیہ نعت پیش کیا۔

جسٹس (ر) ملک عبدالقیوم نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جب جسٹس افتخار محمد چودھری کو غیر فعال بنایا گیا تو میں غالباً پاکستان کا دوسرا شخص تھا جو جسٹس افتخار محمد چودھری کو رات گیارہ بجے ملا اور ان سے تین چار مرتبہ مل چکا ہوں اور وہ بالکل صحت منداور خیریت سے ہیں۔ انہیں کوئی جسمانی مسئلہ نہیں اور وہ بڑے حوصلے کے ساتھ ہیں۔ میں حکومت کو موردالزام نہیں ٹھہراتا۔ ماضی میں جب بھی کسی حکومت نے کسی جج کو مستعفی کیا تو جج استعفیٰ دے کر چلا گیا۔ افتخار چودھری پہلا شخص ہے جو حکومت کے خلاف لڑ رہا ہے۔ میں اس معاملے میں صدر پرویز مشرف کو کوئی دوش نہیں دیتا۔ البتہ ملک کے تمام لاء کالجوں کو چاہئے کہ وہ اس معاملے پر ایسے ماہرین کے ساتھ مباحثے کرائیں جن کی پوری زندگی قانون کے میدان میں گزری ہو۔ وہ اس بارے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ جسٹس قیوم ملک نے مزید کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عدلیہ کے خلاف سازش ہے۔ اور یہ ملک کو کمزور کرنے کی سازش ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس میں کوئی بیرونی ہاتھ بھی ہے۔ اس طرح کا بحران نہ حکومت' نہ عدلیہ اور نہ ملک کے مفاد میں ہے۔ اگر جسٹس افتخار چودھری کا فیصلہ عدلیہ کے حق میں ہوتا ہے تو اس سے حکومت کمزور ہوتی ہے اور اگر ان کیخلاف ہوتا ہے تو عدلیہ کمزور ہوتی ہے۔ یہ دونوں صورتحال ٹھیک نہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے بھی استعفیٰ دیا تھا میرے میں شاید افتخار چودھری جیسی ہمت نہیں تھی۔ وہ ڈٹ گئے میں

کیوں نہیں ڈٹ سکتا پھر کبھی اس کی وجہ بتاؤں گا۔ جسٹس ملک عبدالقیوم نے کہا کہ میری ہمدردیاں مسلم لیگ (ن) کے ساتھ ہیں۔ جسٹس سجاد علی شاہ کے ساتھ اختلاف ہوا۔ جب میاں نواز شریف ان کی عدالت میں پیش ہو گئے تو جسٹس سجاد علی شاہ کو وہ کیس ختم کر دینا چاہئے پھر ان کا حشر کیا ہوا۔ ان کو نہ تو پارلیمنٹ نہ حکومت دونوں نے باہر نہیں پھینکا تھا۔ بلکہ عدلیہ نے خود ان کو باہر پھینک دیا تھا۔ آج کل حکومت مجھ پر کچھ مہربان ہوئی ہے اور کہا کہ آپ ہماری ٹیم میں شامل ہو جائیں۔ یہ بات مجھے جسٹس افتخار چودھری نے کہی تھی۔ میں نے جسٹس افتخار چودھری سے کہا تھا کہ جس طرح آپ کیس لڑ رہے ہیں میں اس طرح نہیں لڑ سکتا۔ میں ایک پروفیشنل وکیل ہوں اس لیے میں آپ کی ٹیم میں فٹ نہیں ہوتا۔ جب حکومت نے مجھے کہا کہ آپ ہمارے وکیل بن جائیں اور ہماری ٹیم میں شامل ہو جائیں۔ میں صدر صاحب کو مشورہ دوں گا کہ صلح کر لیں۔ ان کو غلط گائیڈ کیا گیا ہے اور ان کے مشیروں میں نالائق لوگوں کی ٹیم اکٹھی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۷۰ء میں یہ صورتحال پیدا ہوئی تھی اس وقت آئین موجود نہ تھا۔ اس وقت سپریم جوڈیشل کونسل بھی نہیں تھی اس وقت جسٹس شوکت علی اور کچھ ججوں کے خلاف حکومت نے کارروائی کی تھی۔ اس کو ضرور پڑھیں آپ کو علم ہو جائے گا کہ ۲۰۹ میں کیا ہے۔ اس وقت شیخ شوکت علی نے کہا تھا کہ میں جوڈیشل کام کرتا رہوں گا میرا اپنا خیال ہے کہ جج جج رہتا ہے اور چیف جسٹس، چیف جسٹس رہتا ہے البتہ اسے جوڈیشل کام نہیں کرنا چاہئے۔ جب سے پاکستان بنا ہے ایگزیکٹو نے جوڈیشری کو تسلیم نہیں کیا۔ جسٹس قیوم نے کہا کہ میری سیاست صرف اسلام اور پاکستان ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں میں چودہ سال جج رہا ہوں میں اپنے تمام ساتھیوں کو یہ کہوں گا کہ ججوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے محتاط رہیں۔ مت یہ کہیں کہ فلاں جج کرپٹ ہے یا نہیں۔ ججوں کے مفادات کا تحفظ کرنا بار کا کام ہے جج تو کسی حکومت کو پسند ہوتے۔ یہ تو بار کا کام ہے کہ وہ ججوں کا خیال رکھیں۔ ہم نے کبھی جوڈیشری کو تحفظ فراہم نہیں کیا۔ جسٹس ملک عبدالقیوم نے کہا کہ پاکستان میں کوئی ایسا باپ بتائیں جس نے اپنے بیٹے کی سفارش نہ کی ہو اور جسٹس افتخار چودھری پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ کوئی اتنے جاندار اور مضبوط نہیں ہیں۔ صدر صاحب کو مشورہ دوں گا کہ جن لوگوں نے صدر کو غلط مشورہ دیا ہے ان کو لازمی طور پر فارغ کر دیا جائے اور اگر صدر مشرف اپنی غلطی مان لیں تو اس سے ان کی عظمت بڑھے گی۔ جسٹس قیوم نے مزید کہا کہ میں جب جسٹس افتخار محمد چودھری کو ملنے گیا تو ان کے بیٹے نے کہا کہ میری وجہ سے آج میرے والد پر یہ مصیبت آئی تو میں نے کہا کہ تمہارا مسئلہ نہیں اگر تم نہ ہوتے تو وہ کوئی اور چکر ڈال دیتے۔ انہوں نے کہا کہ اگر جسٹس افتخار نے اپنے بیٹے کی سفارش کی ہے تو سب سے پہلے وزیراعلیٰ بلوچستان کو ڈسمس کر دیں۔ سیکرٹری داخلہ پھر شیرپاؤ اور پھر وزیراعظم کے خلاف کارروائی کی جائے۔ میں اس بات کو سپورٹ نہیں کر رہا یہ میں ویسے بات کر رہا ہوں۔ عدلیہ کو آج کے حالات میں مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ عدلیہ آگے ہی دباؤ میں ہے۔ صدر مشرف نے عدلیہ کو بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے بہر حال اس وقت عدلیہ کا بحران جسٹس سجاد علی شاہ کے دور سے بھی بڑا ہے۔ اس سارے بحران میں ہر کوئی صدر کا نام لے رہا ہے۔ وزیراعظم کا کہیں بھی کوئی ذکر نہیں اور روز وزیراعظم کے انتخاب اور الیکشن کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے۔ جسٹس قیوم ملک نے کہا کہ میں یہاں بیٹھے ہوئے سٹوڈنٹس کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ یونینوں کو بحال کرنے کیلئے کیس کریں۔ میں ان کا وکیل بنتا ہوں اور کوئی فیس نہیں لوں گا۔ پاکستان کو بنانے والے بھی ایک وکیل ہیں اور تحریک پاکستان میں طلباء کا کردار قابل ذکر ہے۔ تصور پاکستان کے خالق کون تھے؟ علامہ اقبال جو وکیل تھے۔ سردار عبدالرب نشتر بھی ایک وکیل تھے۔

احسن بھون (صدر لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آئین شہریوں کے حقوق کے تحفظ اور زندگی گزارنے کے طریق کار کا مسودہ ہے اور اس میں بنیادی حقوق اولین ترجیح کی صورت رکھتے ہیں لیکن اگر ہم آج کی صورتحال دیکھیں تو کیا ہمارا سیٹ اپ آئین کے مطابق نظر آتا ہے تو جواب ملے گا نہیں ایسا نہیں ہے۔ موجودہ صورتحال دیکھتے ہوئے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم نے بطور صحت مند شہری کے رہنا ہے یا ہم نے اپنی آنے والی نسلوں کو بھی غلامی میں چھوڑنا ہے؟ کیونکہ ہمارے ملک کی یہ روایت بن چکی ہے کہ ہر آنے

والا حکمران اپنا لیگل فریم ورک آرڈر لے کر آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ویلفیئر سٹیٹ کیلئے کام کر رہا ہوں۔ موجودہ صورتحال صرف عدلیہ پر ہی اثر انداز نہیں ہو رہی بلکہ یہ پورے معاشرے پر اثر انداز ہوگی کیونکہ ریاست کے کسی ایک ستون کے کمزور ہونے سے اثر تمام ریاست پر ہی پڑے گا۔ نتیجتاً ہم ایک کمزور معاشرے کے طور پر ہی رہ سکیں گے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایک مضبوط قوم اور طاقتور معاشرے کی حیثیت اختیار کریں تو اداروں کو خوف سے آزاد کرنا ہوگا تاکہ وہ بلا حیل وحجت انصاف فراہم کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ صورتحال میں وکلاء نے انتہائی پرامن احتجاج کا سلسلہ شروع کیا۔ ہمارا بنیادی حق تھا اسے ہر طرح سے روکنے کی کوشش کی گئی لیکن ہم ہر پرامن طریقے سے احتجاج جاری رکھیں گے کیونکہ اگر آج ہم نے ایسا نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو بھکاری ورکر دینگے ہر ایک کو اپنی جگہ پر بہتری کیلئے کوشش کرنی چاہئے تاکہ ہمارے ہاں موجود کئی دہائیوں سے غلط نظام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

سید محمد شاہ (صدر لاہور ڈسٹرکٹ بار) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آئین کے آرٹیکل ۲۰۹ میں جن دفعات کے تحت چیف جسٹس آف پاکستان کو غیر فعال بنایا گیا ہے وہ مجھے کہیں نہیں ملیں حکومت نے چیف جسٹس آف پاکستان کے ادارے کو غیر فعال کر کے کوئی اچھا قدم نہیں اٹھایا اور نہ عدلیہ کو اس کا احترام دیا گیا ہے۔ جس کی ضرورت تھی۔ میرے خیال میں پچھلے چند ماہ میں انہوں نے حکومت کی مرضی کے خلاف کچھ ایسے فیصلے کیے جس کی بنیاد پر ان کو اس عہدے سے ہٹایا گیا۔ حالانکہ حکومت کو مذکورہ ڈیپارٹمنٹس کے خلاف کارروائی کرنا چاہئے تھی جن کے خلاف چیف جسٹس نے فیصلے دیئے۔ اصل میں حکومت کو نظر آ رہا تھا کہ عدلیہ شاید حکومت کے خلاف کوئی سخت فیصلہ نہ دے دے۔ اس لیے یہ کیا گیا۔ وکلاء کا احتجاج تو شروع دن سے مشرف حکومت کے خلاف چلتا رہا ہے۔ عدلیہ اور وکلاء لازم وملزوم ہیں بہرحال یہ اقدام کسی طور پر بھی لائق تحسین نہیں۔ ملکی ترقی اور قوانین بنانے اور انصاف دلانے میں وکلا کا بڑا کردار رہا ہے میں تمام وکلاء برادری کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں انہوں نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف آواز اٹھائی اور وکلاء نے ہمیشہ مثبت کردار ادا کیا ہے اور وکلاء پرامن رہنا چاہتے ہیں اور پرامن احتجاج کسی کو روکنے کا اختیار نہیں۔

ہمارے پرامن احتجاج پر سب سے پہلے پولیس نے زیادتی کی ہمارا بالکل یہ مقصد نہیں کہ ہم مشرف کو ہٹانا چاہتے ہیں یا حکومت خود کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی ذاتی مفاد نہ ہم نے کوئی فائدہ لینا ہے۔

اس مسئلے کو حکومت جتنا لمبا کرے گی اتنا ہی اس کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ وکلاء اس ملک کی بقا' عدلیہ اور عوام کی بقاء کیلئے جنگ لڑتے رہیں گے۔

اختر علی قریشی (اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب) وکیل ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو صلاحیت رکھتا ہے کہ صورتحال کو تبدیل کر کے رکھ دے وہ معاشرے کی خدمت کرتا ہے اور قانون اور قانونی معاملات کا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ وکیل نے ہی پاکستان بھی بنایا اور سب سے بڑھ کر وہ عدلیہ کا مستقل حصہ ہے اور ہم عدلیہ پر آج کل بات کر رہے ہیں۔ گو مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ موجودہ صورتحال اختیار کرتا لیکن وکلاء کے موجودہ کردار نے اسے بحران بنا دیا ہے حالانکہ معاشرے کے ذمہ دار افراد ہونے کی حیثیت سے وکلاء کو مہذب اور متاثر کن کردار ادا کرنا چاہئے جو کہ صدیوں سے ان کے مقدس پیشے کا طرہ امتیاز ہے۔

انہوں نے کہا کہ احتجاج ہر شہری کا بنیادی حق ہے لیکن جب وکلاء عدالتوں میں کام کرتے ہیں تو ملک ترقی کر رہا ہوتا ہے اور جب وہ ہڑتالیں کرنے لگیں تو ملک زوال کی طرف گامزن ہو جاتا ہے اور انصاف دلانے والے کام ہی نہ کریں تو انصاف کی فراہمی یک بیک رک جاتی ہے۔ لہٰذا انہیں بجائے سڑکوں پر اس طرح آنے کے مہذب انداز میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں۔

انہوں نے کہا کہ موجودہ صورت حال سپریم جوڈیشل کونسل آف پاکستان کے پاس زیر التواء ایک ریفرنس کا نتیجہ ہے جہاں مسئلہ حل ہوگا

ہمیں مطمئن اور پرسکون رہنا چاہئے یہ ضرور ہے کہ بعض معاملات فوری توجہ کے حامل ہیں تاہم وکیل کی حیثیت سے ہمیں میرٹ اور قانون کی بنیاد پر اس کا منطقی نتیجہ نکالنا چاہئے۔ جذباتیت زیادہ نقصان دہ ہوسکتی ہے اور آخرکار اس ساری صورتحال سے نقصان ملک کا ہی ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھیں ماضی میں بھی اس وجہ سے ہم کئی فیصلے کر بیٹھے ہیں جن کا نتیجہ ہم آج بھی بھگت رہے ہیں۔ ہمیں محتاط رہنا چاہئے اور دوسرے گروپوں اور سیاسی پارٹیوں کو اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہیے کہ وہ ہمارے مسئلے کو لیکر ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ ہمارا پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق ہمیں اخلاقی قدروں سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تاہم ہمارا فرض ہے کہ ہم دوسروں کو بھی ہدایت کریں کہ وہ پرامن اور ذمہ دار رہیں کیونکہ معاملے قانونی اور آئینی ہیں جسے صرف عدالت میں دلائل کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے نہ کہ سڑکوں پر۔ وکیل کی حیثیت سے ہمیں صورتحال کا تجزیہ کرنا چاہیے اور پھر فیصلہ کرنا چاہئے کہ سڑک پر نکلنا اچھا فیصلہ ہے یا عدالت میں بات کرنا۔ انہوں نے کہا کہ سپریم جوڈیشل کونسل کا فیصلہ عوام کی خواہشات کا عکس ہوگا ہمیں دیکھنے اور انتظار کرنے کی پالیسی اپنانی چاہئے۔

سرفراز چیمہ (سیکرٹری ہائیکورٹ بار ایسوی ایشن) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ریاست کے مضبوط ستون پر حملے کا مطلب ہے کہ اس وقت ملک میں نہ قانون کی حکمرانی ہے اور نہ عدلیہ کو آزادی نصیب ہوئی ہے اور اس اقدام کے خلاف پوری وکلاء برادری ایک ساتھ ہے اور انشاء اللہ ملک میں قانون کی بھرپور حکمرانی کیلئے جدوجہد جاری رہے گی۔ انہوں نے کہا کہ قائداعظم نے فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا فوج کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے اور یہ صرف وکلاء کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ موجودہ صورتحال میں اپنا کردار ادا کریں بلکہ ہر ذی شعور شہری کی ذمہ داری ہے جو جمہوریت پسند ہے کہ وہ حصول انصاف کی خاطر اپنا کردار ادا کرے اور ہر سطح پر اپنی ذات کی موجودگی ثابت کرے اور سب سے زیادہ نوجوان نسل سے امید ہے کہ وہ اپنا مستقبل محفوظ کرنے کیلئے صورتحال میں بھرپور دلچسپی لیں اور جو بات انہیں لگے کہ حق ہے اس کی بھرپور سپورٹ کریں۔ انہوں نے کہا کہ وکلاء کا فرض ہے ملک اور اس کے آئین کی حفاظت کریں اور میں امید کرتا ہوں کہ ملک کے غیور عوام بھی ہماری سپورٹ کرینگے۔

خاور بشیر (سیکرٹری ڈسٹرکٹ لاہور بار ایسوی ایشن) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج ملکی حالات جو بھی ہیں وکلاء اس میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور میرے خیال میں معاشرے کے تمام افراد کو اپنی اپنی سطح پر کردار ادا کرنا چاہئے کیونکہ یہ کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ پوری قوم کا معاملہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب کو ہمارے حق میں ہی بولنا چاہئے۔ چاہے مخالفت میں ہوں لیکن اس سے ایک زندہ قوم ہونے کا احساس پیدا ہوگا ایک ایسی قوم کا جو ملکی معاملات کو سمجھتی اور ان کی اہمیت کا ادراک رکھتی ہے۔ یہ وقت کا تقاضا ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ بات عام پائی جاتی ہے کہ جس کا جو دل کیا اس نے کر دیا اور کسی نے احتجاج بھی نہیں کیا۔ ہمارا تاثر ایک گونگی بہری سوسائٹی کا ہے کہ کوئی جو چاہے کرتا رہے اگر ہمارے ذاتی مفادات محفوظ ہیں تو ہمیں کوئی غرض نہیں ہمیں اجتماعی سوچ پیدا کرنا ہوگی۔ اپنا تاثر بدلنا ہوگا میں یہ نہیں کہتا کہ سب لوگ سڑکوں پر نکل آئیں پتھراؤ کریں لاٹھی چارج ہو بلکہ ہر کسی کو اپنی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار ضرور کرنا چاہئے۔ اس طرح سے ایک رائے عامہ ہموار ہوگی اگر آج ہم احتجاج کر رہے ہیں اس اقدام پر تو اس کے پیچھے یہی وجہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جوڈیشل سسٹم کی تباہی اس ملک کو تباہ کر دے گی۔ ہم آئین کو مانتے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

اگر کوئی اقدام غیر آئینی ہوا ہے تو اس پر احتجاج کرنا برحق ہے۔ ماضی میں جن اداروں کو پامال کیا گیا ان سے متعلقہ افراد نے اسے برداشت کر لیا لیکن ہم اس زبردستی کو برداشت نہیں کر سکتے ہم لوگ دلائل سے بات کرتے ہیں اور اس اقدام کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

رانا اعجاز احمد خان (سابق وائس چیئرمین پاکستان بار کونسل) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صدر جنرل پرویز مشرف انتہائی ذمہ دار اور معاملہ فہم انسان ہیں اور انہوں نے بہت سے معاملات خوش اسلوبی سے نبٹائے ہیں لیکن میرے خیال میں موجودہ معاملہ ان کے خلاف اور ملک کے

خلاف بھی ایک سازش ہے۔ان کے نادان مشیروں نے انہیں غلط مشورہ دیا ہے اورانہیں چاہئے کہ وہ فوراً ایسے مشیروں سے چھٹکارا حاصل کریں۔

انورعلی گل (ایڈووکیٹ ہائیکورٹ) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ صورتحال ایک بحران کی شکل اختیار کر چکی ہے۔اس بحرانی کیفیت میں وکلاء اپنی ذمہ داریاں بھرپور طریقے سے ادا کر رہے ہیں لیکن ایک بات جو دکھائی دے رہی ہے کہ دوسرے طبقوں کے لوگ زبانی طور پر تو حمایت کر رہے ہیں تاہم عملی طور پہ بھی معاشرہ کے ہرفرد کو اپنی سطح پر اس صورتحال میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔انہوں نے کہا کہ افہام وتفہیم تمام مسائل کا بہترین حل ہے۔

پروفیسر ظل عاطف (ڈین پنجاب لاء کالج) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آئین میں ریاست کے تین ستون ہیں اوران کا مقصد ایک دوسرے کو چیک اور بیلنس کرنا ہے اس ضمن میں آرٹیکل ۷۴ء آرٹیکل ۹۵ اور آرٹیکل ۲۰۹ بہت اہمیت کے حامل ہیں ان آرٹیکل کے تحت یہ ظاہر ہے کہ صدر' وزیر اعظم اورعدلیہ سب قانون کے تابع اور آئین کے سامنے قابل احتساب ہیں۔آرٹیکل ۲۰۹۔۱۹۷۳ء کے آئین کا اصل آرٹیکل ہے اور یہ تاثر بالکل غلط ہے کہ یہ آٹھویں یا سترھویں ترمیم کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔آرٹیکل ۲۰۹ عدلیہ کی آزادی کا مخالف نہیں بلکہ اس کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

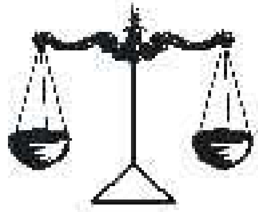
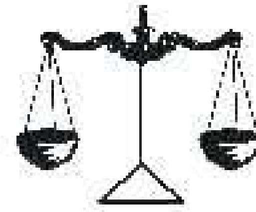
انگلینڈ اورامریکہ میں پارلیمنٹ ججوں کے احتساب میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ہمارا آئین اس لحاظ سے ان سے بہتر ہے کیونکہ عدلیہ ہی عدلیہ کا احتساب کرتی ہے۔

آرٹیکل (۱)۴۸ کے تحت جو کہ پارلیمانی آئین کا طرہ امتیاز ہے اس میں صدر کو وزیر اعظم کی صلاح کے مطابق چلنا ضروری ہے بے شک وہ جوڈیشل ریفرنس ہی کیوں نہ ہو۔

آرٹیکل ۲۶۰ کے تحت جو جج کا لفظ آرٹیکل ۲۰۹ میں استعمال کیا گیا ہے اس میں چیف جسٹس بھی شامل ہیں۔



عدلیہ کی آزادی حقیقت یا خواب

12 مئی
قومی تاریخ کا سیاہ ترین دن

سانحہ کراچی......قومی تاریخ کا بدترین دن

12 مئی کو اگر ملکی تاریخ کا بدترین دن اور سیاہ باب قرار دیا جائے تو اس میں کئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس دن بعض سیاسی قوتوں نے اپنی اپنی سیاسی طاقت کے جھنڈے گاڑھنے کے لئے ملک کے مختلف مقامات پر ریلیوں اور جلسے جلوس کی صورت میں جس جارحانہ انداز میں مظاہرے کئے خصوصاً شہر قائد میں آگ اور خون کا جو کھیل کھیلا گیا اور 30 سے زائد قیمتی جانوں کے ضیاع کے علاوہ جو سینکڑوں کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے اس نے ملک کے 14 کروڑ عوام کو خون کے آنسو رلا دیا ہے۔ 12 مئی کو جس طرح بدترین حالات پیدا کئے گئے اس کے نتیجہ میں کچھ بھی ہوسکتا تھا' تاہم حکومت سندھ کے مشورے سے وفاقی حکومت کے بروقت ہنگامی اقدامات سے صورتحال کو جس طرح کنٹرول کرنے کی کوشش کی گئی اسے غنیمت سمجھنا چاہئے۔ ہماری قومی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ ہم نے کبھی بھی ملک کے قومی یا اجتماعی مفاد کو پیش نظر نہیں رکھا اور ہمیشہ ذاتی مفادات کو ہی قومی مفاد پر ترجیح دی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آزادی کے 23 برس بعد ہمارے ملک کا مشرقی حصہ بنگلہ دیش نہ بنتا مگر مقام افسوس ہے کہ ہم نے کبھی تاریخ سے سبق نہیں سیکھا بلکہ ہم نے ہمیشہ اپنے ملک کی بدترین تاریخ اور افسوسناک واقعات کو دہرانے کی کوشش کی ہے۔ گزشتہ دنوں بھی ملک میں اسی طرز عمل کا مظاہرہ کیا گیا ہے جو بیرونی دنیا میں ہماری جگ ہنسائی کا سبب بنا۔ آج ہم جس المناک صورتحال سے دوچار ہیں اس کی ابتدا چند روز قبل اس وقت ہی جبکہ چیف جسٹس پاکستان افتخار محمد چودھری کے خلاف صدارتی ریفرنس آیا اور اس کے بعد چیف جسٹس صاحب نے اپنے وکلاء کے مشورے سے ملک کے مختلف حصوں میں جلسے جلوس کی صورت میں جا کر بار کونسلوں سے خطاب کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔

اگر چہ خالصتاً ایک قانونی اور آئینی معاملہ تھا مگر بعد میں جب بعض سیاسی پارٹیاں بھی چیف جسٹس کیس میں فریق بنیں تب جوابی ردعمل کے طور پر دیگر سیاسی جماعتوں اور گروپوں نے بھی اپنی اپنی عوامی طاقت کے مظاہرے کیلئے جلسے جلوس اور ریلیوں کے پروگرام ترتیب دینا شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی ناخوشگوار سیاسی فضا بن گئی جس کا نتیجہ گزشتہ دنوں المناک واقعات کی صورت میں نمودار ہوا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جلسے جلوس' سیاسی مظاہرے اور ریلیاں جمہوری عمل کا حصہ ہوتی ہیں مگر ہر چیز کیلئے اس کا ایک مناسب وقت اور منطق ہوتی ہے۔ بلاجواز اور بے مقصد کئی بھی تحریک چلائی جائے اس کا کچھ حاصل حصول نہیں ہوتا مگر بدقسمتی سے ہم نے افراتفری' انارکی اور انا پسندی کے رجحان کو سیاست کا نام دے دیا ہے اور یہ ایسی سیاست ہے جو ہر دو چار سال بعد ہمیں قومی تاریخ کے المناک سانحہ سے دوچار کرتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا ملک اپنوں کی ہی ستم ظریفیوں اور سیاسی غلطیوں کے ذریعے ہمیشہ کسی نہ کسی بحران سے دوچار رہا ہے۔ قائداعظمؒ کے پاکستان کو ہم نے ذاتی مفادات کا میدان جنگ بنا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ابھی تک نہ تو مکمل طور پر جمہوریت پنپ سکی اور نہ ہی اسلامی نظام صحیح طریقے سے نافذ ہوسکا۔ کسی بھی قومی مسئلے پر خواہ وہ آئینی ہو' سیاسی ہو یا قوم کے بہترین مفاد میں کوئی منصوبہ ہو کبھی ہمارے سیاستدانوں کی طرف سے اس پر ایک رائے نہیں آئی۔ کالا باغ ڈیم کا مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ جس کی تعمیر سے ملک زرعی اور اقتصادی طور پر خوشحال ہوسکتا ہے مگر جب بھی یہ ایشو سامنے آتا ہے تو اس پر بعض سیاسی حلقے اپنے تحفظات اور خدشات ظاہر کر کے اس منصوبے کو ناقابل عمل قرار

دے دیتے ہیں۔

12 مئی کو کراچی میں جو کچھ ہوا اور نقص امن و عامہ کا مسئلہ نہیں بلکہ دہشت گردی کا بدترین واقعہ تھا اور جس کے بارے میں ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ اس واقعہ میں ملوث ہر پارٹی کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے کارکن زیادہ تعداد میں مارے گئے ہیں مگر ابھی تک یہ راز نہیں کھل سکا اس دہشت گردی کے پیچھے وہ کون سی اندرونی یا بیرونی قوت تھی جس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا کام دکھایا مگر اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب چند روز قبل متعلقہ فریقوں کو وفاقی حکومت کی طرف سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ سیاسی ریلیاں نکالنے کی صورت میں دہشت گردی کا واقعہ یا کوئی بڑا سانحہ ہو سکتا ہے مگر افسوس کہ سیاسی بصیرت اور بصارت رکھنے کے باوجود ہم نے اپنی سیاسی طاقت کے مظاہرے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور 30 سے زائد قیمتی جانیں اسی انا کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ روشنیوں کے شہر میں جس طرح لاشیں گر رہی تھیں۔ مختلف گروہوں کے درمیان مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ گھیراؤ' جلاؤ اور تشدد کے کھلے عام جو مظاہرے ہو رہے تھے' اسے دیکھ کر تو یہی گمان ہوتا تھا کہ جیسے موت کا رقص ہو رہا ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے یہ سب دیکھ رہے ہیں۔ فریقین میں گولیوں کا تبادلہ اور ہلاکتیں تو رہیں ایک طرف مگر زخمیوں کو ہسپتال لے جانے والی ایک ایمبولینس کے ڈرائیور اور زخمیوں کو جس بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا وہ دہشت گردی کی بدترین مثال ہے۔ ہم سیاسی اقدار اور آئین اور قانون کی پاسداری کرنے کے دعوے تو کرتے ہیں مگر ایک آئینی اور قانونی مسئلے کو جس سے سیاست یا سیاستدانوں کا کوئی تعلق نہیں تھا' صرف یہی نہیں بلکہ جو لوگ براہ راست آئینی ایشو سے متعلق تھے اور جن کا سیاست سے کوئی تعلق تھا وہ سیاستدانوں کے ہمرکاب چلنے لگے اور جن کا آئینی اور قانونی مسئلے سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا انہوں نے اس آئینی مسئلہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی دکانداری چمکانے کی کوشش کی اور جب یہ دونوں فریق اپنی پٹڑی سے اتر گئے تو ایسی عبرت انگیز صورتحال سامنے آئی جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے تو ذمہ دار حکام کافی دنوں سے سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کو خبردار کر رہے تھے کہ وہ موجودہ سیاسی اور آئینی بحران کی فضا میں کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو انسانوں کی ہلاکت اور زمانے میں جگ ہنسائی کا موجب بنے مگر ان سیاسی عناصر اور پارٹیوں کے جارحانہ رویے سے ایسے آثار نظر آ رہے تھے کہ گویا یہ سیاسی عناصر ملک کو تباہی و بربادی سے دوچار کرنے کیلئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ دعویٰ تو ان عناصر کا یہ ہے کہ وہ ملک کی آزادی اور پرامن فضا میں فیئر اور آزادانہ الیکشن چاہتے ہیں۔ ملک میں سیاسی اور جمہوری عمل کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں مگر ان کا قومی طرز عمل رویہ اور اقدامات ان کے زبانی کلامی دعوؤں کی نفی کرتے ہیں۔

12 مئی کا جو سانحہ ہم پر گزر گیا اپنی جان پر کھیلنے والوں کے پیاروں پر جو قیامت گزر گئی' کوئی بتائے کہ ان کا خون کس کی گردن پر ہے اور کس کے ہاتھ پر ان کا خون تلاش کیا جائے۔ جب بھی اس ملک کے طالع آزماؤں کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے کوئی مصیبت اور آفت آتی ہے اس کا خمیازہ اس ملک کے عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ آج جبکہ بیرونی دنیا اور صیہونی طاقتیں پاکستان کو دہشت گردی کی آماجگاہ تصور کرتی ہیں۔ کراچی کے تازہ ترین واقعہ کی روشنی میں وہ ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

اس وقت ملک کی مجموعی سیاسی اور امن و امان کی صورتحال سے وزیرستان اور دیگر قبائلی علاقوں میں جس طرح سے شورش اٹھتی رہتی ہے' پاک افغان سرحدوں پر جو کشیدگی پائی جاتی ہے' قبائلی علاقوں میں لوگ جس طرح سے غیر ملکی جنگجوؤں سے لڑائی لڑ رہے ہیں ان حالات میں مزید اس قسم کی ریلیاں نکال کر اور سیاسی طاقت کے مظاہرے کر کے آخر ہم کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ہی دن میں ایک شہر میں 30 سے زائد قیمتی جانوں کا ضیاع' سینکڑوں زخمی افراد سے ہسپتالوں میں حشر کا سماع بپا ہونا اور کروڑوں روپے کی املاک کا نذر آتش کیا جانا کوئی معمول واقعہ نہیں ہے۔

مگر 12 مئی کے سانحہ کے بارے میں ہمارے قومی سیاستدانوں نے جس قسم کے بیانات دیئے اس میں اصلاح کا پہلو کم اور ایک دوسرے پر

الزام تراشی کا پہلو زیادہ نکلتا ہے۔ اگر ہمارے سیاسی لیڈر اپنا قبلہ درست کرنا چاہتے ہیں تو انہیں قومی سوچ اور جذبے کے تحت آئندہ کیلئے ایسے واقعات کا سدباب کرنے کیلئے اجتماعی پلیٹ فارم سے جدوجہد کرنا ہوگی اور یہ اسی صورت میں ہوگا جب ہماری اپنی صفوں میں اتحاد ہوگا۔ قومی مسائل پر ہماری سوچ میں ہم آہنگی ہوگی اور ملکی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کا جذبہ ہوگا۔ پہلے جو کچھ ہو چکا یہ پوری قوم کیلئے باعث عبرت ہے لیکن اب بھی اگر ہم نے خود اپنا احتساب نہ کیا تو پھر آنے والے وقتوں میں کوئی بھی تاریخ کے احتساب سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

کراچی میں تشدد کے واقعات پر شدید صدمہ ہوا: (بینظیر بھٹو)

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بینظیر بھٹو نے کہا ہے کہ حکومتی پارٹی کی جانب سے کراچی میں خانہ جنگی کے حالات پیدا کیے جا رہے ہیں تاکہ ایمرجنسی لگا کر ڈکٹیٹرشپ کو مستحکم کیا جائے۔ سابق وزیراعظم نے کہا کہ کراچی میں تشدد کے واقعات پر انہیں شدید صدمہ ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسی رپورٹیں موصول ہو رہی ہیں کہ بسوں اور ٹرکوں کے ذریعے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا گھیراؤ کر لیا گیا اور پھر ایم کیو ایم کے کارکنوں، سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں نے ان پر فائرنگ شروع کر دی جس سے 14 کارکن جاں بحق اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ یہ وکلاء کا آئینی اور جمہوری حق ہے کہ وہ چیف جسٹس کا خیر مقدم کریں اور چیف جسٹس کراچی بار سے خطاب کریں لیکن حکومتی سرپرستی میں گولیاں چلائی گئیں اور کراچی کی سڑکوں کو لاشوں سے بھر دیا گیا۔ بینظیر بھٹو نے سپریم کورٹ سے ان واقعات کا از خود نوٹس لینے اور ذمہ داروں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا ہے۔

ایم کیو ایم نے اُسی دن ہی کیوں ریلی نکالی: نواز شریف

سابق وزیراعظم نواز شریف نے کہا ہے کہ ایم کیو ایم نے اگر کراچی میں خونریزی میں حصہ لیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی قوتیں تھیں جنہوں نے ان سے یہ کام کروایا۔ انہوں نے کہا کہ ایم کیو ایم کو چیف جسٹس کی آمد کے دن ہی ریلی نکالنے اور جلسہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے کہا کہ کراچی میں رہنے والے ہر قوم کے فرد کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے مشکل کی گھڑی میں چیف جسٹس کا ساتھ دیا۔ نواز شریف کا کہنا تھا کہ حکومت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ امن و امان کو قابو میں رکھے لیکن کراچی میں تو ایم کیو ایم نے خود قانون کو ہاتھوں میں لے لیا۔

سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا: قاضی حسین احمد

جماعت اسلامی کے امیر اور متحدہ مجلس عمل کے صدر قاضی حسین احمد نے قومی اداروں میں موجود محب وطن عناصر سے اپیل کی ہے کہ وہ اس قومی انتشار اور افراتفری سے ملک کو بچانے کیلئے اپنا کردار ادا کریں۔ انہوں نے موجودہ نازک حالات میں پوری قوم سے پرامن رہنے کی اپیل کی اور کہا کہ کراچی جل رہا ہے، عام لوگ قتل ہو رہے ہیں۔ کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے، بعض عناصر ملک کو صومالیہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور عالمی طاقتیں عالم اسلام میں اندرونی آگ بھڑکانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کراچی میں فائرنگ سے جماعت اسلامی کے 2 کارکن فیصل اور شجاع بھی جاں بحق ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ملک کی موجودہ نازک صورتحال کا حل ایک نمائندہ، دستوری اور سیاسی حکومت کے ذریعے ہی نکل سکتا ہے۔



12 مئی قیامت صغریٰ ایک خوفناک منظر

12 مئی 2007ء ملکی تاریخ میں عدلیہ کی بالادستی' جمہوری عمل کی بحالی اور انسانی حقوق کیلئے جدوجہد کے حوالے سے اہم ترین دن بن چکا ہے وہ دن کراچی کے باسیوں کے لئے قیامت صغریٰ اور پوری قوم کیلئے عبرتناک یادگار بن گیا بلکہ قرمزی صبح نے شہر جانستان کا جلسہ ہی بدلا ہوا پایا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آئین اور قانون کی بالادستی کیلئے نکالی جانے والی پرامن ریلی کو درندوں کے ہاتھوں خون سے نہلا دیا جائے گا انتہائی بے دردی اور سفاکی سے 40 سے زائد معصوم شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور سینکڑوں کو شدید زخموں سے دوچار کر دیا گیا یہ دن اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ یوم حشر کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا صرف تبت سنٹر کراچی کا علاقہ فاتحانہ جشن کا منظر پیش کر رہا تھا جب ایک نجی ٹیلی ویژن نے اس سنٹر میں ہونیوالے مناظر کو دکھانے میں ذرا سی کوتاہی کی اور مقتل میں خزاں دیدہ پتوں کی طرح پے در پے گرنیوالی لاشوں کی تصویر کشی میں کچھ مستعدی دکھائی تو قاتلوں کے دست بازو کو نظر بد سے بچانے کیلئے اس کی عمارت پر گھنٹوں فائرنگ کی گئی متاثرہ افراد نے بااختیار اہلکاروں سے فریادیں بھی کیں لیکن ان کی جانب سے یقین دہانیاں روایتی معشوق کے وعدوں میں ڈھلتی رہیں۔

اس سانحہ پر پوری قوم خون کے آنسو رو رہی تھی ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے محبان وطن نے اسے ملک دشمن سرگرمیوں سے تعبیر کرتے ہوئے وفاقی اور سندھ حکومتوں کو اس کا براہ راست ذمہ دار ٹھہرایا۔ مرنے والوں کی کراہیں' زخمیوں کی چیخیں' بھاگنے والوں کی التجائیں' ماؤں بہنوں کی آہیں' بیواؤں کے بین' یتیموں کی فریادیں ڈھولوں کے شور میں ڈوب گئیں۔ روشنیوں کے شہر اور امن کے گہوارہ کراچی میں ایسا کیوں کروا؟ تجزیہ نگاروں اور کرنٹ افیئرز پر عبور رکھنے والی شخصیات کا کہنا ہے کہ 5 مئی کو چیف جسٹس کی قیادت میں اسلام آباد سے لاہور روانہ ہونے والے کارواں میں ہجوم بے کراں کے سڑکوں پر امڈ آنے سے اقتدار کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو گیا تھا حکومت کو عوام کے اس شدید ردعمل کی توقع نہ تھی ابھی وہ خوف جسم و جاں میں متحرک تھا کہ 12 مئی کو کراچی بار سے خطاب کا خوف ان کے اوسان خطا کر گیا۔ اس اضطرابی کیفیت نے ہی قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کے منصوبے کی تخلیق کی۔ اس اذیت ناک واقعہ پر صوبائی اور وفاقی حکومت تجاہل عارفانہ سے کام لے کر جھاڑی کے اردگرد ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عوام کا کمزور حافظہ ان کی چیرہ دستیوں کو زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ اسی لئے حکومت سندھ کا یہ اعلان کہ متاثرین کی امداد کے لئے کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھی جائے گی' اب یہ وقت تحقیقات کا نہیں بلکہ امن کی بھلائی ہماری اولین ترجیح ہے۔ اس اعلان نے عوام اور سیاستدانوں کے جذبات کی نفی کر کے رکھ دی ہے۔ سیاسی حلقے بالخصوص پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کا کہنا ہے کہ 40 افراد کی لاشیں ایم کیو ایم کا کارنامہ ہے اس پر تاحیات پابندی عائد کی جائے اور عدالتی تحقیقات کرانے کے بعد قائدین کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے وگرنہ یہ بدامنی ناچاکی اور اضطراب کی لہر دوسرے صوبوں تک بھی پہنچے گی بقول عمران خان وقت اس بات کا تقاضا کر رہا ہے کہ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین پر قتل و غارت گری کیخلاف مقدمہ دائر کیا جائے۔ ایسی سیاست کے اسرار و رموز سے آشنا داناؤں کا قول ہے کہ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کیلئے جھوٹ زور و شور سے بولو اور مسلسل بولو یہاں تک کہ سب اسے سچ تسلیم کر لیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایم کیو ایم کے سرکردہ رہنما اپنے کئے پر نادم ہوں۔ پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان پر الزام تراشی کی بارش کر دی ہے کراچی کی دیواروں پر ان کیخلاف غیر اخلاقی جملے تحریر کئے گئے ہیں الطاف حسین کی ہدایت کے مطابق کراچی میں مرد و خواتین پر مشتمل ایک ریلی عمران خان کیخلاف نکال کر عوام کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ جو

کوئی ان کے راستہ کی دیوار بنے گا صفحہ ہستی سے اس کا نام ونشان مٹا دیا جائے گا۔ اب ایم کیو ایم کی ساری سیاست عمران خان کیخلاف گردش میں ہے ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ جب عمران خان اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کی وضاحت کیلئے کراچی میں جلسہ عام میں شرکت کیلئے لاہور سے روانہ ہونے لگے تو انہیں صوبہ سندھ میں ایک ماہ تک داخلے کی پابندی کا نوٹس دیا گیا ساتھ ہی حکومت پنجاب کی طرف سے بھی تین دن تک لاہور سے باہر نہ نکلنے کا حکومتی پروانہ بھی وصول کرایا گیا۔ اس اقدام سے ایم کیو ایم کے بھیانک چہروں کے تمام خدوخال پوری طرح قوم کے سامنے عیاں ہو چکے ہیں اب کوئی ملمع سازی ان چہروں پر روشنی کی کسی کرن کو جھلملا سکتی ہے اور نہ ہی پلاسٹک پیوندکاری سے اسے سنوارا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کراچی کو پراکسی وار کیلئے تیار کیا جا رہا ہے۔ حقیقت میں پہلی مرتبہ عمران خان کی شکل میں مرد آہن لسانی تنظیم کیخلاف میدان میں اترا ہے جس نے ان چالیس افراد کے قاتل الطاف حسین پر لندن میں ان کیخلاف مقدمہ چلانے کا اعلان کیا ہے۔ برطانیہ میں اس سے پہلے جولائی 2005ء کو تاج برطانیہ کی پراسیکیوشن سروس نے افغان ''وارلارڈ'' فریادی زردار کیخلاف افغانستان میں تشدد کی کارروائیوں کے الزام میں کامیابی سے مقدمہ چلایا یہ پہلا مقدمہ تھا جس میں ایک غیرملکی پر برطانیہ سے باہر سرزد ہونے والے جرائم میں برطانیہ کی عدالت نے کامیاب کارروائی کی ہو۔ اس مقدمے سے ماخوذ اصولوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹارچر تشدد ایک عالمی جرم تصور کیا جاتا ہے' جس کیخلاف مقدمہ کسی بھی ملک میں چلایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود کہ اس کا ارتکاب کسی دوسرے ملک میں کیا گیا ہو اس کی توثیق 1999ء میں لالارڈز نے کی جب انہوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ چلی کے لیڈر آگسٹ پنوشے کیخلاف سپین میں جرائم میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے جس کا ارتکاب انہوں نے چلی میں کیا تھا۔ لارڈ براؤن ولکنسن نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ 1984ء کے ایوائن ٹارچر کونشن سے ظاہر ہے کہ کوئی دوسری ریاست تشدد کرنیوالے ایک مجرم کیخلاف مقدمہ چلا سکتی ہے۔ اگر وہ ملک جہاں یہ جرم سرزد ہوا کوئی کارروائی نہ کرے یا وہ ملک کارروائی نہ کرے ٹارچر کرنے والا یہاں کا ایک شہری ہے۔ یہ قومیت وطنیت کے جنرل پبلک انٹرنیشنل لاء کے تحت کیا جا سکتا ہے۔ افغانستان نے مقدمہ چلانے کیلئے برطانیہ سے فریادی زردار کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا تھا اس لئے برطانیہ کے حکام اس بات کے پابند تھے کہ وہ اس کیخلاف برطانیہ میں مقدمہ چلائیں بشرطیکہ عمومی ضوابط پورے کئے جائیں۔ ایم کیو ایم کے بانی الطاف حسین نے 12 مئی 2007ء کو کراچی ایئرپورٹ پر لوگوں کو محصور رکھنے اور انٹرنیشنل فلائٹس منسوخ کرنے کے ذریعے تشدد اور یرغمال کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا جب شہر میں معصوم لوگوں کا قتل عام کیا جا رہا تھا اس کا ثبوت نہ صرف حکومت پاکستان کے 1992ء کے آپریشن سے ملتا ہے بلکہ 12 مئی 2007ء کی ویڈیو کلپس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے مزید برآں الطاف حسین سمیت ایم کیو ایم کے دیگر قائدین کیخلاف پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 147,365,511,427,324,149,148 اور 506 کے تحت ایف آئی آر نمبر 53/07 درج ہے جو دیگر شواہد کے علاوہ ہے۔ لندن سیکرٹریٹ میں بیٹھے اس ملزم اور اس کے شرکاء جرم کیخلاف درج یہ ایف آئی آر ایک مثال ہے۔ 12 مئی کے واقعات سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے۔ ہر آنکھ قتل وغارت گری کے مناظر الیکٹرانک میڈیا پر دیکھ رہی تھی کہ کس طرح سفاکانہ طور پر خون بہایا جا رہا ہے اور امن وامان قائم رکھنے والے ادارے اور رینجرز کے دستے وہاں موجود نہیں تھے۔ جانور بھی تو جنگل کے قانون کا احترام کرتے ہیں اسی لئے وہاں قیامت برپا نہیں ہوتی۔ کاش انسان درندوں کے ڈھنگ ہی سیکھ لیتا اور آج اس فعل کا مرتکب نہ ہوتا۔ یہ ہماری کتنی بدنصیبی ہے کہ ملک میں ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے ہوں تو کوئی فرد آہ وپکار کی جرأت بھی نہ کرے اگر عمران خان نے ایم کیو ایم کی کارستانیوں کا پردہ چاک کرنے کیلئے کراچی جانے کا ارادہ کیا تھا تو اسے آنے دیتے وہ بھی آ کر کراچی کے عوام کو اصل صورتحال سے آگاہ کرتا۔ کیا اس کے اکیلے جانے سے کراچی میں طوفان برپا ہو جانا تھا۔ وہ تو ایک بااصول اور نڈر سیاستدان ہے جو قانون کو کبھی ہاتھ میں نہیں لیتا بلکہ آخری دم تک اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اب اس نے ایم کیو ایم کے قائد کیخلاف انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر انگلینڈ میں مقدمہ دائر کرنے کا جو اعلان کیا ہے وہ کر کے رہے گا۔ اس کے قول وفعل میں آج تک تضاد نہیں دیکھا۔ وہ ارادوں کی مضبوطی کا رونا تو اس دن سے رو رہا ہے جب پاکستان کی عدالتوں پر اس وقت کے حکمران اپنی من مانی کے فیصلوں کیلئے دباؤ ڈالتے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر پاکستان میں عدالتیں آزاد ہو جائیں تو 80 فیصد جرائم ختم ہو جائیں گے۔ انصاف کا بول بالا ہوگا اور ہر شہری سکھ کا سانس لئے اپنے

بچوں کیلئے روزی کمانے میں مصروف ہو جائے گا۔ ایم کیو ایم کے قائدین سرکردہ رہنماؤں اور کارکنان سے بھی درخواست ہے کہ ملک جس نازک دور سے گزر رہا ہے اس میں مقابلہ بازی کی بجائے افہام وتفہیم اور سچ کو سچ کہنے کی جرأت پیدا کی جائے۔ غلط فہمیوں کو ختم کر کے آپس میں بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے اور انسانی حقوق کی پاسداری کیلئے اگر کوئی میدان میں حق کی آواز بلند کرتا ہے تو اس کا ساتھ دیجئے۔ اللہ بھی راضی ہوگا اور اس کی مخلوق بھی۔ حکومت وقت سے بھی استدعا ہے کہ افراد اور جماعتیں کبھی ناگزیر نہیں ہوا کرتیں۔ حکومتوں کو دوام کبھی حاصل نہیں رہا' یہ آتی اور جاتی رہتی ہیں۔ اچھے کارنامے انسان کے دل میں نقش ہو جایا کرتے ہیں اور مخلوق خدا پر رحم کرنیوالے حکمران اگر اس دنیا سے پردہ پوش بھی ہو جائیں تو رعایا اس کے شاندار کارناموں کو ہمیشہ زندہ جاوید رکھتی ہے۔ اس کے برعکس اگر حکمرانوں کی موجودگی میں صرف ایک تنظیم کی خوشنودی کیلئے 40 سے زائد افراد کی معصوم جانوں سے کھیلا جائے' افراتفری اور دہشت گردی کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے اور لاشوں پر تعمیر کئے جانیوالے مصنوعی اقتدار کو ہمیشہ قائم رہنے کا سوچ لیا جائے تو عوام کیسے اپنے حکمرانوں کی کامیابی کیلئے دعا کرے گی۔ یاد رہے کہ ہر شخص کو اللہ کے حضور جا کر حساب بھی دینا ہے۔ وہاں پروٹوکول نہیں ملے گا بلکہ اپنے اعمال ہی کامیابی کا زیور بن سکیں گے۔ کوئی جاں بخشی کرانے والا یا غلط اعمال کے ارتکاب سے چھڑانے والا نہیں ہوگا۔



کراچی میں

منیر اے ملک کے دفتر کی بندش اور خاتمہ

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری جس بے مثال انداز میں بے خوف وخطر آگ میں کودے ہیں اور جس جراتمندی کے ساتھ انہوں نے وقت کے ڈکٹیٹر کو للکارا ہے اور عدلیہ کی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں اس نے ان کی مقبولیت کو عروج پر پہنچا دیا ہے وہ ایک قومی ہیرو بن کر ابھرے ہیں۔ حزب اختلاف کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتیں حتیٰ کہ قوم پرست بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں جبکہ حکمران اتحاد میں شامل جماعتوں کو اس صورت حال کی وجہ سے سخت مشکلات کا سامنا ہے۔ جنرل مشرف کی پالیسیوں اور اقدامات کا ساتھ دینے کی وجہ سے یہ حکمران جماعتیں صدارتی ریفرنس کے معاملے میں بھی کھل کر میدان میں نکلنے پر مجبور ہوگئی ہیں حالانکہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے ساتھ جو بدسلوکی کے واقعات ہوئے اور ان کی جس قدر توہین کی گئی اسے یہ حکمران جماعتیں بھی درست قرار نہیں دے سکتیں لیکن چیف جسٹس کے زبردست عوامی استقبال سے نظریں چرانے کے لئے اب یہ کہا جارہا ہے کہ سارے معاملے کو سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے۔ اسلام آباد سے لاہور تک تاریخی سفر اور بے مثال استقبال نے صورت حال کو یکسر تبدیل کردیا ہے اور ان تمام لوگوں کے حوصلے اور مضبوط ہوگئے ہیں جو چیف جسٹس کی حمایت میں سڑکوں پر نکلے ہوتے ہیں۔

سیکرٹری داخلہ سندھ بریگیڈیئر ریٹائرڈ غلام محمد نے رجسٹرار سپریم کورٹ کو خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ کراچی میں دہشت گردی کا خطرہ ہے اور سیاسی جماعتوں میں تصادم کا خطرہ بھی ہے لہٰذا چیف جسٹس اپنا دورہ ملتوی کردیں۔ اس سے قبل جب چیف جسٹس نے اسلام آباد سے براستہ سڑک (جی ٹی روڈ) لاہور جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا تو وہاں بھی حکومت نے انہیں براستہ سڑک جانے سے روکنے کی بہت کوشش کی تھی اور جہاز کے ذریعہ لاہور جانے کی درخواست دی تھی لیکن چیف جسٹس نے ایک بار پھر مضبوط ارادوں کو عملی شکل دیتے ہوئے جی ٹی روڈ کا سفر اختیار کیا اور یہ سفر تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے انفرادیت پا گیا۔

انتظامیہ نے کراچی میں دہشت گردی کے ایک منصوبے کو ناکام بنانے اور اہم گرفتاریاں کرنے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔

9 مئی کو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی کہ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر اور چیف جسٹس کے وکیل منیر اے ملک کے دفتر کو سیل کردیا گیا ہے۔ کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی (کے بی سی اے) نے یہ کارروائی خاموشی سے کر ڈالی تھی لیکن جہاں جہاں اس کارروائی کی اطلاع پہنچی وہاں سے اس کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی گئی جب منیر اے ملک سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے اس خبر کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ صبح چوکیدار جب دفتر پہنچا تو اس نے گیٹ پر سیل دیکھی اور مجھے بتایا۔ منیر اے ملک کا موبائل فون بھی کچھ گھنٹوں تک بند کردیا گیا تھا اس کے باوجود منیر اے ملک اپنے ذاتی معاملے کو ایشو بنانے سے گریز کرتے رہے دوستوں کے صلاح مشورے پر انہوں نے سندھ ہائی کورٹ میں درخواست دائر کردی۔ کے بی سی اے نے موقف اختیار کیا تھا کہ منیر اے ملک نے رہائشی عمارت میں کمرشل سرگرمی شروع کر رکھی ہے جیسے ہی منیر ملک کی درخواست دائر ہوئی اور ارجنٹ سماعت کی منظوری مل گئی تو اتفاق کی بات تھی کہ عین اس دوران سندھ ہائی کورٹ میں بم رکھے جانے کی اطلاع پر تمام ججز سے عدالتیں خالی کرا

لی گئیں اور بڑی تعداد میں وکلاء عدالتی عملے اور عوام کو ہائی کورٹ کی عمارت سے باہر لایا گیا اور دو گھنٹے تک بم ڈسپوزل سکواڈ نے تلاشی لینے کے بعد ہائی کورٹ بلڈنگ کو کلیئر کر دیا جس کے بعد دو رکنی بنچ نے منیر اے ملک کی درخواست کی سماعت کی اور ان کے دفتر کی سیل کھولنے کا حکم جاری کر دیا اور ہائی کورٹ کو ہدایت کی کہ اپنے سامنے سیل کھلوا کر رپورٹ پیش کریں۔ عدالت نے کے بی سی اے کے ڈپٹی کنٹرولر کو بھی آئندہ پیشی پر طلب کر لیا۔ سندھ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کی وجہ سے وکلاء میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اس سے پہلے سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی جنرل باڈی کے اجلاس میں صدر ابرار حسن ایڈووکیٹ نے پر جوش تقریر کرتے ہوئے کہا کہ منیر اے ملک کا دفتر سیل کر کے حکومت نے 1964ء کے ایوب خان کے دور کی یاد تازہ کر دی۔ آج وکلا برادری حکومت کی جانب سے ہر قسم کے بے ہودہ اقدامات کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہے ہمارے سینے حاضر ہیں جتنے چاہیں تیر چلائے جائیں، ہم ہر ظلم سہنے کے لئے تیار ہیں۔ دراصل اب حکومتی جہاز ڈوب رہا ہے اور جب حکومتیں ختم ہونے والی ہوتی ہیں تو اس قسم کی حماقتیں کی جاتی ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ منیر اے ملک نے رہائشی علاقے میں دفتر بنا رکھا ہے۔ سمجھ نہیں آتی اور آپ کو آئے گی کہ اس علاقے میں اور کتنے ہی دفاتر قائم ہیں اور پھر وکیل کو تو استثنیٰ حاصل ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ وکلاء نے چیف جسٹس کا ساتھ دیا ہے اور ریفرنس کو مسترد کر دیا ہے اور جو لوگ عدلیہ کے سربراہ کو بالوں سے پکڑ کر کھینچ سکتے ہیں، پانچ گھنٹے تک زبردستی حراست میں رکھ سکتے ہیں اور توہین آمیز سلوک روا رکھ سکتے ہیں، ان سے کچھ بھی بعید نہیں وہ منیر اے ملک اور ابرار حسن کا دفتر بھی سیل کر سکتے ہیں۔ ان حکمرانوں کا جہاز ڈوب رہا ہے۔ وکلاء نے تو بڑا اصولی موقف اختیار کر رکھا ہے کہ عدلیہ کو آزاد کرو، دستور کو بحال کرو۔ ملک میں ہر کام دستور کے عین مطابق ہونا چاہئے۔ ہماری جدوجہد جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک عدلیہ کو آزاد نہیں کیا جاتا۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ بے ہودہ ریفرنس واپس لے لیا جائے، وکلاء پہلے بھی قربانیاں دیتے آئے ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔

سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری منیر الرحمان نے بھی دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ حکمران ایسی غلطیاں کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ہر بازی ہار جائیں گے اور وکلاء کے عزم و ہمت کے سامنے وہ ٹک نہیں سکیں گے۔ اب ان کا وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ 24 گھنٹے کے اندر اگر منیر اے ملک کے دفتر کی سیل نہ کھولی گئی تو وکلاء خود اپنے ہاتھ سے یہ سیل کھول دیں گے۔

ملک کے ایک سینئر قانون دان بیرسٹر عزیز اللہ شیخ بھی موجودہ صورت حال پر سخت فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ جس روز منیر اے ملک کے دفتر کو سیل کر دیا گیا اس روز عزیز اللہ شیخ خاص طور پر سندھ ہائی کورٹ بار روم میں آئے اور جنرل باڈی اجلاس میں شرکت کر کے منیر اے ملک کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا۔ بعد ازاں عزیز اللہ شیخ نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے حکومت کے اس اقدام کی مذمت کی اور کہا کہ حکومت کے پیارے وکیل سید شریف الدین پیرزادہ اور اٹارنی جنرل مخدوم علی خان کے دفاتر بھی گھر میں بنے ہوئے ہیں۔ ان کو حکومت نے سیل نہیں کیا۔ منیر اے ملک کے دفتر کو سیل کرنا بدنیتی ظاہر کرتا ہے۔ خود میرا دفتر بھی گھر میں ہے اور وکلاء ویسے بھی مستثنیٰ ہوتے ہیں کیونکہ ہم تو کنسلٹیشن کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ متحدہ قومی موومنٹ کی سٹی حکومت نے منیر اے ملک کا دفتر سیل کر کے غلط کیا ہے۔ میں خود متحدہ کے مقدمات لڑتا رہا ہوں۔ الطاف حسین سمیت کئی رہنماؤں کی پھانسی کی سزاؤں کو ختم کرایا ہے اس لئے میں کہوں گا کہ متحدہ کو اس قومی موومنٹ کے خلاف نہیں جانا چاہئے۔

سابق وزیر قانون عبدالوحید بٹر بھی اس روز سندھ ہائی کورٹ میں ایک مقدمے کی پیروی کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ملک میں فوج کو اقتدار کی عادت پڑ گئی ہے۔ فوج اقتدار نہیں چھوڑے گی اور اسے خوشامدی ہر جگہ ہر شعبہ میں مل جائیں گے کیونکہ یہاں ہر کسی کو کرسی پیاری ہے، نوکری چاہئے۔ جھنڈے والی گاڑی سب کو اچھی لگتی ہے اور اس کے بدلے جو کچھ کرنے کو کہا جاتا ہے سب کرتے ہیں، لہٰذا بہتری کیسے

آئے۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ ہم تو یہ سب کچھ چھوڑ چکے ہیں اور واقعی وہ سادہ زندگی گزار رہے ہیں اور وکالت کر کے خوش ہیں۔

پنجاب کے سابق گورنر شاہد حامد بھی لاکھڑا پاور پلانٹ کی نجکاری سے متعلق ایک مقدمے کی پیروی کے لئے سندھ ہائی کورٹ آئے تو موجودہ عدالتی صورت حال پر انہوں نے بڑے محتاط انداز میں گفتگو کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ریفرنس کی وجہ سے صدر مشرف کی ساکھ کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ صدر کو ریفرنس بھیجنے کا اختیار حاصل ہے لیکن اس معاملے میں کافی مس ہینڈلنگ ہوئی اور جو کچھ ہوا وہ نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ اب بھی حکومت کو چاہئے کہ کوئی حل تلاش کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ کچھ عرصہ قبل صدر جنرل مشرف کو جو خطوط لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں سب سے پہلا خط لکھنے والوں میں میں بھی شامل تھا اور آج بھی اس خط کے ایک ایک لفظ پر قائم ہوں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ جیو ٹی وی پر حملے کے بعد صدر جنرل مشرف نے معافی مانگ لی، اگر اس طرح بدسلوکی کے واقعات کے بعد چیف جسٹس سے معافی مانگ لی جاتی تو کیا ہوتا۔ اس پر وہ خاموش رہے اور مسکرانے لگے۔ انہوں نے جواب نہیں دیا۔ منیر اے ملک کے دفتر کو سیل کرنے کے واقعہ پر انہوں نے کہا کہ یہ غلط ہے، ایسا نہیں کرنا چاہئے، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ نجی ٹی وی چینلز کی نشریات بند کرنے سے متعلق استفسار پر ان کا کہنا تھا کہ یہ بھی غلط ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے۔



کراچی سے ''قانون'' شہر بدر کردیا گیا

12 مئی کو کراچی میں جو کچھ ہوا اس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ 12 اکتوبر 1999ء کو جب جنرل پرویز مشرف سری لنکا سے پاکستان آئے تھے تو کراچی کا یہی قائداعظم انٹرنیشنل ائیر پورٹ بند ہوا تھا اور ساڑھے 7 سال بعد ایک بار پھر کراچی ائیر پورٹ پر ایمرجنسی اور ہائی الرٹ دیکھنے میں آیا، لیکن شہر سے ائیر پورٹ آنے کیلئے تمام راستے بند کردیئے گئے اور تمام چھوٹی بڑی شاہراہوں اور راستوں کو بڑے بڑے کنٹینرز، ٹینکرز اور بھاری گاڑیاں کھڑی کر کے ہر طرح کی ٹریفک کے لئے بند کردیا گیا تھا۔ ائیر پورٹ کے اطراف میں کرفیو کا سماں تھا اور عام آدمی خصوصاً وکلاء کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی۔ متحدہ قومی موومنٹ کے جھنڈے اور کارکن دور دور تک کمانڈنگ پوزیشن میں تھے، رینجرز اور پولیس کے دستے موجود تھے لیکن ان کا کردار خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھا۔ کراچی ائیر پورٹ پر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا طیارہ ٹھیک 12 بجے پہنچ گیا تھا، لیکن ان کے استقبال کیلئے وکلاء برادری اور اس کے رہنما شہر میں جگہ جگہ رکاوٹوں کے باعث ائیر پورٹ نہیں پہنچ سکے تھے۔ ائیر پورٹ کے چاروں اطراف متحدہ قومی موومنٹ کے کارکنوں کی بڑی تعداد میوزک پر الطاف حسین کی حمایت میں زبردست نعرے بازی کررہی تھی، جبکہ ائیر پورٹ کی پہلی منزل پر متحدہ کے کارکنوں کی ایک ٹولی یہ نعرے لگارہی تھی کہ ائیر پورٹ کے چاروں طرف ''حق پرست حق پرست، وقت کی کھلی کتاب الطاف الطاف''۔ شہر میں جگہ جگہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور دھوئیں کے بادل دکھائی دے رہے تھے اور فائرنگ کی وجہ سے متعدد افراد زخمی اور ہلاک ہو گئے اور پورا شہر انتہائی کشیدہ صورت حال پیش کررہا تھا۔

متحدہ قومی موومنٹ نے 12 مئی کو اپنی ریلی منعقد کر کے اور شہر کو عملی طور پر بلاک کر کے یہ بات واضح کردی کہ اپوزیشن جماعتیں اگر عدلیہ کی آڑ میں سیاست کریں گی تو اس سیاسی بازی گری کا جواب بھی سیاست سے دیا جائے گا۔ جس بھرپور انداز میں متحدہ قومی موومنٹ نے اپنی سیاسی طاقت اور قوت کا مظاہرہ کیا اس سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ متحدہ کی قیادت نے اسے اپنی بقاء کا معاملہ سمجھتے ہوئے فیصلہ کرلیا تھا کہ کسی قیمت پر بھی کراچی میں وہ کچھ نہیں ہونے دیا جائے گا جو کچھ 5 مئی کو اسلام آباد سے لاہور تک کے سفر میں ہوا تھا۔ متحدہ قومی موومنٹ کے نقطہ نظر کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری طے شدہ پروگرام کے تحت کراچی ائیر پورٹ سے ملیر بار اور وہاں سے مزار قائد، پھر سٹی کورٹ اور وہاں سے سندھ ہائی کورٹ چلے جاتے تو ان کا استقبال کرنے کے لئے وکلاء کی بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ مختلف اپوزیشن جماعتوں اور دیگر تنظیموں اور سول سوسائٹی کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد بھی جلوس میں شامل ہوجاتی اور کئی گھنٹے کی مسافت کے بعد جب یہ جلوس چیف جسٹس کی قیادت میں اپنی منزل تک پہنچتا تو وہاں زوردار تقاریر ہوتیں اور سیاسی جماعتوں کو حکومت مخالف باتیں کرنے کا موقع بھی مل جاتا۔ چیف جسٹس کے بارے میں وکلاء کو یقین تھا کہ وہ کوئی سیاسی تقریر نہیں کریں گے، لیکن اپوزیشن جماعتیں چیف جسٹس کے جلوس کو لاکھوں کا اجتماع ظاہر کر کے یہ دعویٰ کرسکتی تھیں کہ کراچی سے ایم کیو ایم کا صفایا کردیا گیا اور کراچی کے عوام نے اپنا فیصلہ چیف جسٹس کے حق میں دے دیا ہے اور صدارتی ریفرنس مسترد کردیا گیا ہے۔ اپوزیشن کی جانب سے اس ممکنہ دعویٰ کا توڑ کرتے ہوئے متحدہ قومی موومنٹ کی قیادت نے 12 مئی کو ہی اپنی ریلی نکالنے کا اٹل فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں بعض حلقوں کی جانب سے یہ تجویز سامنے آنے کے باوجود کہ ریلی کسی اور تاریخ کو یا کسی اور مقام پر کرلی جائے، متحدہ کی قیادت نے

اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور قائد الطاف حسین کے اعلان کے مطابق تبت سینٹر پر بہت بڑی ریلی منعقد کی گئی۔

12 مئی کو جو لاشیں گریں ان کا خون کس کے سر جائے گا؟ یہ سوال سب سے اہم کیوں ہے کیونکہ نقصان ناقابل تلافی ہے۔ جن کے گھروں کے پیارے چلے گئے ہیں وہ کسی طرح واپس نہیں آسکتے۔ حکومت سندھ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ دہشت گردی کا خطرہ موجود ہے اسلئے چیف جسٹس کو دورۂ کراچی ملتوی کرنے کی درخواست دی گئی تھی۔ دوسری جانب چیف جسٹس کے وکلاء نے بھی کہہ دیا تھا کہ امن وامان کی ذمہ داری حکومت سندھ کی ہے۔ 12 مئی کو چیف جسٹس کے ساتھ اسلام آباد سے کراچی آنے والے وکلاء نے بھی شہر میں ہونے والی ہلاکتوں کی ذمہ داری حکومت سندھ پر عائد کرتے ہوئے کہا کہ اس سے بڑی توہین عدالت اور کیا ہو سکتی ہے کہ چیف جسٹس کو شہر کے اندر داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ جب وزیر اعلیٰ سندھ کی جانب سے چیف جسٹس کے ساتھ آنے والے وکلاء کی سندھ بدری کا حکم جاری ہوا تو پیپلز پارٹی کے ایم این اے اور راولپنڈی بار کے عہدیدار زمرد خان ایڈووکیٹ ائیر پورٹ لاؤنج سے باہر آئے اور انہوں نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ ہم میں سے کوئی بھی واپس نہیں جائے گا، ہم چیف جسٹس کے ساتھ آئے ہیں اور ان کے ساتھ ہی جائیں گے۔ زمرد خان کے مطابق جب چیف جسٹس کراچی پہنچے تو انہیں زبردستی ایک گاڑی میں بٹھانے کی کوشش بھی کی گئی تھی، جسے وکلاء نے مزاحمت کر کے ناکام بنا دیا تھا۔ اس کے بعد چیف جسٹس کو ائیر پورٹ لاؤنج میں بٹھا دیا گیا تھا لیکن وہاں ٹی وی چینلز کی نشریات نہیں آ رہی تھیں، وہاں حکومت سندھ اور سٹی گورنمنٹ کراچی کے بعض حکام نے چیف جسٹس سے ملاقات کی اور انہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے سندھ ہائی کورٹ کی طرف جانے پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن چیف جسٹس نے ہیلی کاپٹر پر جانے سے صاف انکار کر دیا اور اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ میرے میزبان وکلاء سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے عہدیداروں کو ائیر پورٹ آنے دیا جائے اور ان سے ملاقات کرائی جائے۔

سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر ابرار حسن نے واضح کر دیا تھا کہ ہم اپنے ممبران کو نہیں مروائیں گے اور جب حالات بہتر ہوں گے پھر ہی ائیر پورٹ جا کر چیف جسٹس سے ملاقات کریں گے۔ اس سے قبل 12 مئی کو جب سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صبیح الدین احمد سندھ ہائی کورٹ پہنچے تو وکلاء نے ان سے شکایت کی تھی کہ شہر میں رکاوٹیں کھڑی کر کے راستے بند کر دیئے گئے ہیں، ائیر پورٹ کی طرف جانے کی اجازت نہیں دی جا رہی اور وکلاء پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ اس پر چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ نے سوموٹو ایکشن لیتے ہوئے اعلیٰ صوبائی حکام کو طلب کر لیا تھا اور انہیں شہر سے رکاوٹیں ہٹانے کی ہدایت کی تھی۔ ابھی چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ کی ہدایات پر عمل درآمد شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ شہر کے مختلف علاقوں میں فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر بعد ازاں چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ نے انتظامیہ کے اعلیٰ حکام کو دوبارہ بلا کر تنبیہ کی کہ دو گھنٹے کے اندر تمام راستے صاف کرائے جائیں، ورنہ میں خود چل کر صورت حال کا جائزہ لوں گا۔ اس کے بعد شہر میں صورت حال میں بہتری آنی شروع ہو گئی اور پھر سپریم کورٹ کراچی رجسٹری کے ڈپٹی رجسٹرار مقبول احمد منگریو اور سکھر بار کے صدر امداد اعوان ایڈووکیٹ ائیر پورٹ پہنچے۔ وہ اپنے ہمراہ چیف جسٹس کو لینے کیلئے ایک بڑی جیپ بھی لائے جس پر جج کا جھنڈا بھی لگا ہوا تھا۔ امداد اعوان نے صحافیوں کو بتایا کہ ہم چیف جسٹس کو لینے آئے ہیں اور انشاءاللہ گھنٹے بھر میں انہیں اپنے ساتھ لے کر سندھ ہائی کورٹ جائیں گے۔ اس دوران اطلاعات آئیں کہ تبت سنٹر پر ایم کیو ایم کی ریلی سے خطاب شروع ہو گیا ہے۔ ائیر پورٹ پر یہ منظر تھا کہ مسافر تھکن سے چور تھے، اندرون ملک اور بیرون ملک آنے جانے والی پروازوں کی آمد و رفت میں مسلسل تبدیلی پروگرام کے اعلانات کیے جا رہے تھے۔ اس دوران یہ اطلاعات بھی آ رہی تھیں کہ حکومت سندھ نے فوج بھیجنے کی درخواست کی ہے اور وفاقی حکومت فوج بھیجنے پر غور کر رہی ہے جبکہ رینجرز کو شہر کا انتظام دینے کی اطلاعات بھی گردش کر رہی تھیں۔ گورنر سندھ اور وزیر اعلیٰ سندھ کے ٹی وی انٹرویوز اور تبت سینٹر پر الطاف حسین کی تقریر پر بھی لوگوں کی توجہ مرکوز تھی۔ نماز مغرب کا وقت ہو چکا تھا، جب ڈی آئی جی مشتاق شاہ ائیر پورٹ پہنچے۔ وہ جیسے ہی گاڑی سے اترے صحافیوں اور سیاسی کارکنوں نے ان کو گھیر کر نعرے بازی شروع کر دی تھی۔ مشتاق شاہ نے حکومت مخالف نعروں کی گونج میں کہا کہ میرا کام شاہراہ فیصل کو کھولنا تھا وہ کھل گئی ہے، اس کے علاوہ شہر میں جو صورت حال ہے اس کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ وہاں

موجود افراد نے "قاتل قاتل" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور کہا کہ خون کا حساب دو۔ اس پر مشتاق شاہ نے وہاں سے فوراً چلے جانے میں ہی عافیت سمجھی اور الٹے قدموں گاڑی میں بیٹھ کر ائیرپورٹ سے روانہ ہو گئے۔ ائیرپورٹ پر موجود صحافیوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ "آج" ٹی وی چینل پر حملہ ہو گیا ہے تو انہوں نے ائیرپورٹ کے سامنے دھرنا دیا اور "آج" ٹی وی پر حملے اور صحافیوں پر تشدد کے واقعات کی مذمت کرتے ہوئے اسے آزادی صحافت پر حملہ قرار دیا۔ اس موقع پر صحافتی تنظیموں کے رہنما مظفر عباس، ضرار خان اور دیگر نے خطاب کیا اور "آج" ٹی وی پر حملے میں ملوث افراد کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے پیر کو ملک بھر میں صحافیوں کی جانب سے یوم سیاہ منانے کا اعلان بھی کیا۔ اس دوران اطلاع آئی کہ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر منیر اے ملک نے بھی پیر کو ملک بھر میں وکلاء کی ہڑتال کی کال دے دی، جبکہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے 2 وکلاء اعتزاز احسن اور علی احمد کرد کو کیس کی تیاری کے لئے اسلام آباد واپس جانے کی ہدایت کر دی، جس پر وہ دونوں کراچی ائیرپورٹ سے باہر آئے بغیر تقریباً 7 گھنٹے بعد وہیں سے اسلام آباد کیلئے روانہ ہو گئے جہاں پیر کو سپریم کورٹ میں فل کورٹ کی سماعت شروع ہونے والی تھی۔

ائیرپورٹ سے لے کر سندھ ہائی کورٹ تک جس کسی سے بات ہو رہی تھی وہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ برا ہوا ہے، قیمتی جانی نقصان ہوا ہے جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مختلف علاقوں سے آنے والی فون کالوں پر بتایا جا رہا تھا کہ شہر کے حالات انتہائی کشیدہ ہیں اور جگہ جگہ جلاؤ گھیراؤ اور فائرنگ ہو رہی ہے۔ اسپتالوں میں ایک روز پہلے ہی ایمرجنسی لگا دی گئی تھی اور یہ خدشات درست ثابت ہوئے اور زخمیوں کے ساتھ ساتھ مرنے والوں کی نعشیں بھی اسپتالوں میں آتی رہیں۔ بعض علاقوں میں شدید فائرنگ اور پرتشدد واقعات کی وجہ سے زخمیوں کو اسپتال پہنچانے میں کافی وقت لگا اور مشکلات پیش آئیں۔

گورنر سندھ نے ایک رات قبل تمام تعلیمی ادارے بند کرنے کے ساتھ ساتھ لوکل ہالیڈے کا اعلان کر دیا تھا اور یہ اعلان بالکل درست تھا کہ جو صورت حال شہر میں بن چکی تھی اس میں اسکول، کالج جانے اور دفتر جانا ممکن نہیں رہا تھا۔

ابتدائی اطلاعات کے مطابق اس روز کراچی میں 36 ہلاکتیں ہوئیں اور 115 لوگ زخمی ہوئے۔ مختلف اسپتالوں میں جو لاشیں لائی گئیں ان کی شناخت کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ ہلاک ہونے والوں میں اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ ساتھ خود متحدہ قومی موومنٹ کے کارکنان بھی شامل تھے۔ تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین نے ان ہلاکتوں پر گہرے افسوس اور دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے کارکنوں اور عوام سے پرامن رہنے اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کی اپیل کی جبکہ اگلا دن یوم سوگ، یوم سیاہ اور یوم ہڑتال کے طور پر منانے کا اعلان بھی کیا گیا۔

ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کا کہنا تھا کہ ہم پرامن لوگ ہیں اور ہم نے کبھی قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا، ہمارے کارکنان مارے گئے ہیں، ہمارے اوپر حملہ ہوا ہے لیکن کارکن صبر، تحمل کا مظاہرہ کریں اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں، یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

سابق وزیراعظم نواز شریف نے سخت لب و لہجہ میں کہا کہ اب صدر مشرف کے استعفے سے کم پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ کراچی میں سب کچھ ان کے ایماء پر ہوا ہے اور جو ہلاکتیں ہوئی ہیں وہ بہت افسوسناک ہیں۔

سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے بھی کراچی کے حالات پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے حکومت کی ناکامی قرار دیا۔

اے این پی کے رہنما اسفند یار ولی کا ردعمل شدید تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ یہ رات اللہ کرے کسی طرح امن سے گزر جائے پھر کل کا فیصلہ کل ہی کریں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ گولیاں چلاتے ہیں، قتل کرتے ہیں پھر وہ خود مظلوم بھی بن جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کارکنوں اور ہمدردوں کو کہا کہ اب ہڑتال کریں، دکانیں اور کاروبار بند رکھیں۔

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری 9 گھنٹے تک جب ائیرپورٹ پر بیٹھے رہے اور شہر کے کشیدہ حالات بہتر ہونے اور اپنے میزبان وکلاء کی آمد کا انتظار کرتے رہنے کے بعد رات 9 بج کر 12 منٹ پر کراچی سے پی کے 308 پر واپس اسلام آباد چلے گئے تو ائیرپورٹ پر ان کے جانے کے بعد

کھول دیا گیا۔ چیف جسٹس واپس جانے کیلئے تیار نہیں تھے لیکن جب حکومت نے ان کے ساتھ آنے والے 25 وکلاء میں سے 10 کو واپس بھیجنے کے احکامات دیئے اور کراچی چھوڑنے کے لئے کہا تو پھر چیف جسٹس نے بھی احتجاجاً ان کے ہمراہ واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ سندھ ہائی کورٹ بار ایسو سی ایشن کے صدر ابرار حسن نے سپریم کورٹ گولڈن جوبلی کی تقریب ملتوی کردی اور بتایا کہ آئندہ تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

سب سے اہم سوال یہ سامنے آیا کہ جب لاشیں گر رہی تھیں، لوگ زخمی ہو رہے تھے اور کھلے عام اسلحہ نظر آ رہا تھا تو قانون نافذ کرنے والے ادارے اور ان کے اہلکار بت بنے کیوں کھڑے تھے؟ انہوں نے اپنا کردار کیوں ادا نہیں کیا؟ یہ بھی اطلاعات تھیں کہ جب سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے سوموٹو ایکشن لے کر راستے کھولنے کی ہدایت کی تو صوبائی حکام نے اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا اور جب کور کمانڈر آفس کو ہدایت کی گئی تو اس نے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ لوگ حیران ہیں کہ اتنا زیادہ اسلحہ کیسے آ گیا اور سادہ کپڑوں میں گولیاں چلانے والے نوجوان کون تھے؟ ''آج'' ٹی وی پر مسلسل 6 گھنٹے تک اطراف سے فائرنگ کی جاتی رہی، اس بلڈنگ کا ایک حصہ شیشے کا بنا ہوا ہے گولیاں وہاں سے اندر داخل ہوتی رہیں، وہاں پارکنگ میں موجود گاڑیاں جلا دی گئیں۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ سب کس نے کیا اور قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں کیوں نہ آئے، دہشت گردی کرنے والوں کو فری ہینڈ کیوں دیا گیا۔ جب سیکرٹری داخلہ سندھ نے باقاعدہ خط لکھ کر دہشت گردی کے خطرے کا اظہار کر دیا تھا تو پھر کراچی کا کنٹرول پہلے سے ہی رینجرز کے حوالے کیوں نہیں کیا گیا۔ عین فائرنگ کے دوران جب فوج بلانے کی درخواست کی گئی تو یہ درخواست پہلے سے بھی کی جا سکتی تھی اور فوج کو الرٹ رکھ کر صورت حال بگڑنے سے پہلے ہی حالات پر امن رکھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ مگر اب یہ سب سوالات ایسے ہیں جن کے ابھی جواب دیئے جائیں، جو لوگ ہلاک ہو چکے وہ واپس آنے والے نہیں ہیں، جنہیں زخم آئے ہیں وہ انہیں بھول نہیں سکتے۔ اب ملک کیلئے خیر کی دعا کرنے کا موقع ہے کیونکہ عدالتی بحران نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے، اب اس بحران میں انسانی خون شامل ہو گیا ہے اور بہت ہی خطرناک بات یہ ہے کہ رجحان زیادہ آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ اپوزیشن کے رہنما اور وکلاء برادری سوال اٹھا رہی ہے کہ چیف جسٹس نے مختلف شہروں کا دورہ کیا، لیکن پر تشدد واقعات اور ہلاکتیں صرف کراچی میں کیوں ہوئیں؟ کیا پیغام ملتا ہے، کون ذمہ دار ہے؟ یقیناً ماضی کی طرح عوام اب بھی جانتے ہیں کہ ایک دوسرے پر الزامات کا سلسلہ جاری رہے گا اور جن لوگوں نے گولیاں چلائیں اور قتل کئے ان کی گرفتاری اور انہیں سزا ملنا آسان نہیں ہوگا۔ یہی ہمارے سسٹم اور ملک کا بڑا المیہ ہے کہ کسی بھی بڑے سانحہ، حادثے اور دہشت گردی کے ذمہ داروں کا تعین نہیں ہو پاتا اور ان کو سزا بھی نہیں مل پاتی۔ کراچی میں تو انسانی خون ایک عرصے سے ارزاں ہو چکا ہے۔



نازک ترین حالات اور غیر یقینی صورتحال

دسمبر 1971ء کے سقوط ڈھاکہ کے المیے کے بعد آج پاکستان شاید سب سے مشکل بحران سے دوچار ہے۔ جسٹس افتخار کیس کی وجہ سے پورے ملک میں ایک ہیجان ہے جو 9 مارچ کے بعد سنگین سے سنگین تر ہوتا چلا گیا ہے۔ آج (بروز منگل) سپریم کورٹ کا بڑا بنچ یہ فیصلہ کرنے والا ہے کہ جسٹس افتخار کی درخواست قابل سماعت ہے یا نہیں۔ جو بھی فیصلہ آئے گا اس کے اپنے نتائج ہوں گے۔ درخواست کو قابل سماعت قرار دیا گیا تو مقدمے کے انجام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل نہیں رہے گا۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی آئینی پٹیشن اور اس نوعیت کی دیگر آئینی درخواستوں کی سماعت کے دوران فل کورٹ نے ابزرویشن دی ہے کہ نتائج سے بے نیاز ہو کر اس کیس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ ایک موقع پر فل کورٹ کے سربراہ جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے نے سوالیہ انداز میں آبزرویشن دی کہ اگر چیف جسٹس کو بحال کیا گیا تو وہ از خود مستعفی تو نہیں ہو جائیں گے؟ جس پر وکیل استغاثہ نے کہا کہ عدالت کو اپنے چیف جسٹس پر فخر کرنا چاہئے کہ انہوں نے کل بھی استعفیٰ دینے سے انکار کیا تھا اور آئندہ بھی مستعفی نہیں ہوں گے۔ چیف جسٹس کے وکیل چودھری اعتزاز احسن نے مسلسل چوتھے روز دلائل دیتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ یہ تو طے ہے کہ صدر کی رائے کو آئین کے آرٹیکل 211 کے تحت تحفظ حاصل نہیں تاہم اس کیس میں عدالت کو یہ جائزہ لینا چاہئے کہ سپریم جوڈیشل کونسل کو چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس کی انکوائری کا اختیار حاصل ہے یا نہیں ہے؟ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکیل اعتزاز احسن نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ آئین کے آرٹیکل (58(2B کے تحت حکومت کی برطرفی اور اسمبلیوں کی تحلیل صدر کا صوابدیدی اختیار ہے تاہم عدالت نے اس معاملے میں بھی مداخلت کر کے اپنا دائرہ اختیار استعمال کیا ہے۔ حاجی سیف اللہ کیس میں سپریم کورٹ نے جونیجو حکومت کی برطرفی کو غیر آئینی قرار دیا تاہم اسمبلیاں بحال نہیں کی گئیں جبکہ نواز شریف کیس میں حکومت اور اسمبلی بحال کر دی گئی جبکہ آرٹیکل (5)209 میں صدر اختیار استعمال کرنے سے پہلے رائے دیتے ہیں۔ عدالت عظمیٰ کو اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ کہیں یہ رائے آمرانہ اور گمراہ کن تو نہیں ہے اور ایک آزاد اور ایماندار جج کو کیوں نکالا گیا۔ کیا ان کے کسی فیصلے سے حکومت ناراض تو نہیں تھی' بدنیتی کا معاملہ بہرحال اس عدالت نے طے کرنا ہے کیونکہ اگر کسی جج سے حکومت خوش نہ ہو تو وزیراعظم صدر کو مشورہ دیں گے اور جج فارغ ہو گا اگر یہ سلسلہ چل نکلا تو کوئی جج نہیں بچ سکے گا۔

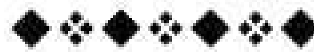
ادھر سندھ ہائیکورٹ کے فل بنچ نے کہا ہے کہ بارہ مئی کو جو ہوا وہ سب کو معلوم ہے اور عدالت تمام واقعات کی تہہ میں جا کر جاننا چاہتی ہے کہ یہ واقعات کیسے رونما ہوئے۔ سندھ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس صبیح الدین احمد کی جانب سے بارہ مئی کے واقعات کا از خود نوٹس لینے کے بعد ہائیکورٹ کے سینئر جج جسٹس سرمد جلال عثمانی کی سربراہی میں سات رکنی بنچ نے پیر کو اس مقدمے کی پہلی سماعت کی۔ بنچ میں جسٹس انور ظہیر جمالی' جسٹس مشیر عالم' جسٹس عزیز اللہ میمن' جسٹس خلجی عارف حسین' جسٹس مقبول باقر اور جسٹس علی سائیں ڈنو میتلو شامل ہیں۔ سماعت کے موقع پر چیف سیکرٹری سندھ' سیکرٹری داخلہ' آئی جی سندھ پولیس' سی سی پی او رٹی پی او صدر پیش ہوئے۔ اس موقع پر وکلاء کی ایک بڑی تعداد کمرہ عدالت کے اندر اور باہر موجود تھی۔ فل بنچ نے کہا کہ آئندہ سماعت کے موقع پر تمام افسران کو پیش ہونے کی ضرورت نہیں اور جسے طلب کیا جائے وہ حاضر ہو' وکلاء کی شکایت پر

عدالت نے ہدایت کی کہ بارہ مئی کو جو وکلاء متاثر ہوئے ہیں وہ اپنی بار ایسوسی ایشن کے صدور کو حلف نامے فراہم کریں جو وہ عدالت میں پیش کریں گے۔ عدالت نے بتایا کہ انہیں یہ درخواست موصول ہوئی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ توہین عدالت کے مقدمے کی سماعت کے موقع پر افسران سے نازیبا رویہ اختیار کیا گیا ہے اور غلط قسم کی نعرہ بازی کی گئی۔ سندھ ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری منیب الرحمٰن شیخ نے عدالت کو بتایا کہ بار نے اپنے تمام ممبران کو نظم وضبط کا مظاہرہ کرنے کو کہا ہے اور وہ آج افسران کو گیٹ سے خود لے کر آئے ہیں تاکہ انہیں بحفاظت عدالت تک پہنچایا جائے۔ عدالت نے قانونی اور آئینی ماہرین کو معاونت کے لئے مقرر کرتے ہوئے سماعت یکم جون کی صبح تک ملتوی کر دی۔ عدالت عالیہ نے تمام فریقین کو یکم جون کو کومنٹس داخل کرانے کا حکم دیا۔ لارجر بنچ نے سندھ ہائیکورٹ بار' کراچی بار' ملیر بار ایسوسی ایشن اور سندھ بار کونسل کے وائس چیئرمین کو ہدایت دی کہ وہ آئندہ سماعت پر اپنے حلف نامے داخل کرائیں۔ ڈائریکٹر جنرل رینجرز کی جانب سے فیڈرل اسٹینڈنگ کونسل محمود عالم رضوی عدالت میں پیش ہوئے کارروائی کے دوران چیف سیکرٹری سندھ نے عدالت سے درخواست کی کہ انہیں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اس موقع پر جسٹس جناب سرمد جلال عثمانی نے کہا کہ یہ توہین عدالت کی کارروائی نہیں بلکہ ازخود نوٹس کی کارروائی ہے لہٰذا اس میں مدعا علیہان کو بذات خود پیش ہونے کی ضرورت نہیں تاہم عدالت جب بھی کسی کو طلب کرے گی تو اسے حاضر ہونا پڑے گا۔ اس موقع پر پولیس افسران کی جانب سے اس امر کا خدشہ ظاہر کیا گیا کہ کہیں وکلاء ہم سے بدتمیزی یا لڑائی جھگڑا نہ کریں' جس پر ہائیکورٹ بار کے جنرل سیکرٹری منیب الرحمٰن اظہر صدیقی نے کہا کہ ہم انہیں اپنے تحفظ میں لے کر آئے ہیں اور عدالت کے احکامات کی تعمیل کی ہے۔ قبل ازیں چیف سیکرٹری سندھ کی جانب سے سندھ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کو بذریعہ رجسٹرار ایک درخواست موصول ہوئی تھی کہ ہمیں وکلاء سے خطرہ ہے کہ ہمارے ساتھ ناروا سلوک نہ کیا جائے جس پر چیف جسٹس سندھ ہائیکورٹ نے جنرل سیکرٹری وصدر ہائیکورٹ بار کو طلب کیا انہوں نے یقین دہانی کرائی کہ بار کا کوئی ممبران سے بدسلوکی یا ان کے خلاف نعرے بازی نہیں کرے گا اور ہم خود انہیں بحفاظت عدالت میں لے کر آئیں گے۔

پیر کے روز سندھ کے وزیراعلیٰ ارباب غلام رحیم نے کہا ہے کہ بارہ مئی کے واقعات پر سندھ ہائیکورٹ کے ازخود نوٹس کے حوالے سے حکومت کا تعاون عدالت کے غیر جانبدار رہنے سے مشروط ہوگا۔ بی بی سی اردو سروس سے بات چیت کرتے ہوئے ارباب رحیم نے کہا کہ عدالتیں آج کل ہر چیز کا ازخود نوٹس لے رہی ہیں۔ ٹرانسفر اور پوسٹنگ اور زمینوں کے معاملات میں بھی عدالتیں مداخلت کر رہی ہیں۔ وزیراعلیٰ سندھ کا کہنا تھا کہ انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ بارہ مئی کے واقعات کی تحقیقات کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ پہلی ترجیح امن قائم کرنا ہے۔ تاریخ میں انکوائریوں کا کبھی کوئی نتیجہ نکلا ہے؟ بنگلہ دیش کی (مشرقی پاکستان کی علیحدگی) رپورٹ آج تک سامنے نہیں آئی۔ سانحہ نشتر پارک کی رپورٹ بھی نہیں آئی۔ انہوں نے کہا کہ تحقیقات شروع ہوئی تو تلخ باتیں سامنے آئیں گی۔ سب پارٹیوں کے لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔ سب پارٹیوں کے لوگ ملوث ہیں۔ گھروں میں جا کر تو نہیں مارا گیا۔ سڑکوں پر ہوا ہے وہاں کیا کرنے گئے تھے کچھ کرنے گئے تھے تو مرے ہیں۔ ارباب رحیم کا کہنا تھا کہ عدالت اگر پارٹی نہ بنی تو حکومت تحقیقات میں تعاون کرے گی۔ اگر پارٹی بنی تو پھر ہمارے افسر (عدالت میں) نہیں جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ سپریم کورٹ کی عمارت میں سنیچر کو ہونے والے سیمینار میں نعرے بازی ہوتی رہی۔ عدالتوں میں پہلے ایسے کبھی نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے وکلاء پیشی پر جاتے ہیں تو ان کی بے عزتی ہوتی ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ سندھ ہائیکورٹ کی طرف سے 12 مئی کے واقعات کا ازخود نوٹس لینے پر حکومت سندھ کے جس ناموافق ردعمل کا اندیشہ تھا وہ حقیقت بن گیا ہے اور ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تحقیقاتی عدالت کس حد تک واقعات کی تہہ میں جا سکے گی اور انتظامیہ کس حد تک اس کے ساتھ تعاون کرے گی۔ جسٹس سرمد جلال عثمانی اور وزیراعلیٰ ارباب غلام رحیم کے بیانات کو دیکھا جائے تو امکانی طور پر انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان کھلی محاذ

آرائی کا تاثر ملتا ہے۔ اس قسم کی صورتحال پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ 13 رکنی فل کورٹ کے منگل کے روز کے متوقع فیصلے کے بعد یہ دیکھنا پڑے گا کہ انتظامیہ کا ردعمل کیا ہے۔ اس بارے میں اندیشہ ہائے دور دراز پائے جاتے ہیں اور اعتماد سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ردعمل کیا شکل اختیار کرے گا۔ ادھر وزیراعظم شوکت عزیز نے کہا ہے کہ سپریم کورٹ کی حدود میں ہونے والے سیمینار کے منتظمین نے سپریم کورٹ کی طرف سے دی جانے والی اجازت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی اور وہاں جس طرح فوج سمیت دیگر اداروں اور شخصیات کی کردار کشی کی گئی وہ انتہائی قابل مذمت ہے۔ سپریم کورٹ نے سیمینار کی اجازت دیتے ہوئے سیاسی معاملات پر بات چیت اور کسی بھی شخص کی کردار کشی کی ممانعت کی تھی چونکہ سپریم کورٹ کے احکامات کی خلاف ورزی ہوئی ہے اس لئے نوٹس بھی اسے ہی لینا ہے۔ ملک دشمن تقاریر کا سپریم کورٹ از خود نوٹس لے۔ یہ تقاریر فوج کے خلاف تھیں جو افسوسناک بات ہے۔ کسی پاکستانی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ فوج کے خلاف نازیبا کلمات ادا کرے۔ فوج ملک وقوم کا اہم اثاثہ ہے اور جب بھی قوم پر کوئی کڑا وقت آیا تو فوج نے ہمیشہ سب سے پہلے ملک وقوم کا ساتھ دیا۔ تقریب میں سابقہ ججوں کے بارے میں بھی انتہائی نازیبا کلمات ادا کئے گئے۔ ابھی حکومت اس سیمینار کے بارے میں مزید سوچ بچار کر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے فیصلے سے حکومت اور وکلاء کے درمیان خلیج اور بڑھ جائے۔ پاکستان کا ہر ہوشمند شہری دعا کرے گا کہ ملک اس پیچیدہ اور نازک صورتحال سے بخیر و خوبی گزر جائے۔ اس وقت تو یہ کہنا ممکن دکھائی نہیں دیتا کہ موجودہ بحران آخر کار کیا شکل اختیار کرے گا۔



حکومت اور ایم کیو ایم کی وضاحتیں

12 مئی کے واقعات کی عدالتی تحقیقات کرانے سے حکومت کا گریز:

12 مئی کے واقعات اپنے پیچھے کئی سوالات چھوڑ گئے ہیں۔ پورے ملک میں کراچی کی صورت حال پر حکومت کو کڑی تنقید کا سامنا ہے۔ حکومت سندھ کے ساتھ ساتھ ایم کیو ایم اپنے اوپر اٹھنے والی انگلیوں کی وجہ سے مسلسل وضاحتیں پیش کر رہی ہے، جبکہ اپوزیشن جماعتوں اور وکلاء تنظیموں کی جانب سے سخت موقف اختیار کیا گیا ہے اور کھل کر کہا جا رہا ہے کہ حکومت کی رٹ ختم ہو چکی ہے، اس لئے جنرل مشرف استعفیٰ دیں اور چیف جسٹس کی سربراہی میں قومی حکومت قائم کر کے ملک میں منصفانہ، شفاف اور غیر جانبدارانہ انتخابات منعقد کرائے جائیں۔

وکلاء کی چار اہم تنظیموں کی جانب سے وفاقی اور صوبائی حکومت کے اعلیٰ حکام کے خلاف توہین عدالت کی درخواست بھی دائر کر دی گئی ہے، جس پر سندھ ہائی کورٹ نے مدعا علیہان کو 22 مئی کیلئے نوٹس جاری کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس درخواست میں وکلاء تنظیموں کی جانب سے ہائیکورٹ سے استدعا کی گئی ہے کہ وفاقی سیکرٹری داخلہ سید کمال شاہ، سیکرٹری داخلہ سندھ بریگیڈیئر ریٹائرڈ غلام محمد محترم، چیف سیکرٹری سندھ شکیل درانی، آئی جی سندھ، سی سی پی او کراچی اور دیگر افسران کو توہین عدالت کا مرتکب قرار دیتے ہوئے ان کی گرفتاری کا حکم جاری کیا جائے۔ وکلاء برادری اور سرکاری و سیاسی حلقے درخواست کو انتہائی اہمیت کا حامل قرار دے رہے ہیں۔

12 مئی کی خونریزی کے بعد جب 14 مئی کو ہڑتال کی کال دی گئی تو حکومت سندھ نے صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے عام تعطیل کا اعلان کر دیا اور خود بھی سوگ منانے میں شامل ہو گئی، جس کی وجہ سے کراچی میں کاروبار زندگی مسلسل تین دن تک بند رہا اور اس دوران مختلف علاقوں میں ہنگامہ آرائی اور تصادم کے واقعات رونما ہوتے رہے۔ جب حکومت نے 12 مئی کی خونریزی کے بعد اگلے دن رینجرز کو مزید اختیارات دینے کا اعلان کیا تو اس پر اپوزیشن کا اعتراض سامنے آیا کہ اب یہ اختیارات کیوں دیئے جا رہے ہیں یہ احکامات تو پہلے دینے چاہئیں تھے، کیونکہ صوبائی حکومت خود رجسٹرار سپریم کورٹ کو خط لکھ کر خدشہ ظاہر کر چکی تھی کہ 12 مئی کو کراچی میں دہشت گردی اور خونریزی ہو سکتی ہے۔

پہلا موقع ہے کہ میڈیا میں بھی ایم کیو ایم پر کھل کر الزامات عائد کئے گئے ہیں اور بعض سیاسی رہنماؤں نے سنگین الزام تراشی بھی کی ہے اور انتہائی سخت لب ولہجہ اختیار کیا ہے، جبکہ متحدہ کے بعض وزراء اور رہنماؤں نے بھی اسی لب ولہجے میں جواب دیا ہے۔ نہ گورنر سندھ عشرت العباد خان نے گرم ماحول کو ٹھنڈا کرنے کیلئے اپنے روایتی دھیمے لہجے کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف سیاسی شخصیات بشمول اے این پی کی قیادت سے رابطے کئے ہیں۔ صوبائی حکام کو بھی مختلف جرگوں اور سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کرنے کی ہدایت کی گئی جس پر عمل شروع کیا گیا۔

وزیر اعظم شوکت عزیز بھی اس دوران کراچی تشریف لائے اور انہوں نے گورنر سندھ اور وزیر اعلیٰ سندھ سے اہم صلاح مشورے کئے اور کراچی میں امن وامان قائم رکھنے کیلئے اہم اقدامات پر زور دیا۔ حکومت کی جانب سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ رینجرز اور پولیس کی کارکردگی پر وزیر اعظم نے اطمینان کا اظہار کیا۔ خود ڈی جی رینجرز میجر جنرل جاوید ضیاء نے کہا کہ 12 مئی کو بھرپور اقدامات کئے گئے تھے اور رینجرز کی کوششوں اور اقدامات کی وجہ سے نقصان کو کم کیا گیا، ورنہ بہت زیادہ نقصان ہو سکتا تھا۔ حکومتی شخصیات کے اس قسم کے بیانات کو سرکاری حلقوں میں تو پذیرائی ملی ہے لیکن اپوزیشن، وکلاء اور عوامی سطح پر ایسے بیانات پر حیرت اور ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے اور ایسے بیانات کو مزید اشتعال پیدا کرنے کا باعث قرار

دیا گیا ہے۔

حکومت سندھ نے کراچی میں لسانی فسادات کو روکنے کیلئے اے این پی سمیت پختون جرگوں اور دیگر معزز شخصیات سے بھی مدد طلب کی اور گورنر سندھ نے خود اے این پی کے سربراہ اسفندیار ولی سے رابطہ کر کے ان کو امن قائم رکھنے کے لئے اپیل کی اور ان کو کراچی کے دورے کی دعوت بھی دی جو انہوں نے قبول کر لی اور اطلاعات کے مطابق اسفندیار ولی جلد کراچی آ رہے ہیں۔

وزیر اعظم شوکت عزیز نے کراچی میں دورے کے دوران حکومت سندھ کے میڈیا منیجرز پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ حکومت سندھ کو میڈیا کے سامنے اپنا موقف ٹھوس انداز میں پیش کرنا چاہئے۔ ان کی ہدایت پر اگلے روز سیکرٹری داخلہ سندھ بریگیڈیئر (ر) غلام محمد محترم نے ایک پرہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے 12 مئی کے واقعات کے حوالے سے پہلی مرتبہ حکومت سندھ کا موقف پیش کیا اور انتظامی وحفاظتی اقدامات کے بارے میں صوبائی حکومت کا تفصیلی انداز میں دفاع کیا۔ اس موقع پر آئی جی سندھ نیاز احمد صدیقی، سی سی پی او اظہر علی فاروقی، سپیشل سیکرٹری داخلہ رشید عالم، ایڈیشنل سیکرٹریز داخلہ شاہنواز طارق، آصف حیدر شاہ، تنویر قریشی اور دیگر حکام بھی موجود تھے۔ نیو سندھ سیکرٹریٹ کے گراؤنڈ فلور پر واقع ہال میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سیکرٹری داخلہ سندھ بریگیڈیئر ریٹائرڈ غلام محمد محترم نے کہا کہ 12 مئی کو کراچی میں جو ہلاکتیں ہوئیں وہ انتہائی افسوس ناک تھیں، اور ہر پاکستانی کی طرح مجھے بھی دلی طور پر ان واقعات پر گہرا رنج ہے۔ انہوں نے ہلاک شدگان کو شہید قرار دیا اور خصوصی طور پر فاتحہ خوانی بھی کی۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 12 مئی کو کسی موقع پر فوج طلب کرنے پر غور نہیں کیا گیا تھا۔ پولیس اور رینجرز کی کوششوں اور اقدامات کی وجہ سے حالات بہت جلد بہتر بنا لئے گئے اور لسانی فسادات کی طرف حالات نہیں جانے دیئے گئے ورنہ جانی نقصان بہت زیادہ ہوسکتا تھا۔ اس روز مختلف سیاسی جماعتوں نے جو ریلیاں نکالی تھیں ان کی وجہ سے لاکھوں افراد سڑکوں پر تھے اور پولیس کو یہ کردار سونپا گیا تھا کہ وہ بفر زون کا کردار ادا کرتے ہوئے مختلف ریلیوں کو متصادم ہونے سے روکے۔ انہوں نے کہا کہ 12 مئی کے واقعات پر وفاقی اور صوبائی حکومت کو تشویش ہے۔ وفاقی پبلک سیفٹی کمیشن نے از خود نوٹس لیتے ہوئے حکومت سندھ سے ابتدائی رپورٹ بھی طلب کر لی ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ذمہ داروں کو قرار واقعی سزائیں دی جائیں گی۔ موجودہ صورت حال میں ذرائع ابلاغ کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے، بدقسمتی سے حکومتی ادارے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے سے کسی حد تک قاصر رہے ہیں، لہٰذا آج کی بریفنگ حکومت کا موقف اجاگر کرنے کے لئے ہے۔ سندھ پولیس اور رینجرز کی کوششوں کی وجہ سے نقصان کو روکنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ صرف 3 دن یعنی 72 گھنٹوں میں معمولاتِ زندگی بحال کر دیئے گئے۔ یہ وقت ہے کہ آگے بڑھا جائے اور میڈیا سے درخواست ہے کہ گھناؤنے واقعات کو روکنے میں کردار ادا کرے۔ انہوں نے 12 مئی سے پہلے اور بعد کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور حکومت کی جانب سے ائیر پورٹ، ہائیکورٹ، چیف جسٹس آف پاکستان اور چیف جسٹس ہائیکورٹ، حساس تنصیبات اور اہم مقامات کی حفاظت یقینی بنانے کے لئے کئے گئے اقدامات کا تفصیل سے احاطہ کیا اور کہا کہ صرف ایم کیو ایم نے ریلی نکالنے کی باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی۔ ایم کیو ایم کے علاوہ کسی سیاسی جماعت نے ریلی نکالنے کے لئے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔ چیف جسٹس آف پاکستان کے استقبال کے لئے خود میں، آئی جی سندھ اور ناظم شہر کی جانب سے ڈی سی او ائیر پورٹ گئے تھے۔ میں نے چیف جسٹس کو اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ حکومت سندھ کی نمائندگی کر رہا ہوں، آپ اپنا پروگرام بتائیں تو ہم آپ کو وہاں پہنچا دیں گے۔ اس پر اعتزاز احسن نے کہا کہ منیر اے ملک سے بات کریں، انہوں نے کہا کہ منیر اے ملک کا کہنا تھا کہ جب تک میزبان وکلاء نہیں آئیں گے ہم یہیں بیٹھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کی کراچی آمد کے بعد پرتشدد تصادم کے واقعات شروع ہوئے۔ ایک رات قبل ہی سڑکیں بلاک ہوگئی تھیں اور خود میں نے تمام سیاسی جماعتوں کے کراچی میں موجود رہنماؤں سے بات چیت کی تھی۔ اپوزیشن پارٹیاں کہتی تھیں کہ اگر ایم کیو ایم ریلی نہ نکالے تو وہ بھی ریلی نہیں نکالیں گے، جبکہ سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے ہر قسم کی ریلی سے لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔ بالآخر میں نے رجسٹرار سپریم کورٹ کو خط لکھا تھا اس کا جواب موصول نہیں ہوا۔

12 مئی کو 13 ہزار پولیس اہلکار اور 8 ہزار رینجرز اہلکاروں کو امن وامان کیلئے انڈکٹ کیا گیا تھا۔ رینجرز سے کہا گیا تھا کہ ائیر پورٹ کی سیکورٹی کو یقینی بنایا جائے اور چیف جسٹس کی سیکورٹی کو یقینی بنایا جائے پولیس کو ہدایت کی گئی تھی کہ ریلیوں کے درمیان بفر زون کا کردار ادا کرے۔ نیشنل ہائی

وے اور سپر ہائی وے پر چیک رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی، تا کہ کوئی خودکش حملہ آور، دہشت گرد اور ہتھیار شہر میں نہ آسکیں۔ رینجرز کو شہر کے تمام داخلی راستوں پر چیک رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ٹریفک پولیس کو ہدایت تھی کہ رینڈم چیکنگ کی جائے، پولیس کو تین زون میں تقسیم کر کے ڈی آئی جی کو کمان دی گئی تھی۔ چیف جسٹس کی کراچی لینڈنگ کے بعد ساڑھے بارہ بجے پہلی وائلنس کی اطلاع وائرلیس گیٹ سے ملی تھی، 34 لوگ اس روز شہید ہوئے تھے اور 25 اموات اور شہادتیں شاہراہ فیصل اور گردونواح میں ہوئی تھیں۔ دیگر علاقوں میں بھی فائرنگ اور تشدد کے واقعات ہوئے اور بدقسمتی سے آج ٹی وی چینل بھی دو گروپوں کی فائرنگ کے تبادلے کی زد میں آ گیا۔ وہاں لوگوں نے گاڑیاں بھی جلا دی تھیں۔ چیف جسٹس کی کراچی سے روانگی کے بعد شہر کے حالات نارمل ہونا شروع ہو گئے۔ اس سوال پر کہ کتنے لوگ گرفتار کیے گئے اور کتنا اسلحہ برآمد کیا گیا ہے؟ سی سی پی او کراچی اظہر فاروقی نے جواب دیا کہ 11 اور 12 مئی کی رات کو 121 لوگ گرفتار کیے تھے، 12 مئی کے بعد 21 لوگ گرفتار کئے گئے ہیں۔ 11 مئی سے قبل 12 گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ 2 کلاشنکوف اور چار ٹی ٹی برآمد کی گئی تھیں اور ان لوگوں نے ریلی میں دہشت گردی کرنے کی سازش کا بتایا تھا۔ ایک سوال پر انہوں نے بتایا کہ 11 مئی کی رات بارہ بجے اطلاع مل گئی تھی کہ شاہراہ فیصل بلاک کر دی گئی ہے جس میں ایم کیو ایم سمیت مختلف سیاسی جماعتیں شامل تھیں۔ اس سوال پر کہ آج ٹی وی کن دو گروپوں کی فائرنگ کی زد میں آتا تھا، سی سی پی او نے کہا کہ انوسٹی گیشن جاری ہے لیکن پٹیل پاڑہ کا علاقہ پختون آبادی والا علاقہ ہے اور ماضی میں بھی یہاں فساد ہوتا رہا ہے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ کسی موقع پر آرمی بلانے کا نہیں سوچا گیا، اس روز بڑی بڑی ریلیاں تھیں ہر شخص کی جسمانی تلاشی لینا ممکن نہیں تھا۔



کیا معاوضہ! دکھوں کا مداوا کر سکے گا

2007ء: 12 مئی کے روز کراچی میں ہونے والی خون ریزی کے بعد اپنے پہلے دورہ کراچی کے دوران 25 مئی صدر مملکت جنرل پرویز مشرف نے وزیر اعلیٰ ہاؤس کراچی میں امن وامان سے متعلق ایک اجلاس کی صدارت کی' سندھ کابینہ کے ارکان سے ملاقات اور عمائدین سے خطاب کیا۔ اس دوران انہوں نے سندھ حکومت کو شاباش دی اور 12 مئی کے روز جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین کو چھ چھ لاکھ روپے اور زخمیوں کو ایک ایک لاکھ روپیہ ادا کرنے کا اعلان کیا۔

دو کروڑ چالیس لاکھ کی یہ رقم ہلاک ہونے والے ان 40 افراد کے خون کا بدل یا عوضانہ یا معاوضہ یا تلافی ہوگی' جو گھر سے قطعاً مرنے کے لئے نہیں گئے تھے اور جب شاباش پانے والی حکومت سندھ کی ارادی غفلت سے مارے گئے تو ایک کے نزدیک شہید اور دوسرے کے نزدیک وہ شرانگیز قرار پائے ''خود ہی قتل کرے ہے اور خود ہی لے ثواب اُلٹا'' والا یہ چلن نیا نہیں' جب سے قبائلی' گروہی اور پھر ریاستی زندگی شروع ہوئی' یہ بھی ساتھ ہی چلتا رہا۔

ہندوستان میں خاندان غلاماں کے بعد 1290ء میں خلجی امرا کا سردار جلال الدین خلجی تخت دہلی پر بیٹھا۔ علاؤالدین خلجی کو جو اس کا بھتیجا اور داماد ہی نہ تھا اس کی پرورش بھی اسی نے کی تھی' کڑہ کا امیر مقرر کیا گیا۔ 17 رمضان المبارک 1296ء افطار کے وقت' جبکہ جلال الدین خلجی روزے سے تھا' اسے قتل کر دیا گیا اور اس کا سر نیزے پر بندھوا کر سارے کڑہ مانک پورہ میں اور اس کے بعد اودھ کے علاقے میں گشت کرایا۔ اپنے اس فعل کو نظریہ ضرورت کا تحفظ دینے کے لئے جلالی امراء وملوک میں تیس تیس' چالیس چالیس' پچاس پچاس من سونا تقسیم کیا۔ کڑہ مانک پورہ سے دہلی کے سفر کے دوران وہ منجنیقوں کے ذریعے ہر روز لوگوں پر پانچ من سونے کی بارش کرتا ہوا گزرا۔ دہلی شہر میں شراب' شربت اور پانوں کی سبیلیں لگائی گئیں۔ لوگوں میں اتنی کثرت سے روپیہ بکھیرا کہ وہ سلطان جلال الدین خلجی کا قتل بھول گئے۔ یہ لکھتے ہوئے میری نگاہوں میں مکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ کے ماسٹر محبوب عالم گھوم رہے ہیں جو علاؤالدین خلجی کے اس فعل کو بڑے ہی خوبصورت اور دلنشین پیرائے میں ہم پانچویں کلاس کے طلبہ کے سامنے بیان کرتے' کہ کس طرح اس نے اپنا یہ فعل لوگوں کے اذہان سے محو کرنے کے لئے گھروں کی چھتوں پر اشرفیاں پھینکیں۔ گویا سونا بانٹنا اور شراب' شربت اور پانوں کی سبیلوں کا کھلم کھلا قیام سلطان جلال الدین خلجی کے قتل کا بدل یا عوضانہ یا معاوضہ یا تلافی تھی۔

لیاقت علی خانؒ اربوں' کھربوں کی جائیداد اور بھارت چھوڑ آئے' لیکن یہاں ایک انچ زمین بھی الاٹ نہ کرائی۔ دنیا کے پانچویں بڑے ملک اور سب سے بڑی اسلامی مملکت کے وزیراعظم ہوتے ہوئے بھی زندگی مالی کھٹنائی کا شکار رہی۔ جب ایک سازش کے تحت انہیں قتل کر دیا گیا تو وزیراعظم پاکستان کے گھر میں چاندی تھی' نہ سونا' حتیٰ کہ رہنے کے لئے مکان بھی اپنا نہ تھا۔ قوم کے دل پر پھاہا جھوٹی تسلیوں اور تشفیوں سے رکھا گیا اور ان کے بچوں کو کچھ زمین وغیرہ الاٹ کی گئی جو یقیناً ایک قیمتی' بلکہ از حد قیمتی جان کا بدل نہ تھی' لیکن زمانے کا صدیوں پرانا دستور ہے۔

ایسے معاوضے' بدل' عوضانے یا تلافی کے اعلانات اور اقدامات ہم آئے روز دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں' لیکن اس لہو اور جدوجہد کے

معاوضے بدل عوضانے یا تلافی کے باب میں بالکل خاموش بلکہ الٹ سمت جارہے ہیں جو پاکستان کی بنیادوں میں رچی۔ وہ عورتیں بھی تلافی اور معاوضے کی طلبگار ہیں جو عزت بچانے کے لئے کنوؤں میں کود گئیں۔ جالندھر کیمپ کی وہ عورت بھی جو آخری سانسوں میں کہہ رہی تھی "یہ میرے زیورات ہیں۔ خاندان کے سارے مرد شہید ہو چکے ہیں۔ ان زیورات کو قائداعظمؒ تک پہنچا دیں۔ شائد پاکستان کے کام آجائیں۔"

ضلع رہتک تحصیل سونی پت کے اکبر پور بارونہ کی وہ عورتیں بھی تلافی چاہتی ہیں، جنہوں نے "جب کوئی چارۂ کار نہ رہا، اپنی عصمتیں بچانے کے لئے کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں۔ وہ کنوئیں بھر گئے۔ پھر بھی بہت ساری عورتیں رہ گئیں، جن میں سے جوان عورتوں کو ہندو جاٹ پکڑ کر لے گئے۔ بوڑھوں اور بچوں کو قتل کر دیا۔ گھروں اور مسجدوں کو نذر آتش کر دیا گیا، حتیٰ کہ شیر خوار بچے بھی معاوضے، عوضانے، بدل یا تلافی کے طلبگار ہیں، دشمن نے جنہیں نیزوں پر اچھالا۔

1946ء کے انتخابات پاکستان کی بنیاد پر ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ جیت گئی تو پاکستان ورنہ متحدہ ہندوستان اور مسلمان سپین والے سلوک کے لئے تیار رہیں۔ ضلع سیالکوٹ موضع تلہاڑ کی ایک عورت ہر روز اپنے میاں سے اصرار کرے کہ ووٹ پاکستان کو دینا، قائداعظمؒ کو دینا، مسلم لیگ کو دینا۔ ووٹنگ کے روز جب اس کے استفسار پر اس کے میاں نے بتایا کہ اس نے ووٹ مسلم لیگ نہیں یونینسٹ پارٹی کے امیدوار کو دیا ہے تو اس عورت نے اندر جا کر پھاہ لے لیا۔ وہ عورت بھی معاوضے، عوضانے، بدل اور تلافی کی طلبگار ہے...... اور وہ بڈھا بھی جو واہگہ بارڈر پر بھائی گیٹ کے مستری قمر دین کی ڈیوٹی کے موقع پر پاکستان میں داخل ہونے والا پہلا مہاجر تھا۔ اس نے فضا میں پاکستانی پرچم لہراتا دیکھا تو اس کا چہرہ دمک اٹھا، مستری قمر دین سے پوچھتا ہے "پتر پاکستان آگیا ہے؟" مستری قمر دین کہتے ہیں "ہاں بابا جی، آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان کی حدود میں ہیں" وہ بڈھا فوراً کہتا ہے "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہؐ"، وہیں اس کی جان نکل جاتی ہے۔

یہ سب ہم سے اپنی قربانیوں کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ کس صورت میں معاوضہ؟ ان مقاصد پر عمل پیرائی کی صورت میں، جن کی خاطر انہوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ یہ ایسا معاوضہ ہے، جس کا لطف فرد واحد کے لواحقین تک محدود نہیں رہتا، آنے والی نسلیں بھی اس سے سیراب ہوتی رہتی ہیں۔

قیام پاکستان کی جنگ کے ہر شہید اور غازی اور آنے والی نسلوں کے لئے قائداعظمؒ معاوضہ، عوضانہ، بدل اور تلافی تجویز کر گئے ہیں۔ جب انہوں نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس لائل پور میں 18 نومبر 1942ء کو اہل دیہات کی غربت اور مفلوک الحالی پر سخت رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا "پاکستان کی حکومت کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ ان لوگوں کا معیار زندگی بلند کرے اور زندگی، بلکہ بہتر زندگی سے شادکام ہونے کے سامان بہم پہنچائے۔"

یہ عوام کی قربانیوں، شہداء کے خون اور غازیوں کی سخت کوشی کا عوضانہ تھا جو 24 مارچ 1943ء کو قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں جاگیردانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو انتہائی ظالمانہ اور شر انگیز قرار دیا اور قیام پاکستان کے بعد جاگیرداروں اور سرمایہ کاروں کی کوئی مدد نہ کرنے اعلان کیا اور یہ بھی فرمایا "وہ اسلامی احکام بھول چکے ہیں۔ حرص و ہوس نے سرمایہ داروں کو اتنا اندھا کر دیا ہے کہ وہ طلب منفعت کی خاطر دشمن کے آلہ کار بن جاتے ہیں" اور قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی رپورٹ 1948ء نے واضح کر دیا "بڑے بڑے زمینداروں کے حقوق ملکیت کا جائزہ لیا جائے تو شائد کوئی بھی اپنا دعویٰ 1857 کی جنگ آزادی سے پہلے کی تاریخ کا ثابت نہ کر سکے" اس زرعی کمیٹی کی سفارشات کہاں گئیں؟ جو تحریک قیام پاکستان کے شہداء اور غازیوں کی قربانی کا عوضانہ بن سکتی تھیں۔ وہ 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خانؒ کے سینے میں اترنے والی گولی کے ساتھ ہی ڈھیر ہو گئیں۔

27 مارچ 1947ء: میمن چیمبر آف کامرس بمبئی میں تقریر کے دوران میں پاکستان کے لئے قربانیاں دینے والوں کے لئے قائداعظمؒ نے یہ عوضانہ یا بدل یا معاوضہ یا تلافی تجویز کی' 'جو حکومتیں عوام کے اعتماد اور مرضی پر قائم نہ ہوں' وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتیں۔ جمہوریت مسلمانوں کے رگ و ریشے میں ہے...... اسلام میں کوئی ایسا موقع محل نہیں جہاں کوئی فرد واحد اپنی من مانی کارروائی کر سکے''

قائداعظمؒ نے 11 اگست 1947ء کی اپنی رہنما تقریر میں جو ہمارا میگنا کارٹا ہے' رشوت خوری اور بے ایمانی کو بڑی لعنتیں قرار دیتے ہوئے ان سے فولادی پنجے سے نمٹنے پر زور دیا۔ بلیک مارکیٹنگ' منافع خوری کے بھوت سے جنگ کرنے کی تلقین کی کہ یہ چیزیں معاشرتی جرم ہیں۔ یوں انہوں نے قیام پاکستان کے لئے جانگسل حالات میں جان دینے' بچ رہنے اور آنے والی نسلوں کے لئے یہ معاوضہ تجویز کیا۔ ہندو اور انگریز کے ہاتھوں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی تلافی کے لئے اسی تقریر میں فرمایا'' ......تم میں سے ہر ایک چاہے اس کا تعلق کسی بھی فرقے سے ہو' چاہے اس کا رنگ' ذات اور عقیدہ کچھ بھی ہو' اول بھی اس ریاست کا باشندہ ہوگا' دوئم بھی اور آخر میں بھی' تمہارے حقوق' مراعات اور ذمہ داریاں برابر ہوں گی۔''

25 مارچ 1948ء کو چٹاگانگ میں کی گئی قائداعظمؒ کی سرکاری ملازمین کو یہ نصیحت بھی پاکستانی عوام کے لئے عوضانہ اور معاوضہ تھی کہ'' ......اب آپ حاکم نہیں رہے۔ اب آپ برسراقتدار جماعت میں نہیں رہے۔ اب آپ ملازم اور خادم ہیں۔ لوگوں کو یہ محسوس کروائیے کہ آپ ان کے ملازم اور دوست ہیں......''

قائدؒ نے قیام پاکستان کی راہ میں صعوبتیں اٹھانے اور جان دینے والوں کے لئے تلافی اور آنے والی نسلوں کے لئے راحت' سکون اور ترقی اس میں بھی ڈھونڈی جب انہوں نے 14 جون 1948ء کے روز سٹاف کالج کوئٹہ میں فوجی افسران کو تلقین کی کہ وہ آئین پاکستان کے تحت اٹھائے گئے حلف پر کاربند ہیں اور مسلح افواج بھی اپنی شرائط شمولیت کے مطابق فضا' خشکی یا سمندر میں انتہائی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیں۔ اس موقع پر انہوں نے یہ بھی فرمایا'' جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ آئین اور ڈومینین کے وفادار رہیں گے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ پاکستان میں نافذ العمل آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے صحیح آئینی اور قانونی منشا اور معانی کو سمجھیں۔''

قائدؒ نے اس ملک کے قیام کے دوران دی جانے والی قربانیوں پر جو معاوضہ یا عوضانہ یا بدل یا تلافی تجویز کی تھی وہ چند افراد کے لئے نہیں' کروڑوں انسانوں کے لئے تھی۔ اس پر عمل کرنے سے 16 کروڑ زندہ لاشوں میں حقیقی روح حیات لائی جا سکتی ہے۔ افسوس ہمارے حکمران بعض مواقع پر ایک بار مرنے والوں کے لئے تو بظاہر بڑے دکھی ہو جاتے ہیں اور مخصوص حالات میں معاوضہ بھی تجویز کر دیتے ہیں' لیکن ان کے ہاں ہر روز' ہر لحظہ اور ہر آن مرتے رہنے والے کروڑوں افراد کے لئے کوئی معاوضہ یا تلافی نہیں جبکہ اس معاوضے' عوضانے' بدل اور تلافی کا انداز قائداعظم محمد علی جناحؒ' بانی پاکستان اور فادر آف دی نیشن کی حیثیت سے تجویز کر گئے ہیں۔



اہلِ پاکستان کے نام الطاف حسین کا کھلا خط

(12 مئی 2007ء کے سانحہ کے اصل حقائق پر مبنی، انکشافات، تاریخ اور
مختلف ادوار حکومت کے حوالے سے)

میرے پیارے محب وطن پاکستانیو! اسلام علیکم

12 مئی کا دن ایک دکھ بھرا انتہائی افسوسناک دن تھا اور ہر دردمند پاکستانی کی آنکھیں اشکبار کر دینے والا دن تھا کہ جس دن 40 سے زائد معصوم شہریوں کو اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا، انا للہ وانا الیہ راجعون اور اسی دن سینکڑوں شہری زخمی ہوئے اللہ تعالیٰ ان زخمیوں کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔

محب وطن پاکستانیو! ہر شہری، ہر سیاسی اور مذہبی جماعت کو آئین پاکستان کے تحت جلسے جلوس کرنے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے کی آزادی ہے اور اسی آئین کے تحت ہر شہری کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی اور سوچ وفکر کے مطابق آئین اور قانون کے مطابق قائم ہونے والی کسی بھی سیاسی یا مذہبی جماعت کے فکر وفلسفے اور اس کے منشور کو پسند کرے یا اپنی وابستگی قائم کرے۔ مزید یہ کہ ہر شہری یا کسی سیاسی جماعت سے منسلک فرد کو اور سیاسی اور مذہبی جماعت کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے اغراض ومقاصد، منشور اور فکر وفلسفے کو پھیلانے کیلئے عوام کو آگاہ کرے۔ آئین اور قانون کے تحت ملک کی تاریخ میں غریب اور متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد نے روایتی اور موروثی سیاست کا طلسم توڑتے ہوئے ''متحدہ قومی موومنٹ'' قائم کی، غریب اور متوسط طبقہ کی جماعت کا قیام اسٹیبلشمنٹ اور جاگیردارانہ، وڈیرانہ اور سردارانہ طرز کی موروثی سیاست کرنے والوں اور اسٹیبلشمنٹ کے پے رول پر قائم جماعتوں کو ہرگز پسند نہ آیا اور ان تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے ایم کیو ایم کے خاتمہ کیلئے طرح طرح کی گھناؤنی سازشوں کے تانے بانے بننا شروع کر دیئے جس کے تحت ایم کیو ایم پر ان گنت جھوٹے اور بے بنیاد الزامات لگانا شروع کر دیئے گئے تاکہ پاکستان کے غریب اور متوسط طبقہ کے افراد ایم کیو ایم سے اتنے متنفر ہو جائیں کہ وہ اس کے فکر وفلسفہ کو سننا تو کجا اس کا نام بھی سننا گوارہ نہ کریں۔ پاکستان میں رہنے والی مختلف لسانی اور ثقافتی اکائیوں کو ایم کیو ایم سے مزید بدظن کرنے کیلئے خفیہ سازشی منصوبوں کے تحت لسانی فسادات کرائے گئے جس کے تمام تر الزامات ایم کیو ایم کے سر تھوپے گئے۔ ایم کیو ایم کے خلاف 19 جون 1992ء کو ایک جمہوری حکومت کے دور میں جس کی حلیف جماعت وفاق اور صوبہ سندھ میں ایم کیو ایم بھی تھی کے خلاف فوجی آپریشن شروع کر دیا گیا اور اس وقت بھی قوم کو دھوکے میں رکھ کر اسٹیبلشمنٹ اور اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف کے دور میں یہ تاثر دیا گیا کہ فوج نے صوبہ سندھ میں ڈاکوؤں اور ڈاکوؤں کو پناہ دینے والی بڑی مچھلیوں کو پڑنے کیلئے ایک فوجی آپریشن کا منصوبہ بنایا ہے اور اس منصوبہ کے تحت 72 بڑی مچھلیوں کی ایک فہرست تیار کی گئی جسے متعدد بار قومی اسمبلی کے ایوان میں مختلف ادوار میں پیش کیا جاتا رہا اور آج بھی قومی اسمبلی کے ریکارڈ میں 72 بڑی مچھلیوں کی فہرست لازماً موجود ہوگی مگر یہ فوجی آپریشن 72 بڑی مچھلیوں کے خلاف کرنے بجائے صرف اور صرف ایم کیو ایم کے خلاف شروع کیا گیا۔ اس فوجی آپریشن کے دوران ایم کیو ایم کے ہزاروں کارکنان کو گرفتار کر کے ان پر جھوٹے مقدمات بنائے گئے اور انہیں بدترین ریاستی تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا اور سینکڑوں کارکنوں کو بے دردی سے شہید کیا گیا۔ ایم کیو ایم کے تمام

دفاتر پر اسٹیبلشمنٹ کی قائم کردہ دہشت گرد جماعت کے ذریعے قبضہ کرا دیا گیا۔1993ء میں جب نواز شریف کی حکومت برطرف کی گئی اور جب عام انتخابات ہوئے تو بے نظیر بھٹو کی حکومت قائم ہوئی، ان کے جمہور دورِ حکومت میں ایم کیو ایم کے خلاف جاری ریاستی آپریشن کئی گنا زیادہ تیز اور بھیانک کر دیا گیا اور ایم کیو ایم کے ہزاروں رہنماؤں اور کارکنوں کو نہ صرف یہ کہ جھوٹے مقدمات میں گرفتار کیا گیا بلکہ 15 ہزار سے زائد ایم کیو ایم کے کارکنوں کو گرفتار کر کے ملک کی کسی بھی عدالت میں پیش کئے بغیر ماورائے عدالت بے دردی سے قتل کیا گیا اور ایم کیو ایم کے 28 کارکنان آج تک لا پتہ ہیں۔اس وقت کے وفاقی وزیر داخلہ ''بوچر آف کراچی'' نصیر اللہ بابر کے بیانات آج بھی اخبارات کے ریکارڈ میں موجود ہیں جس میں اس نے واضح الفاظ میں متعدد بار کہا تھا کہ ''میں کسی بھی گرفتار فرد کو عدالت میں پیش کرنے پر یقین نہیں رکھتا'' آج عدلیہ کی آزادی کی باتیں کرنے والے اور ایک مرتبہ پھر ایمکیو ایم پر سانحہ 12 مئی 2007ء کے الزامات عائد کرنے والی پیپلز پارٹی کے رہنما قوم کو کیوں نہیں بتاتے کہ انہی کی پارٹی کے منتخب کردہ صدرِ مملکت فاروق لغاری نے جب بے نظیر بھٹو کی حکومت کو مختلف الزامات کے تحت برطرف کیا تھا تو ان الزامات میں سب سے پہلا نکتہ کراچی میں کئے جانے والے ماورائے عدالت قتل ہی کا تھا جسے سپریم کورٹ نے بھی اپنے فیصلے میں برقرار رکھا۔1997ء میں جب ملک میں عام انتخابات کا انعقاد ہوا تو نواز شریف کی دوبارہ حکومت قائم ہوئی جنہوں نے دوسری مرتبہ ایم کیو ایم کو دھوکہ دے کر ایم کیو ایم پر جھوٹے الزامات لگائے اور سندھ کی جمہوری حکومت ختم کر کے 30 اکتوبر 1998ء کو سندھ میں گورنر رول نافذ کر دیا۔12 اکتوبر 1998ء کو نواز شریف کی حکومت برطرف ہوئی اور ملک کا عارضی اقتدار فوج نے جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں سنبھال لیا۔جنرل پرویز مشرف کے فوجی دورِ حکومت میں منعقد ہونے والے 2001ء کے بلدیاتی انتخابات میں ایم کیو ایم نے انتخابات کا بائیکاٹ صرف اس لئے کیا کہ ایم کیو ایم فوجی حکومت پر یقین نہیں رکھتی کیونکہ ایم کیو ایم ایک اصول پسند جمہوری جماعت ہے جبکہ آج جنرل پرویز مشرف کی مخالفت کرنے والی تمام بڑی جماعتوں بشمول پاکستان پیپلز پارٹی سب ہی نے جنرل پرویز مشرف کے فوجی دورِ حکومت میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا تھا۔اکتوبر 2002ء میں جب دوبارہ عام انتخابات ہوئے تو ایم کیو ایم نے ان انتخابات میں صرف اس لئے حصہ لیا کہ اب ان انتخابات کے نتیجہ میں ملک میں جمہوری حکومت قائم ہو گی اور ملک سے فوجی دورِ حکومت ختم ہو جائے گا اور جب مسلم لیگ (ق) نے اکثریت حاصل کی اور ظفر اللہ جمالی صاحب کو وزیر اعظم کیلئے منتخب کیا تو ایم کیو ایم نے انتخابات کے نتیجہ میں قائم ہونے والی جمہوری حکومت کے ساتھ اتحاد کیا اور وفاق اور صوبہ کی سطح پر حکومتوں میں شامل ہوئی۔موجودہ جمہوری حکومت کے دور میں ہونے والے 2005ء کے بلدیاتی انتخابات میں ایم کیو ایم نے حصہ لیا اور صوبہ سندھ میں بھاری اکثریت میں نشستیں حاصل کیں۔ایم کیو ایم کے منتخب حق پرست اراکین اور حق پسند بلدیاتی نمائندوں نے صوبہ سندھ میں جس طرح ترقیاتی کام کئے اور آج تک کر رہے ہیں وہ کام پاکستان کی 60 سالہ تاریخ میں کبھی نہ تو فوجی حکومت اور نہ ہی کسی بھی جمہوری دورِ حکومت میں ہوئے۔ایم کیو ایم کو جب عوامی خدمت کے کام کرنے کا موقع ملا تو ایم کیو ایم نے وہ مثبت ترقیاتی کام کر کے دکھائے جو اس سے پہلے کبھی کسی دورِ حکومت میں نہ ہوئے تھے۔آہستہ آہستہ ایم کیو ایم کا پیغام حق پرستی ملک کے گوشے گوشے میں پھیلنے لگا اور سچ اور جھوٹ میں تمیز کر کے جوق در جوق ملک بھر سے عوام ایم کیو ایم میں شامل ہونے لگے تو موروثی سیاست کرنے والی جماعتوں کو اپنے مستقبل کا اقتدار اور جاگیردارانہ نظام خطرہ میں نظر آنے لگا تو ایک مرتبہ پھر متحدہ محاذ بنا لیا بلکہ ایم کیو ایم کے خلاف سازشیں کرنے اور سازشوں کی تکمیل کے بعد ہونے والے واقعات کے تمام تر الزامات ایم کیو ایم کے سر تھوپنے کے منصوبے بنانا شروع کر دیئے۔8 اکتوبر 2005ء کو صوبہ سرحد اور آزاد کشمیر میں آنے والے قیامت خیز زلزلہ کے بعد ایم کیو ایم کے ہزاروں کارکنوں نے جس طرح اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر زلزلہ کے متاثرین کی عملی خدمت کی اس نے پورے ملک بھر کے حق پرست عوام میں ایم کیو ایم کیلئے خیر سگالی کا ایک نیا جذبہ پیدا کیا اور ایم کیو ایم کی مقبولیت اور عوامی تائید میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہونے لگا جس کی وجہ سے ایم کیو ایم دشمن جماعتوں کی بوکھلاہٹ میں نہ صرف یہ کہ مزید اضافہ ہونے لگا بلکہ انہوں نے آپس میں مل کر 12 مئی 2007ء کے دن کا انتخاب کیا کہ وہ اس دن شہر کراچی میں اپنے ناپاک منصوبے کی تکمیل کیلئے کراچی کو اپنے مسلح دہشت گردوں کے ذریعے آگ اور خون میں نہلا کر اس کا تمام تر الزام ایم کیو ایم پر

ڈال دیں گے اوران جماعتوں نے اپنے سازشی منصوبوں کی تکمیل کیلئے ایک مرتبہ پھر پختون آبادی والے علاقوں کو چنا تا کہ ایک طرف ان جماعتوں کی ناپاک منصوبہ بندی پایہ تکمیل کو پہنچے اور دوسری طرف کراچی میں ایک مرتبہ پھر لسانی فسادات کی آگ بھڑکا کر اپنے مزید مذموم مقاصد حاصل کیے جائیں۔

چیف جسٹس سپریم کورٹ کا مسئلہ

محب وطن پاکستانیو! ایک دن اچانک یعنی 9 مارچ 2007ء کو اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ چیف جسٹس سپریم کورٹ افتخار محمد چودھری کے خلاف ایک صدارتی ریفرنس سپریم کورٹ میں داخل کر دیا گیا ہے اس پر میں نے اپنے ذمہ دار ساتھیوں سے کہا کہ حق پرست اراکین پارلیمنٹ سے معلوم کریں کہ کیا اس مسئلہ پر حکومت نے ایم کیو ایم کے کسی پارلیمانی وفد کو آگاہ یا مشورہ کیا ہے تو معلوم ہوا کہ ایم کیو ایم کے نہ تو کسی رہنما سے اور نہ ہی کسی پارلیمانی وفد سے کوئی مشورہ کیا گیا ہے اور نہ ہی کسی کو اعتماد میں لیا گیا ہے اس پر ہم نے اعلیٰ حکومتی حلقوں سے بات کر کے اپنا احتجاج رجسٹر کروایا۔ بعد میں اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے جب یہ اطلاعات ہمیں ملیں کہ چیف جسٹس کو نظر بند کر دیا گیا ہے اوران کے گھر کے ٹیلی فون وغیرہ بھی کاٹ دیئے گئے ہیں اوران کے ساتھ بعض اہلکار نازیبا سلوک کر رہے ہیں تو اس طرز عمل کے خلاف ایم کیو ایم نے بہت موثر انداز میں احتجاج کیا۔ اس کے بعد ملک بھر میں وکلاء نے بھی اپنا احتجاجی سلسلہ شروع کر دیا جو ان کا قانونی اور آئینی حق تھا اور آج بھی ہے لیکن جب ہم نے یہ دیکھا کہ وہ سیاسی اور مذہبی جماعتیں جو گزشتہ چار ساڑھے چار سالوں سے موجودہ جمہوری حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک چلانے ملین مارچ کرنے اور اپنے استعفیٰ پیش کرنے کی بار بار دھمکیاں دیتی رہیں مگر کوئی بھی اپوزیشن کی جماعت عوام کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو ان جماعتوں نے اپنی قسمیں اور وعدے توڑ کر نہ تو ملین مارچ کیا نہ کوئی احتجاجی تحریک چلائی اور نہ ہی احتجاجاً اپنے استعفیٰ پیش کئے بلکہ اپنی قسموں اور وعدوں کے خلاف حکومت سے چور دروازوں سے خفیہ مذاکرات کرنا شروع کر دیئے۔ دوسری طرف میثاق جمہوریت پر دستخط کرنے والی دو بڑی جماعتوں نے کچھ ہی دن گزرنے کے بعد میثاق جمہوریت کو "مذاقِ جمہوریت" بنا ڈالا۔ اور آج کل دستخط شدہ میثاق جمہوریت میں تبدیلیاں کرنے کی بھی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ غرضیکہ جب اپوزیشن کی تمام جماعتیں موجودہ حکومت کے خلاف کسی ایک نکتہ پر متحد ہونے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئیں اوران اپوزیشن کی جماعتوں کی قسمت کا ستارہ اس وقت چمک اٹھا جب انہوں نے یہ دیکھا کہ چیف جسٹس سپریم کورٹ افتخار محمد چودھری کے خلاف دائر کردہ ریفرنس کے خلاف وکلاء برادری کے احتجاج کی تحریک دن بدن زور پکڑتی جا رہی ہے تو ان وکلاء کی تحریک کو کسی طرح ہائی جیک کر لیا جائے سو اپوزیشن کی جماعتوں نے نہ صرف یہ کہ وکلاء کی تحریک کو بڑا باریک کام کرتے ہوئے اچک لیا بلکہ وکلاء کی تحریک کو بھی متنازعہ بنا ڈالا۔ پیارے پاکستانیو! ہر کسی سیاسی جماعت اور مذہبی جماعت کو یہ آزادی حاصل ہے کہ اگر اس کی جماعت کا کوئی رہنما گرفتار کر لیا جائے تو وہ اس گرفتاری کے خلاف عدالتی کارروائی کے ساتھ ساتھ سیاسی احتجاج بھی کر سکتی ہے لیکن عدالتوں کے جج صاحبان اپنے خلاف کسی بھی ریفرنس یا مقدمہ کے خلاف عدالتی کارروائی تو ضرور کر سکتے ہیں لیکن آئین اور قانون کے مطابق وہ سیاسی جماعتوں کو ساتھ ملا کر نہ تو جلسے جلوس کر سکتے ہیں اور نہ ہی سیاسی جماعتوں کی ریلیوں کی قیادت کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح کا عمل کرنے یا اس میں شریک ہونے سے وہ اپنے مقدمہ کی کامیابی کی صورت میں بھی غیر متنازعہ نہیں ہو سکتے۔ میرے پیارے پاکستانیو! ایم کیو ایم ایک جمہوری جماعت ہے جو آئین کے دائرے میں رہ کر کام کرنے پر یقین رکھتی ہے اور ایم کیو ایم چیف جسٹس سپریم کورٹ افتخار محمد چودھری کا احترام بھی کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ان کے ساتھ آئین اور قانون کے مطابق سلوک کیا جائے بلکہ ان کے خلاف دائر کردہ ریفرنس کا فیصلہ بھی آئین اور قانون کے مطابق کیا جائے۔ لہٰذا ایم کیو ایم نے متعدد مرتبہ اپنے جاری کردہ بیانات کے ذریعہ وکلاء برادری سے متعدد بار اپیلیں کیں کہ وہ اپنی احتجاجی تحریک کو خدارا سیاسی جماعتوں سے ہر قیمت پر علیحدہ رکھیں اور اسے ہرگز ہرگز سیاسی (Politicize) نہ ہونے دیں یہی اپیل میں نے چیف جسٹس سپریم کورٹ افتخار محمد چودھری سے اپنے جاری کردہ بیانات میں کی لیکن افسوس کہ بالآخر سیاسی جماعتوں نے وکلاء کی تحریک کو اچک لیا اور جب بھی چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سپریم کورٹ

پیشی پر جاتے یا کسی "بار" سے خطاب کرنے جاتے تو ان کی گاڑی جس میں وہ بیٹھے ہوتے تھے اس پر تین تین سیاسی و مذہبی جماعتوں کے جھنڈے لگے ہوتے تھے۔ اسی طرح ہمارا مخلصانہ اور برادرانہ مشورہ وکلاء برادری اور چیف جسٹس صاحب سے بھی یہی تھا کہ وہ جس بار میں چیف جسٹس کو بلانا چاہیں تو انہیں خطاب کیلئے ضرور بلائیں اور چیف جسٹس صاحب بھی خطاب کریں لیکن ایسے جلسے اور جلوسوں سے ہر قیمت پر پرہیز کریں جہاں سیاسی اور مذہبی جماعتیں ان کے کاندھوں پر اپنی سیاست چمکانے کیلئے انہیں استعمال کرسکیں کیونکہ اس طرح کے عمل سے چیف جسٹس کا عدالتی معاملہ متاثر ہوسکتا ہے اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں یہ سیاسی جماعتیں اپنی شمولیت کی وجہ سے کسی قسم کی آئینی و قانونی رکاوٹ کھڑی کرسکتی ہیں یا عدالت کے حتمی فیصلے میں مشکلات پیدا کرسکتی ہیں۔ میرے معصوم اور بھولے بھالے پاکستانیو! ملک میں موجود موروثی سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے ملک کے استحکام، ملک کی ترقی وخوشحالی اور غریب عوام کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کیلئے کبھی کوئی کام نہیں کیا ہاں البتہ ہمیشہ ملک کے غریب عوام کو اپنے مذموم مقاصد اور مفادات کیلئے استعمال کیا اور آج بھی انہیں استعمال کرنے کا فرسودہ عمل کررہی ہیں لہٰذا اب چند غور طلب نکات میں آپ تمام پاکستانیوں کیلئے پیش کررہا ہوں۔

12 مئی 2007ء

محترم پاکستانیو! جب یہ اعلان سامنے آیا کہ کراچی بار کے وکلاء کے دعوت نامہ پر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری 12 مئی کو ہائی کورٹ بار اور دیگر بارز سے خطاب کرنے کیلئے کراچی تشریف لارہے ہیں تو اس اعلان کے بعد اپوزیشن کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے متحدہ محاذ کی صورت میں سازشوں کے تانے بانے بننا شروع کردیئے اور ایک تیر سے کئی شکار کرنے کے مذموم منصوبے بنانا شروع کردیئے۔ جیسے جیسے 12 مئی کی تاریخ قریب سے قریب تر آنے لگی ویسے ویسے سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے بیانات میں تیزی آنے لگی۔ جب ایم کیوایم نے یہ محسوس کیا کہ لاہور کی طرح یہ سیاسی اور مذہبی جماعتیں کراچی میں بھی چیف جسٹس کے استقبال کی آڑ میں اپنے مذموم اور ناپاک عزائم کے منصوبے بنا چکی ہیں اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی عدالتی کارروائی کو مزید مشکوک اور متنازعہ بنا کر چیف جسٹس کے کیس کو مزید خراب کرنا چاہتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ کراچی کی وکلاء برادری بار بار بیانات دے رہی تھی کہ سیاسی جماعتیں خدارا وکلاء کے احتجاج اور چیف جسٹس کے 12 مئی کے خطاب میں مداخلت نہ کریں لیکن اپوزیشن کی یہ تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں پہلے ہی اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے منصوبے بنا چکی تھیں تو پھر ایم کیوایم کی رابطہ کمیٹی نے اپنے طویل اجلاس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ 12 مئی کو متحدہ قومی موومنٹ بھی عدلیہ کی آزادی اور چیف جسٹس کے کیس کو politicize کرنے کے خلاف ایک بھرپور ریلی نکالے گی اور ایم کیوایم نے 7 مئی 2007ء کو اس ریلی کے انعقاد کا اعلان کردیا اور اس ریلی کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ 10 اور 11 مئی کو اپوزیشن کی تمام ہی جماعتوں نے اپنے اخباری بیانات اور اپنی منعقدہ پریس کانفرنسوں میں یہ اعلان کیا کہ ہم تمام جماعتیں مل کر لاہور ریلی میں کیے جانے چیف جسٹس کے استقبال کے ریکارڈ کو توڑ ڈالیں گے اور اپوزیشن کی تمام جماعتوں نے اپنی پریس کانفرنسوں میں واضح طور پر اعلان کیا کہ ہم یعنی اپوزیشن کی تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں نہ صرف یہ کہ چیف جسٹس کے استقبال کیلئے اپنی اپنی جماعت کی ریلیاں اپنے مرکزی قائدین کی قیادت میں نکالیں گی بلکہ اپوزیشن کی جانب سے نکالی جانے والی ماضی کی تمام ریلیوں کا ریکارڈ بھی توڑ ڈالیں گی۔ اخباری بیانات اور پریس کانفرنسوں میں بڑے بڑے دعوے کرنے والی سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں پاکستان پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن) تحریک انصاف، جماعت اسلامی، اے این پی، ایم ایم اے اور اے آرڈی کی جماعتوں کے علاوہ دیگر اپوزیشن جماعتیں بھی شامل تھیں۔

اپوزیشن کے سازشی منصوبے اور غور طلب نکات

غیور اور باشعور پاکستانیو! اب آپ سے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ اپوزیشن کی سازشوں کو سمجھنے کیلئے اپنی یادداشت پر زور ڈالیں اور پھر غور کریں کہ میری تحریر کردہ یعنی بیان کردہ باتیں کس حد تک درست ہیں اور کس حد تک غلط ہیں۔ جیسا کہ آپ سب پاکستانی واقف ہیں کہ جب کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت اپنے کسی بڑے سیاسی پروگرام کا اعلان کرتی ہے تو وہ اس کی تیاریاں کئی روز قبل شروع کردیتے اور پروگرام والے دن سے ایک

دو دن پہلے اپنے ورکرز اور عوام کو متحرک کرنے، اپنے پروگرام کو کامیاب بنانے کیلئے ماحول بنانے اور پروگرام کی یاددہانی کی غرض سے چھوٹی بڑی ریلیاں مختلف علاقوں میں نکالتی ہیں۔ میں آپ تمام پاکستانیوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ 11 مئی کے دن اور رات کو آپ نے ایم کیو ایم کے علاوہ کسی بھی سیاسی و مذہبی جماعت کو ریلیاں نکالتے دیکھا؟ جبکہ پورے کراچی میں رت جگے کا سماں، ہر گلی، ہر علاقہ اور ہر محلہ میں تھا جہاں ایم کیو ایم کے نغمے بج رہے تھے اور عوام بشمول خواتین اور بچے بچیاں بھی ایم کیو ایم کی ریلیوں میں نعرے لگاتے اور خوش ہوتے نظر آ رہے تھے۔ 12 مئی 2007ء کو علی الصبح سے کراچی میں ایم کیو ایم کی مرکزی ریلی کے انعقاد میں ایم کیو ایم کے کارکنان سرگرم عمل تھے۔ سورج کے ابھرنے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں سے ریلیاں جلوس کی شکل میں نکلتی ہوئی اور مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ملک کے تمام صوبوں سے عموماً اور پورے صوبہ سندھ کے ہر ضلع سے رواں دواں ریلیوں کا سفر بسوں، ویگنوں، ٹرکوں، کاروں اور دیگر ٹرانسپورٹ میں نظر آ رہا تھا یا نہیں؟ اس دوران آپ پاکستانیوں خصوصاً کراچی میں رہنے والے اور مختلف صوبوں اور علاقوں سے داخل ہونے والے افراد بشمول خواتین، بزرگ، نوجوان، بچے اور بچیوں نے کسی ایک بھی یا کتنی جگہوں یا مقام پر اپوزیشن کی پچاس سے زائد جماعتوں کی ریلیوں کو کراچی شہر میں نکلتے دیکھا؟ 12 مئی کو ساڑھے گیارہ بجے دن تک آپ نے اپوزیشن کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے کن رہنماؤں کو کراچی کے کسی بھی مقام پر اس طرح ٹرکوں یا ویگنوں میں کھڑے دیکھا جس طرح آپ اسلام آباد میں چیف جسٹس کی سپریم کورٹ کی پیشی کے وقت ان سیاسی رہنماؤں کو میڈیا پر دیکھا کرتے تھے؟ اپوزیشن کی پچاس سے زائد جماعتوں کے مرکزی قائدین اپنے اعلان کردہ دعووں اور وعدوں کے مطابق کراچی کیوں نہ پہنچے؟ کیا اپوزیشن کی ان تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے مرکزی قائدین کو زمین نگل گئی یا آسمان نگل گیا تھا؟ یا پھر پچاس سے زائد جماعتوں کے تمام مرکزی قائدین کو ایم کیو ایم کے کارکنوں نے اغواء کر لیا تھا؟ آخر یہ سب مرکزی رہنما اپنے وعدوں اور اعلانات کے باوجود اچانک کہاں اور کیوں غائب ہو گئے تھے؟
محب وطن پاکستانیو! آپ بتائیے کہ اپوزیشن کے مرکزی قائدین 12 مئی کو کہاں تھے اور کیوں تھے اور کیوں اپنے وعدوں کے مطابق کراچی نہ پہنچے؟
محب وطن پاکستانیو! 12 مئی کو ایک آگ و خون کا بازار گرم تھا، تمام شاہراہیں بند ہو چکی تھیں لیکن ان تمام تر افسوسناک واقعات کے باوجود یہ خیال میں اپنے ذہن سے نہ نکال سکا کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ہمارے مہمان ہیں اور وہ جس مقصد کیلئے کراچی آئے ہیں اسے پورا کرانا ہمارا اخلاقی فرض ہے لہٰذا میں نے حکومت سندھ کے ذمہ داروں سے رابطہ کر کے درخواست کی کہ کسی بھی طرح چیف جسٹس کو بحفاظت سندھ ہائی کورٹ پہنچانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست حکومت سندھ ضرور کرے جس پر حکومت سندھ نے چیف جسٹس کو پیشکش کی کہ تمام راستے ہنگامہ آرائی کا شکار ہیں لہٰذا آپ ہیلی کاپٹر میں سندھ ہائی کورٹ آ جائیں۔

محب وطن پاکستانیو! اس سانحہ میں ایم کیو ایم کے جو ساتھی شہید ہوئے ان میں اردو بولنے والوں کے ساتھ ساتھ 5 پختون ساتھی بھی شامل تھے، ایک کشمیری کارکن، ایک پنجابی اور ایک ہزارے وال کارکن بھی شامل تھے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پیارے پاکستانیو! سازشی عناصر آج سانحہ 12 مئی کی آڑ میں کراچی، کراچی کے مضافاتی علاقوں، سندھ کے زونوں، پنجاب، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں ایم کیو ایم کے دفاتر پر جو قیامتیں ڈھائی جا رہی ہیں اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کراچی میں متعدد دفاتر کے علاوہ اندرون سندھ کے تقریباً تمام دفاتر کو جلا دیا گیا ہے، صوبہ پنجاب کے مختلف اضلاع میں رہنماؤں اور کارکنوں کو ایم کیو ایم چھوڑنے کی دھمکیاں جاری ہیں۔ کوئٹہ میں واقع صوبہ بلوچستان کے مرکزی دفتر کو آگ لگا دی گئی ہے اور رہنماؤں اور کارکنوں کو ایم کیو ایم چھوڑنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اسی طرح صوبہ سرحد کے مرکزی دفتر کو حکومت نے سیل کر دیا ہے اور وہاں بھی رہنماؤں اور کارکنوں کو ایم کیو ایم سے علیحدگی اختیار کرنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ ان تمام دہشت گردیوں کے باوجود پھر بھی ایم کیو ایم ہی دہشت گرد جماعت ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ کراچی کے مضافاتی علاقوں سے سینکڑوں خاندانوں، علی گڑھ قصبہ کالونی اور مجاہد کالونی سمیت دیگر علاقوں سے اردو بولنے والے خاندانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا جا رہا ہے اور ان کے گھروں پر حملے کرنے والے آزادی سے گھوم رہے ہیں۔ ہم نے تمام حقائق سے حکومت سندھ کے اعلیٰ حکام اور وفاقی حکومت کے اعلیٰ حکام کو آگاہ کر دیا ہے آپ ان مظلوم خاندانوں کی بھی سلامتی کیلئے دعا کریں۔

12 مئی کے سانحہ کا الزام کس پر؟

محب وطن پاکستانیو! آج اپوزیشن کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتیں یک زبان ہو کر 12 مئی کے سانحہ کی ذمہ داری حسب روایات ایم کیو ایم پر ڈال رہی ہیں۔ اب میں یہاں آپ تمام باشعور پاکستانیوں سے سوال کرتا ہوں کہ اگر آپ کا ارادہ کسی ریلی یا جلوس کی آڑ میں ہنگامہ آرائی یا قتل و غارت گری کرنے کا ہو تو کیا آپ اپنی ماں، باپ، بہن، بیٹیوں، بچوں و دیگر فیملی کے افراد کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے؟ یا ساتھ لے جانا پسند کریں گے اور گوارہ کریں گے؟ یقیناً آپ سب کا جواب یہی ہوگا کہ نہیں ہرگز نہیں اور کبھی نہیں یعنی کسی صورت میں بھی نہیں۔ اب آپ خود سوچیں کہ کیا آپ نے الیکٹرانک میڈیا پر ایم کیو ایم کی ریلی میں شریک خواتین، بزرگوں، بچوں اور بچیوں کو نہیں دیکھا؟ اگر ایم کیو ایم کا ارادہ کسی بھی قسم کی ہنگامہ آرائی یا لڑنے جھگڑنے کا ہوتا تو پھر ایم کیو ایم کے لاکھوں کارکنان و ہمدرد اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹے، بیٹیوں اور فیملی کے دیگر افراد کو اپنے ساتھ ریلی میں شرکت کیلئے کیوں لاتے؟

12 مئی معصوم افراد کا بہیمانہ قتل عام:

محب وطن پاکستانیو! آیئے اب میں آپ کو مزید حقائق بتاتا ہوں کہ 12 مئی کو 12 بجے دن جیسے یہ اطلاع الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے سامنے آئی کہ چیف جسٹس سپریم کورٹ افتخار محمد چوہدری کا طیارہ کراچی ایئر پورٹ پر اتر گیا ہے بس اس اعلان کے بعد سازشی عناصر کی جانب سے خفیہ طریقے سے پختون آبادیوں میں چھپائے جانے والے مسلح دہشت گرد سڑکوں پر آ گئے اور انہوں نے ایم کیو ایم کی نکلنے والی ریلیوں پر فائرنگ شروع کر دی اور پھر ایم کیو ایم کے قافلے آگے بڑھنے کے بجائے واپس اپنے اپنے علاقوں کی طرف گامزن ہونے لگے۔ شاہراہ فیصل ناتھا خان گوٹھ سے اچانک اے این پی اور پی پی پی کے دہشت گرد سڑکوں پر نکل کر وہاں سے آنے والی ریلیوں پر فائرنگ کرنے لگے تو ایم کیو ایم کے کارکنان نے فوری طور پر سرد نوجوانوں کی ایک طویل قطار بنا کر بزرگوں، بچوں اور بچیوں کو وہاں سے بھاگ جانے کیلئے کہا کہ تمہیں جہاں بھی جگہ ملے بھاگ جاؤ۔ ایم کیو ایم کی اس قطار میں موجود کئی نوجوانوں کو گولیاں لگیں کچھ وہیں شہید ہو گئے اور کچھ زخمی ہو گئے جنہیں خواتین اور بچوں کے نکل جانے کے بعد زندہ بچ جانے یا زخمی ہونے سے بچ جانے والے کارکنان نے مختلف اسپتالوں میں پہنچایا۔ بہت سے زخمی بروقت طبی امداد نہ ملنے اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کے سبب مالک حقیقی سے جا ملے۔ جب ANP اور PPP کے مسلح دہشت گردوں نے دیکھا کہ ایم کیو ایم کے لوگ غائب ہو رہے ہیں تو وہ اور آگے بڑھتے بڑھتے اسٹار گیٹ ایئر پورٹ کے قریب پہنچنے لگے تو ایک اور مسلح دہشت گردوں کا دستہ ناتھا خان گوٹھ سے نکل کر مین سڑک پر آیا اور اس نے ان تمام گاڑیوں کو آگ لگانا شروع کر دی جنہیں خالی کر کے ایم کیو ایم والے شہید و زخمیوں کو اٹھا کر وہاں سے جا چکے تھے دوسرے مسلح دہشت گرد مزید آگے بڑھ کر فائرنگ کرتے رہے کہ دور کھڑی خالی بسوں میں ایم کیو ایم کے جھنڈے نظر آ رہے تھے تو دوسرے دستے کی فائرنگ سے مسلح دہشت گردوں کے پہلے دستہ کے افراد گولیوں کا نشانہ بنے جن میں کچھ ہلاک اور کچھ زخمی ہوئے اس طرح دوسرے مسلح دہشت گردوں کی فائرنگ سے پہلے دستہ کے مسلح دہشت گرد جن کا تعلق PPP اور ANP سے تھا وہ ہلاک و زخمی ہوئے جس کا تمام تر الزام اپوزیشن کی جماعتیں ایم کیو ایم پر لگا رہی ہیں۔ ایم کیو ایم پر ایسے الزامات پہلے بھی لگائے جاتے رہے ہیں تا کہ ایم کیو ایم کا پیغام حق پرستی ملک کے غریب و متوسط طبقہ کے عوام تک نہ پہنچ سکے اور جن تک پہنچ گیا ہے وہ ایم کیو ایم سے یا تو بدظن ہو جائیں اور ایم کیو ایم کو کسی بھی طرح ایک مکمل قومی جماعت نہ بننے دیا جائے اور ملک کے غریب و متوسط طبقہ کے عوام کو مزید دہائیوں یا صدیوں تک چند موروثی خاندان اپنا ماتحت و غلام بنائے رکھیں۔

آگ اور خون کی اس ہولی میں پولیس، رینجرز کہاں تھی؟

محب وطن پاکستانیو! 12 مئی 2007ء کے سانحہ میں اس سوال کے جواب کا جاننا یا تلاش کرنا خاصا مشکل ہے۔ کیونکہ ملک کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان شہید کے بہیمانہ قتل کی تحقیقات کا انتظار پاکستانی قوم آج تک کر رہی ہے۔ اسی طرح بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو کوئٹہ سے کراچی لانے میں ان کی گاڑی کیوں خراب ہو گئی؟ ان کی گاڑی کا پیٹرول کیوں ختم ہو گیا؟ اور ان کے آگے پیچھے حفاظت کرنے والے گارڈز اس

وقت ان کے ہمراہ کیوں نہ تھے؟ اور انہیں بروقت طبی امداد کیوں نہ مل سکی؟ آج جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ عوام کے تحفظ کی ذمہ دار تو حکومت وقت ہوتی ہے۔ بے شک عوام کے تحفظ کی ذمہ داری حکومت کی ہی ہوتی ہے لیکن آج اعتراضات کرنے والے کیا قوم کو بتانا پسند کریں گے کہ بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں جہاں وفاق اور صوبے میں ان کی حکومت تھی اور ان کے دورِ حکومت میں بے نظیر بھٹو کے سگے بھائی اور ذوالفقار علی بھٹو کی واحد بچ جانے والی نرینہ اولاد مرتضیٰ بھٹو کو کس نے قتل کیا تھا؟ ان کے قتل پر PPP کی حکومت اور ان کے وزراء نے اس غیر ذمہ داری کی حرکت پر وفاق اور صوبہ کی حکومتوں سے اس وقت استعفے کیوں نہیں دیئے تھے؟ اسی طرح جب نواز شریف حکمراں تھے حکومت چلانا اور اسے سنبھالنا اس حکومت کی ذمہ داری تھی لیکن جب وہ قوم سے خطاب کرنے کیلئے 12 اکتوبر 1999ء کو ٹیلی ویژن اسٹیشن پر پہنچے تو وہ قوم سے خطاب کیوں نہ کر سکے اور اپنی حکومت کے برطرف کئے جانے کے عمل سے اپنی حکومت کو کیوں نہ تحفظ فراہم کر سکے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات کا انتظار قوم اور نئی نسل کو نہ جانے کب تک کرنا پڑے گا!

قائداعظم کی گاڑی کیوں کراچی آتے ہوئے خراب ہوئی؟ محترمہ فاطمہ جناح کی ہلاکت کیوں اور کیسے ہوئی؟

خان لیاقت علی خان کے قتل کی سازش کہاں اور کس نے بنائی؟ ذوالفقار علی بھٹو کو ایک متنازعہ فیصلہ پر کیوں اور کیسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا؟ ملک کے دولخت کئے جانے والے مجرموں کو آج تک سزا کیوں نہیں دی گئی؟ آئین پاکستان کو توڑنے والے جرنیلوں و دیگر حکام کو پیپلز پارٹی نے دو مرتبہ اقتدار میں آنے کے باوجود آئین کے آرٹیکل 6 کے تحت کیفر کردار تک کیوں نہیں پہنچایا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب تلاش کرنا ہر ذی شعور محب وطن پاکستانی کا فرض ہے۔ دوسروں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈالنے والوں کو ہاتھ ڈالنے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے گریبانوں میں ضرور جھانک لینا چاہئے۔ ہم بھی آج تک ایسے سوالات کے جوابات کا انتظار کر رہے ہیں کہ 12 مئی 2007ء کو معصوموں کے قتل عام پر پولیس اور رینجرز بروقت کیوں نہیں پہنچی؟ جس طرح 14 دسمبر 1986ء کو کراچی میں علیگڑھ اور قصبہ کالونی کے سانحہ کے موقع پر چھ گھنٹے تک قتل عام ہوتا رہا مگر نہ تو انتظامیہ تھی، نہ پولیس اور نہ ہی قانون نافذ کرنے والا کوئی اور ادارہ وہاں پہنچا۔ 30 ستمبر 1988ء کو سانحہ حیدر آباد میں آدھے گھنٹے تک مسلح دہشت گرد معصوموں کا قتل عام کرتے رہے مگر انتظامیہ غائب...... پولیس غائب...... اور دیگر قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی غائب رہے۔

محب وطن پاکستانیو! الطاف حسین غلط ہے تو کوئی اور سچا رہنما ڈھونڈ لو جو ملک کے 98 فیصد غریب و متوسط طبقہ، خواتین اور اقلیتوں سمیت ہر فرد کو بلا امتیاز رنگ و نسل، زبان و مذہب انہیں انکے حقوق دلا سکے۔ میری جدوجہد کا مقصد غریب و متوسط طبقہ کو اسکے حقوق دلانے کے علاوہ ایک اور بڑا مقصد یہ ہے کہ باقی ماندہ پاکستان کی سلامتی اور بقاء کیلئے جو کچھ بھی میرے بس میں ہے وہ کر کے پاکستان کو ایک مضبوط اور خوشحال پاکستان بنا سکوں۔

میں نے اپنی بساط کے مطابق زندگی کے 30 سال جدوجہد میں صرف کر دیئے۔ اپنی ہر خوشی اور خواہش کو قربان کر دیا، سگے بھائی اور بھتیجے کی قربانی پیش کر دی، ہزاروں پیارے پیارے ساتھیوں کی قربانیاں پیش کر دیں مگر خدا جانتا ہے میں نے کبھی کسی کو قتل کرنا تو کجا نقصان پہنچانے کا درس بھی نہیں دیا، بس میرا جرم یہ ہے کہ میں نہ جاگیردار ہوں نہ سرمایہ دار اور نہ ہی سردار...... بس ہوں تو 98 فی صد عوام میں ہی سے ہوں۔ میں نے کچھ حقائق بیان کر دیئے ہیں اب آپ خود اپنے اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کریں کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے۔

والسلام

آپ کا جلاوطن پاکستانی بھائی

الطاف حسین



کیا مہاجر ہونا گناہ ہے؟

جب سے اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تخلیق کی ہے' تب سے انسانی ہجرت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ بہتر ماحول' بہتر رہائش اور بہتر ذریعہ معاش کی تلاش میں مہاجرت ہمیشہ سے ہو رہی ہے اور جب تک کائنات کی چادر لپیٹ نہیں دی جاتی' یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اللہ کے نبیوں نے بھی اللہ کی وحدانیت کا پیغام پھیلانے اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک خطے سے دوسرے خطے کی جانب ہجرت فرمائی۔ یہ اسوۂ عظیم ہمیں سیدنا ابراہیمؑ کی زندگی میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ہجرت ہی کے سلسلے میں آپ فلسطین سے مکہ تشریف لائے۔ آپ کی ایک اہلیہ محترمہ کا تو نام ہی (حضرت) ہاجرہ ہے' یعنی ہجرت کرنے والی۔ سیدنا موسیٰؑ ایسے جلیل القدر پیغمبر نے اللہ کے دین کی اشاعت وترویج اور اپنی قوم کے مستقبل کے تحفظ کے لئے ہجرت فرمائی۔ اللہ کے آخری نبی کریم ﷺ نے بھی ہجرت فرمائی۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف آپ ﷺ کے جانثار صحابی مہاجر کہلائے جو ہمیشہ اس عظیم عمل پر فخر کرتے رہے۔ انہی مہاجرین مکہ نے اپنے کمانڈر انچیف ﷺ کی اقتدا اور امامت میں نماز عشق ادا کرتے ہوئے دنیا کی تقدیر بھی بدلی اور ناک نقشہ بھی۔ حضور ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ نے بھی ہجرت فرمائی۔

ہمارے عہد کے نامور اور بے مثال محقق اور صاحب اسلوب ادیب مولانا محمد اسحاق بھٹی نے نصف درجن جلدوں پر مشتمل اپنی معرکہ آراء کتاب ''فقہائے ہند'' میں ثابت کیا ہے کہ برصغیر میں اسلام کی اشاعت میں بنیادی کردار مہاجر صحابہؓ نے ادا کیا۔ یہ تحقیقی پہلوان کی ایک اور کتاب ''برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش'' میں زیادہ بہتر انداز میں ملتا ہے۔ اسحاق بھٹی صاحب کا تعلق اہلحدیث علماء سے ہے' اس لئے وہ ہمارے صوفیائے عظام کو کم کم مانتے اور تسلیم کرتے ہیں' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ برصغیر پاک وہند میں اسلام کی لاتعداد شمعیں روشن کرنے اور یہاں کے مشرک معاشرے میں اللہ اور اس کے آخری رسول ﷺ کے پیغام کو عام کرنے میں مہاجر صوفیائے کرام نے بہت نمایاں اور اہم کردار ادا کیا۔ یہ صوفیائے کرام وسط ایشیا سے بھی آئے اور حجاز سے بھی تشریف لائے۔ ہم جو چند نسلوں سے مسلمان ہیں' یہ انہی مہاجر صوفیائے عظام کی خدمات جلیلہ کا صدقہ ہیں اور ہاں' کیا ہم عظیم عالم دین امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی علمی خدمات کو فراموش کر سکتے ہیں؟ انہوں نے علم کی تلاش میں ہندوستان کو خیرباد کہا اور ہجرت کر کے ہمیشہ کے لئے حجاز مقدس جا بسے اور مہاجر کا لفظ اپنے نام کا ناگزیر حصہ بنا لیا۔

انسانوں کے ساتھ پرندے بھی ہجرت کرتے ہیں۔ بہاولپور کے صحراؤں میں ہر سال سردیوں کے موسم میں ہزاروں کی تعداد میں مہاجر پرندے نظر آتے ہیں جو سائبیریا کے یخ بستہ ''صحراؤں'' سے ہجرت کرتے اور لمبی اڑانیں بھرتے ہوئے پاکستان کے نیم گرم علاقوں میں اترتے ہیں۔ یہ پرندے ساری دنیا میں Hobara (تلور) کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے مقوی گوشت سے شکار کے ذریعے لطف اندوز ہونے اور حظ اٹھانے کے لئے عرب شہزادے چارٹر جہازوں میں بہاولپور میں اترتے ہیں۔ انہی مہاجر پرندوں کی ''محبت'' میں متحدہ عرب امارات کے سابق صدر سلطان النہیان مرحوم نے اس علاقے میں محل بھی بنائے اور ہسپتال بھی تعمیر کروائے۔ ان مہاجر پرندوں اور عرب شہزادوں کے بارے میں نہایت دلچسپ کہانیاں سنی ہوں تو معروف ادیب اور سینئر بیوروکریٹ جناب شوکت علی شاہ سے رابطہ کرنا چاہئے' اگر وہ یہ لذیذ کہانی کہنے پر آمادہ ہوں تو آپ سنتے جایئے اور سر دھنتے جایئے۔ موسم سرما میں ان مہاجر پرندوں کا شکار کرنے کے لئے پاکستان آنے والے عرب شکاری

شہزادوں کی مزید حیرت انگیز داستانوں سے دل کو گرمانا ہو تو مشہور امریکی صحافی او ہفت روزہ ''نویارکر'' کی سابق ایڈیٹر میری این ویور کی تازہ کتاب ''پاکستان انڈر دی شیڈو آف افغانستان'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

پاکستان بنا تو جدید تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت ہوئی۔ لاکھوں مہاجرین ہندوستان سے ہجرت کر کے عالم اسلام کی (اس وقت) سب سے بڑی نظریاتی مملکت میں آئے بہتر اور محفوظ مستقبل کی تلاش میں۔ (افسوس ہم اپنا یہ اعزاز زیادہ عرصے تک قائم نہ رکھ سکے) ہندو کے تعصب اور عناد سے نجات حاصل کرنے کے لئے۔ تاریخ کی اس عظیم ہجرت کے عذابوں کو پروفیسر اکبر ایس احمد کی نگرانی میں بننے والی فلم ''جناح'' میں بہت خوبصورتی سے فلمایا گیا ہے۔ 1947ء میں مشرقی پنجاب سے بھی لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے اور اس وطن کو اپنی جان اور وجود کا حصہ بنالیا۔ بھارت کے صوبے یوپی سے بھی بہت سے لوگ مہاجر بن کر پاکستان آئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنالیا' لیکن انہوں نے اپنے علیحدہ تشخص کو برقرار ہی نہ رکھا' بلکہ اسے اپنی علیحدہ پہچان بھی بنائے رکھا۔ اسی پس منظر میں جنرل ایوب خان کی زبان سے اس کمیونٹی کے بارے میں چند غیر محتاط الفاظ بھی سلپ ہو گئے تھے (اگر سلپ نہیں ہوئے تو دانستہ کہے گئے تھے) جسے بنیاد بنا کر بہت مدت بعد اردو ادب کے نامور لکھاری جناب انتظار حسین نے ''آگے سمندر ہے'' کے نام سے ناول بھی تحریر فرما دیا' جس میں تعصب وعناد کی بو واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ مہاجر جو پنجاب میں بس گئے' انہوں نے مہاجرت سے دانستہ اور شعوری طور پر پنڈ چھڑا لیا' لیکن کراچی اور حیدر آباد میں بسنے والے مہاجروں نے اسے مسلسل حرز جاں بنائے رکھا۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں جناب الطاف حسین نے سندھ میں بسنے والے مہاجروں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کے لئے ''مہاجر قومی موومنٹ'' (ایم کیو ایم) بنا ڈالی۔ اپنی تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جناب الطاف حسین نے اسے صوبائی اسمبلی' قومی اسمبلی اور سینٹ میں نمایاں مقام پر لا کھڑا کر دیا۔ اس مقام کا ہی اعجاز ہے کہ جنرل پرویز مشرف کالا باغ ڈیم بناتے بناتے محض اس لئے رک گئے کہ جناب الطاف حسین نے حکومت سے نکل جانے کی دھمکی دی تھی۔

جناب الطاف حسین خود مہاجر نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی پارٹی میں شامل اکثریتی نوجوان مہاجرت کے درجۂ اولیٰ پر فائز ہیں۔ یقیناً ان کے والدین مہاجر تھے' پھر بھی ہم جناب الطاف حسین کو بہر حال مہاجر نہیں کہہ سکتے ہیں' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان سے ہجرت کرتے ہوئے اور لندن میں سیاسی پناہ حاصل کر کے ریفیوجی (مہاجر) کی بنیاد پر ہی برطانیہ کی شہرت حاصل کی ہے۔ اب وہ پاکستان کے کم اور برطانیہ کے شہری زیادہ ہیں' اس لئے بنیادی طور پر انہیں ایم کیو ایم کی قیادت ہی سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔ اس اختلاف کے باوجود اگر کوئی صاحب اپنے نام کے ساتھ مہاجر کا سابقہ یا لاحقہ لگانا چاہے تو ہمیں اس پر اعتراض نہیں ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ پاکستان بھر میں کسی بھی جگہ بسنے والے مہاجر اپنا علیحدہ قومی تشخص نہیں رکھتے۔ جو لوگ ''مہاجر'' کے لفظ اور اس کے خاص پس منظر میں اپنی سیاست کے چراغ جلانے اور اقتدار کے تحفظ کے لئے بہت کچھ داؤ پر لگانے کے لئے تیار بیٹھے تھے' ان سے اتفاق اور اتحاد نہیں کیا جا سکتا۔ مہاجر ہونا گناہ نہیں ہے' لیکن پاکستان کے اندر رہ کر نسلی اور لسانی بنیاد پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر امام بننا پاکستان کے وجود مسعود کو بھی وارا نہیں کھاتا۔ حیدر آباد کے پکا قلعہ آپریشن سے لے کر 12 مئی 2007ء کے سانحہ تک مہاجرت کے پیڈسٹل پر کھڑے ہو کر بہت سے لوگوں نے بہت سے مفادات سمیٹے ہیں اور اس راہ میں قافلے والوں کے دل سے احساس زیاں بھی جاتا رہا' لیکن اب یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔

یہ کیسے مہاجر ہیں جو آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی مہاجر ہیں؟ اب اس چادر کی لپیٹ میں صدر مملکت جنرل پرویز مشرف کو بھی لپیٹنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مثلاً 10 مئی کو کراچی میں بروئے کار ''مہاجر رابطہ کونسل'' (یہ کراچی کے So, Called مہاجر بزرگوں کی جماعت گردانی جاتی ہے اور اسے ایم کیو ایم کا بازو ہی سمجھا جاتا ہے) کے سینئر ارکان (معراج العارفین' یعقوب بندھانی اور تصدق حسین) کی طرف سے چار کالمی بیان شائع ہوا' جس کے الفاظ حیران کن تھے ''جنرل پرویز مشرف کی مخالفت اس لئے کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مہاجر ہیں'' اس بیان میں کس عنصر کی تبلیغ کی گئی تھی؟ اور اس میں جنرل مشرف کو اپنے ساتھ لسانی اعتبار سے بریکٹ کرنے کی کیوں کوشش کی گئی؟ کوئی بھی درمیانی سی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص اس

سے بخوبی واقف ہے' لیکن حیرانی کی بات ہے کہ جنرل صاحب کے آزو بازو میں بسنے والے مشیروں اور وزیروں کی فوج نے اس بارے میں کوئی وضاحت کرنے کا تکلیف ہی نہ کی۔ تقریباً آٹھ دن گزرنے کے بعد صدر جنرل پرویز مشرف نے نجی ٹی وی ''آج'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ''ایم کیو ایم سے میرا تعلق جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے'' سننے' دیکھنے اور بعد ازاں اس بیان کو 18 مئی کو خبر کی شکل میں پڑھنے والوں نے حیرت اور اچنبھے سے سنا اور پڑھا۔ لوگ خود سے سوال کرتے ہیں کہ کیا جناب صدر کو ''مہاجروں سے بریکٹ کئے جانے'' کا بیان دینا چاہئے تھا؟ کیا وہ اس کے علیہ ما علیہ سے باخبر نہیں ہیں؟ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مہاجروں سے ان کا تعلق کسی مخالف نے نہیں' خود مہاجر رابطہ کونسل نے جوڑا' اس کا جواب انہیں خود اس کونسل سے طلب کرنا چاہئے۔

یہ درست ہے کہ ہمارے صدر صاحب بھی مہاجر ہیں۔ وہ پاکستان بننے سے قبل دہلی کی نہر والی حویلی میں پیدا ہوئے اور کمسنی میں اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کرکے پاکستان آ گئے۔ تکنیکی اعتبار سے وہ سچے مہاجر ہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں مہاجروں سے کون جوڑ رہا ہے؟ اور اگر یہ جوڑ ہو بھی جاتا ہے تو اس کا نقصان کیا ہے؟ کیا اس سوچ کو مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے کہ بچپن میں مہاجر ہونے والا شخص ملک کا صدر نہیں بن سکتا؟ اگر ہم اسے ہی پیمانہ بنالیں تو گزشتہ ہفتے' ژاک شیراک کی جگہ فرانس کا نیا منتخب ہونے والا صدر (نکولس سرکوزی) یہ عہدہ کیسے سنبھال سکتا تھا' آخر وہ بھی تو مہاجر ابن مہاجر ہے!! سوچنے والی بات ہے کہ مہاجر کے لفظ سے صدر جنرل پرویز مشرف اتنے چونکے کیوں ہوئے ہیں؟ اس کا جواب محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی سوانح عمری ''ڈاٹر آف دی ایسٹ'' کے اضافہ شدہ ابواب میں دیا ہے۔ وہ جنرل پرویز مشرف کے بارے میں لکھتی ہیں کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں ایک دفعہ پرویز مشرف کو اس بنیاد پر ترقی نہیں دی تھی کہ ان کے لسانی تنظیم ''مہاجر قومی موومنٹ'' سے مبینہ رابطہ ہیں۔ محترمہ لکھتی ہیں کہ اگرچہ اس حوالے سے (ان کے پاس) کوئی ثبوت تو نہیں تھے' لیکن شک کیا جاتا تھا کہ مشرف کا اس لسانی اور اکثر اوقات تشدد پر یقین رکھنے والی تنظیم سے تعلق ہے۔

ہم محترمہ بینظیر بھٹو کے اس بیان کی تائید کر سکتے ہیں' نہ تعریف۔ اس وقت جبکہ 12 مئی کے سانحہ کے حوالے سے ایم کیو ایم کی سینئر قیادت اور لندن میں مقیم الطاف حسین صاحب پر تنقید ہورہی ہے' بینظیر بھٹو کی کتاب میں مندرج اس بیان کو نمایاں کرکے اچھالنا قومی خدمت نہیں ہے...... لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایم کیو ایم' جس نے دانستہ اس تنظیم کے نام سے ''مہاجر'' کا لفظ خارج کر رکھا ہے' ملک بھر میں سخت تنقید و تنقیص کا نشانہ کیوں بنی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ 12 مئی کو جبکہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کراچی بار سے خطاب کرنے جارہے تھے' ایم کیو ایم کی زیر قیادت کارکنوں نے جو غدر مچایا' اس کی کسی بھی اعتبار سے تحسین نہیں کی جاسکتی۔ جناب الطاف حسین نے اس روز اپنے لوگوں کی ریلی سے جو خطاب فرمایا' اس میں وہ قومی رہنما نظر نہ آسکے' ان کی باتوں میں اشتعال زیادہ تھا اور صلح جویانہ عنصر کم کم۔ اس روز ''آج'' ٹی وی سے بہیمانہ سلوک کیا گیا' شہر بھر کو جس انداز میں مصلوب کردیا گیا' تین درجن سے زائد بے گناہ انسانوں کا خون جس بے دردی سے بہایا گیا' بار کے معزز ارکان اور چیف جسٹس صاحب سے جو بدسلوکی کی گئی' اس نے ایم کیو ایم کا چہرہ گہنا اور دھندلا دیا۔ ڈاکٹر فاروق ستار صاحب نے معذرت تو کی' لیکن بہت تاخیر سے' جب بہت سا خون ناحق کراچی کے کوچہ و بازار میں اپنا نقش جما چکا تھا۔ اب صرف الطاف حسین کی معافی اور معذرت ہی ان زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہے' ان کا صلح جویانہ کوئی بیان ہی خون کے دھبوں کو دھو سکتا ہے۔

معاف کیجئے گا' مہاجر ہونا گناہ نہیں ہے' لیکن اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مہاجروں کے ہاتھ میں بندوق تھما دینا یقیناً گناہ ہے۔



کراچی......نامعلوم مسلح افراد کہاں سے آئے

ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری کی کراچی آمد کے موقع پر مختلف جماعتوں کی جانب سے نکالی جانے والی ریلیوں سے مسلح تصادم کے نتیجے میں 36 افراد ہلاک 150 سے زائد زخمی ہو گئے۔ اس دوران پر تشدد واقعات میں مختلف علاقوں میں 40 سے زائد گاڑیاں نذر آتش کر دی گئیں جبکہ 2 پٹرول پمپوں کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ کیماڑی میں نامعلوم مشتعل افراد نے ایم کیو ایم کے آفس کو نذر آتش کر دیا، ایئر پورٹ جانے والے متعدد کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا، پولیس تھانوں میں محصور ہو کر رہ گئی، مسلح افراد سڑکوں پر مورچہ بند ہو کر ریلیوں پر فائرنگ کرتے رہے، دستی بموں سے حملے بھی کیے گئے، زخمیوں اور لاشوں کو اٹھانے کیلئے جانے والے ایدھی کے رضا کاروں کو بھی دہشت گردوں نے زدوکوب کرنے کے بعد واپس بھیج دیا جس کے باعث زخمیوں نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ پورا شہر میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہفتے کو مسلح افراد نے ڈرگ روڈ سے ایئر پورٹ جانے اور آنے والے راستوں پر ٹریلرز، منی بسیں، کوچیں، موٹر سائیکلیں اور بیریئر لگا کر سڑکیں بلاک کر دی تھیں۔ ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ کسی موٹر سائیکل سوار کو بھی رکاوٹیں عبور کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایئر پورٹ کے ملازمین بھی دفاتر جانے کے لیے ڈرگ روڈ پہنچے تو انہیں بھی واپس کر دیا گیا۔ اس دوران ایک سیاسی جماعت کے کارکنان ایئر پورٹ جانے کے لیے ڈرگ روڈ پہنچے تو کارکنوں کا مسلح افراد سے تصادم ہوا، دونوں نے ایک دوسرے پر ہتھیاروں سے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں ایک درجن سے زائد افراد زخمی ہو گئے، نامعلوم افراد نے ایک ٹریلر JT-6051، 2 مہران کاریں اور 12 موٹر سائیکلوں کو نذر آتش کر دیا، پولیس اور رینجرز کے افسران اور اہلکاران شارع فیصل کے تھانے میں محصور ہو کر رہ گئے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ایک "نامعلوم شخص" نے شارع فیصل تھانے کے گیٹ کے باہر تالا لگا دیا، اس موقع پر ڈی آئی جی آپریشن مشتاق شاہ اور پی پی او شارع فیصل بھی تھانے میں محصور ہو گئے، پولیس کی مزید نفری کو طلب کر کے تالا توڑ کر انہیں تھانے سے باہر نکالا گیا۔ اس موقع پر پولیس افسران و اہلکاروں نے شیلنگ و ہوائی فائرنگ کر کے مسلح افراد کو منتشر کر دیا۔

12 مئی 2007ء کا دن کراچی شہر میں لاقانونیت کی حکمرانی کی وجہ سے قتل و غارت اور خونریزی کے دن کی حیثیت سے وطن عزیز کے شہریوں کو مدتوں اداس اور سوگوار بناتا رہے گا۔ اس دن صوبہ سندھ کے دارالحکومت میں سڑکوں پر اسلحہ بردار نامعلوم غنڈوں کا راج تھا۔ مختلف اہم ترین شاہراہیں میدان جنگ کا منظر پیش کر رہی تھیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پاکستان کے اقتصادی دارالحکومت کراچی کو انتظامیہ، قانون کا نفاذ کرنے والے ادارے اور شہریوں کے جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی ذمہ دار پیرا ملٹری فورسز عبوری دور کے لیے خیر آباد کہہ کر کہیں روپوش ہو چکی ہے اور اس کے مکینوں کو آتشیں، مہلک اور خودکار ہتھیاروں سے لیس مخلوق کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک صورتحال تھی۔ نتیجتاً تازہ ترین خبروں کے مطابق 36 بیش قیمت انسانوں کو زندگی ایسی انمول متاع سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سینکڑوں افراد سڑکوں پر زخمی پڑے تھے اور مدد کے لیے پکار رہے تھے لیکن ان کی پکار اور فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ کراچی کے طول و عرض میں 12 مئی کی دوپہر 12 بجے کے بعد امن پسند شہری عدم تحفظ کے احساس میں جکڑے اپنے گھروں کے کونوں کھدروں میں سراسیمہ، خائف، لرزاں اور ترساں ویران آنکھوں سے چھتوں کو گھور رہے تھے کہ شاید آسمان

سے فرشتوں کی کوئی ٹکڑی اترے اور انہیں قانون شکنوں اور امن دشمنوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائے۔ بعض علاقوں میں چاروں طرف سے گولیوں کی سنسناہٹوں اور کارتوسوں کی تڑتڑاہٹوں کی ہولناک اور سماعت خراش صدائیں سنائی دے رہی تھیں گماں گزر رہا تھا کہ کراچی عروس البلاد نہیں بلکہ قریۂ اجل بن چکا ہے۔ سینکڑوں گھر جن کے بچے اور بھائی نامعلوم غنڈوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر لقمہ اجل بن گئے، وہاں سے چیخوں، فریادوں، آہوں اور سسکیوں کی دل ہلا دینے والی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شہر پر خوف، دہشت اور ہراس کی بلائیں منڈلا رہی تھیں۔ یہ بلائیں جانے کس نامعلوم سیارے سے اتریں اور انہوں نے کراچی کی سڑکوں، شاہراہوں اور گلی کوچوں کو اپنا راج محل بنا لیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کراچی میں ضلعی حکومت کے کارپردازان، چیف منسٹر کی ماتحت انتظامیہ، گورنر ہاؤس میں تشریف فرما گورنر کے ماتحت افسران واہلکار، صوبائی وزراء اور ایم این ایز، ایم پی ایز اور خود کو کراچی کے جملہ حقوق کی بلاشرکت غیرے مالک تصور کرنے والی جماعت ایم کیو ایم کے قائدین اور کارکنان اس موقع پر کہاں تھے۔ دنیا بھر میں الیکٹرونک میڈیا کے ناظرین یہ دلدوز مناظر دیکھ کر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور تھے کہ جس ملک کے میگا سٹی میں امن و امان کی صورتحال اس حد تک دگرگوں، مخدوش اور ابتر ہو اس کے دوسرے شہروں اور دور افتادہ قصبوں میں لاقانونیت کا عالم کیا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ 12 مئی 2007ء کا دن بین الاقوامی برادری میں پاکستان کا امیج مسخ کرنے کے حوالے سے ایک سیاہ ترین دن تھا۔

خبر و نظر کی دنیا سے تعلق رکھنے والے مبصرین اور تجزیہ نگاروں نے 12 مئی کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے جس بے باکی سے لب کشائی کی ہے، ان کے خیالات کو پاکستانی میڈیا یا حکومت کے بلند بانگ آزادی صحافت اور آزادیٔ اظہار کے دعوؤں کے باوجود اس لیے پرنٹ، براڈ کاسٹ اور ٹیلی کاسٹ نہیں کر سکتا کہ ان کی نگاہوں کے سامنے ''آج ٹی وی'' کے مرکزی دفتر پر درندوں کے مسلح دھاوے اور 6 گھنٹے تک فائرنگ کے شرمناک واقعہ کی دھاک بیٹھ چکی ہے۔ اس سے پہلے ارباب حکومت مختلف پرائیویٹ نجی ٹی وی چینلز پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کرنے کی مشق کر چکے ہیں لیکن یہ تو کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں جہاں ہزاروں کی تعداد میں پولیس اور رینجرز موجود ہے وہاں ایک پرائیویٹ نجی ٹی وی چینل کا دفتر اور اس کے ساڑھے تین سو کے قریب ملازمین اسلحہ برداروں کے نرغے میں یوں بے دست و پا گھرے بیٹھے ہوں گے کہ بار بار ٹیلی فونک رابطوں کے باوجود انتظامیہ ان کی مدد کو نہ پہنچ پائے گی۔ یہ انارکی دہشت گردی اور غنڈہ گردی کی بدترین مثال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج ٹی وی کے دفتر پر فائرنگ آزادیٔ اظہار پر ننگی جارحیت کے مترادف ہے۔ اس ٹی وی کے عملہ کو ہراساں کرنے والے عناصر کا تعلق یقیناً کراچی کی ایک معروف جماعت سے تھا یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو سول ڈریس میں کیموفلاج کر رکھا تھا اور طے شدہ حکمت عملی کے تحت ان اسلحہ برداروں کے ہاتھوں میں کسی مخصوص سیاسی جماعت کا کوئی پرچم نہ تھا، البتہ ان کے ہونٹوں پر مذکورہ جماعت کے قائد اور صدر پاکستان کے حق میں نعرے تھے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس نجی ٹی وی چینل پر حملہ کے علاوہ کل کراچی میں درجنوں صحافیوں اور فوٹو گرافروں کو بھی نامعلوم غنڈوں کے تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ ''ڈان'' اور ''ڈان نیوز'' کے کیمرہ مین اور فوٹو گرافر پر نہ صرف یہ کہ شرپسندوں کی جانب سے تشدد کیا گیا بلکہ ''ڈان'' کے فوٹو گرافر سے جو کوریج میں مصروف تھے، کیمرہ چھین لیا گیا، اسی طرح ''ڈان نیوز'' کے کیمرہ مین کا کیمرہ توڑ دیا گیا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان کے کپڑے تک بھی پھاڑ دیئے گئے۔ الیکٹرانک میڈیا کے ناظرین اور پرنٹ میڈیا کے قارئین اس پر حیران و ششدر کہ آخر آزادیٔ اظہار، آزادیٔ صحافت اور فریڈم اور میڈیا کے راگ الاپنے والے ''میڈیا دوست'' اور ''میڈیا پرور'' حکمرانوں کے دور میں یہ بدنما مناظر کیوں جنم لے رہے ہیں۔ صوبہ سندھ میں امن وامان کے قیام کی سب سے زیادہ اور بڑی ذمہ داری صوبہ کے پولیس سربراہ پر عائد ہوتی ہے۔ معاصر روزناموں کی اطلاعات کے مطابق وہ شہر میں امن وامان کی صورتحال کو مانیٹر کرنے اور سڑکوں شاہراہوں، پلوں، چوکوں اور گلی کوچوں سے اسلحہ بدست مافیا کے گماشتوں کی وحشت و دہشت کا راج ختم کرنے کے لیے اپنے ماتحت افسران واہلکاران کو مستعدی اور فعالیت بروئے کار لانے کے احکامات صادر کرتے، وہ

کراچی کے بین الاقوامی ہائی اڈے پر موجود رہے اور شام گئے تک اس لاؤنج کے باہر پہرا دیتے رہے، جہاں عزت مآب چیف جسٹس آف پاکستان اوران کے 25 ساتھی وکلاء کو سندھ سپریم کورٹ کی تقریب میں شرکت سے روکنے کے لیے غیر اعلانیہ طور پر ''حبس بے جا'' میں رکھا گیا تھا یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس دوران قائم مقام آئی جی سندھ نے ائیر پورٹ پر موجود صحافیوں کے سوالات سے بچنے کے لیے ایک گھنٹہ تک خود کو''رضا کارانہ'' ائیر پورٹ کی حدود میں محبوس رکھا۔ جونہی وہ ائیر پورٹ سے باہر نکلے تو صحافیوں نے انہیں گھیر لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی، جس پر وہ اس بری طرح برافروختہ ہو گئے کہ توازن اور حواس کھو بیٹھے اور انہوں نے اپنے منصب کے منافی زبان استعمال کی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قائم مقام آئی جی سندھ کی موجودگی میں بھی کسی اور نے نہیں بلکہ ان کے اپنے گارڈز نے صحافیوں پر بندوقیں تان لیں اور کئی صحافیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا ادھر ان کے گارڈز صحافیوں کے خلاف ''ٹارچر آپریشن'' کر رہے تھے اور ادھر قائم مقام آئی جی نے موقع غنیمت جانا اور باقاعدہ برق رفتاری سے دوڑتے ہوئے ائیر پورٹ کے اندر واپس بھاگ گئے۔ قائم مقام آئی جی کی اس برق رفتار دوڑ سے بھی کئی سوالات عام شہریوں کے ذہن میں جنم لے رہے ہیں۔ وہ یہ استفسار کر رہے ہیں کہ جس صوبے کا قائم مقام آئی جی نہتے اور بے ضرر قلم بدست صحافیوں کے سوالات سے خوف کھا کر ٹوک دم بھاگ جائے، وہ اور اس کے ماتحت پولیس افسران و اہلکاران خود کار اسلحہ بردار شر پسندوں کا کیونکر سامنا کر سکتے ہیں۔ قائم مقام آئی جی صوبہ سندھ کی صحافیوں کے ساتھ بدکلامی اور بدزبانی بھی اس امر کا مظہر ہے کہ ریاستی مشینری ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میڈیا کی تذلیل وتحقیر کر رہی ہے۔

12 مئی کو ریلیوں کے دوران دہشت گرد مختلف علاقوں اور دیگر مقام پر کھلے عام جدید اور خود اسلحہ لے کر گھومتے رہے جبکہ کراچی کی سڑکوں اور اہم مقامات پر رینجرز اور پولیس کا نام ونشان تک نہیں تھا اور شہر کا کنٹرول مسلح افراد نے خود سنبھال لیا تھا۔ کراچی شہر پر 80 کی دہائی کے اس بیروت کا گماں گزر رہا تھا جو خانہ جنگی کی زد پر تھا۔ شارع فیصل چیف جسٹس کے استقبال کے لیے جانے والے شہریوں اور اپوزیشن میں شامل جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کے لیے منظم منصوبہ بندی کے تحت نوگوایریا بنادی گئی تھی۔ 12 بجے کے بعد یہ نوگوایریا بتدریج ''ڈینجر زون'' بنتا گیا۔ ایک موقع پر تو یہ اہم ترین شاہراہ ''وار فیلڈ'' بن گئی۔ مسلح نوجوانوں نے ڈرگ روڈ پر پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن)، عوامی نیشنل پارٹی، پی ڈی پی، تحریک انصاف، پنجابی پختون اتحاد اور دیگر پارٹیوں کے اہم رہنماؤں پر براہ راست فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں متعدد افراد ہلاک وزخمی ہو گئے اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں میں شدید خوف وہراس پھیل گیا۔ چیف جسٹس کے استقبال کے لیے آنے والے جلوس ڈرگ روڈ سے واپس عوامی مرکز تک پہنچے تو بلوچ کالونی پر گھات لگائے مسلح افراد نے دوبارہ سیاسی ریلیوں پر حملہ کر دیا اور گولیاں اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے ارکان قومی وصوبائی اسمبلی کی گاڑیوں پر لگیں مسلح افراد موٹر سائیکلوں پر سوار تھے۔ اس موقع پر مظاہرین نے ایک مقامی سیاسی جماعت، صوبائی اور وفاقی حکمرانوں کے خلاف شدید نعرے بازی کی۔ یہ امر حیران کن ہے کہ 12 مئی کو 12 بجے دوپہر سے لے کر رات گئے تک شاہراہ فیصل پر رینجرز، پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار مکمل طور پر غائب رہے۔ یہ امر کراچی کے ان شہریوں کے لیے جو قانون کی عملداری، عدلیہ کی بالادستی اور چیف جسٹس کی بحالی کے موقف کے تحت ان سے اظہار یکجہتی کے لیے ائیر پورٹ پہنچنا چاہتے تھے، انتہائی تکلیف دہ تھا کہ گورنر سندھ کے وعدے کے باوجود کہ چیف جسٹس کو ہائیکورٹ بار کی تقریب میں شرکت کے لیے ''سیو پیج'' فراہم کیا جائے گا، چیف جسٹس کے استقبال کے لیے ائیر پورٹ جانے والے راستوں کو رینجرز اور پولیس کی بھاری جمعیت نے رکاوٹیں کھڑی کر کے سیل کر رکھا تھا۔ دن بھر لاشیں گرتی رہیں، لہو بہتا رہا اور سڑکیں معصوم اور بے گناہ شہریوں کے خون سے گل رنگ ہوتی رہیں۔ یہ صورتحال انتہائی بھیانک مستقبل کی عکاسی کرتی ہے۔ اگر تمام سیاسی جماعتوں نے مل کر کراچی میں قیام امن وامان کے لیے اجتماعی کوششیں نہ کیں تو بعض مبصرین کے اس خدشے کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ کراچی میں ایک بار پھر 1986ء کے سے حالات پیدا کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ یہ ایک زمینی حقیقت ہے کہ کراچی شہر میں ایم کیو ایم کے بڑی سیاسی جماعت کی

حیثیت سے موثر کردار ادا کر سکتی ہے اور اس کی قیادت پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کراچی میں امن اور بھائی چارے کی فضا کو قائم رکھنے کے لیے رواداری، تحمل اور برداشت کی اعلیٰ ترین اقدار کو آگے بڑھانے کے لیے دیگر سیاسی جماعتوں سے مکالمے کی راہ ہموار کریں۔ اسی طور نفرتوں کی ان بارودی سرنگوں کو جنہیں نادیدہ ہاتھوں نے کراچی کے گلی کوچوں میں بچھا دیا ہے، ڈی فیوز کیا جا سکتا ہے۔ گورنر سندھ اور وزیر اعلیٰ سندھ کو کراچی اور صوبائی انتظامیہ کی اس امر پر باز پرس کرنا چاہئے کہ جب 12 مئی کو کراچی میں لوگ مر رہے تھے تو انہوں نے خاموش تماشائی کا کردار کیوں ادا کیا۔ یاد رہے کہ سندھ حکومت پولیس اور رینجرز پر اپنے بجٹ کا بڑا حصہ خرچ کرتی ہے اور پولیس کے لیے اربوں روپے مالیت کا جدید ترین اسلحہ، گاڑیاں اور دوسرا ساز و سامان خرید رہی ہے۔ اس کے باوجود پولیس اور رینجرز کے افسران اور اہلکاران شہر میں امن و امان قائم کرنے میں کہاں تک کامیاب رہے یا انہیں قیام امن و امان سے کتنی دلچسپی ہے۔ اس کا ایک بار اور اندازہ 12 مئی کو اس وقت ہوا جب متحارب سیاسی جماعتوں کے کارکنوں میں فائرنگ کے تبادلے کے واقعات ہوئے۔ مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ کراچی کو ناجائز اسلحہ سے پاک کرنے کے لیے بلا امتیاز آپریشن کلین اپ کیا جائے۔



12 مئی کی ایف آئی آر

جب روم جل رہا تھا تو' نیرو بانسری بجا رہا تھا اور جب کراچی جل رہا تھا تو اسلام آباد میں لڈی اور بھنگڑہ شو ہو رہا تھا اور اس میلے کا اہتمام کرنے والے' عوام کے نمائندے اس شو کو اپنی عوامی طاقت قرار دیتے ہوئے بلٹ پروف شیشے کی دیواروں کے پیچھے بیٹھے اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور خود کو یقین دلا رہے تھے کہ اس وقت پوری سولہ کروڑ عوام ان کی طاقتور مٹھی میں ہے' جسے وہ جب چاہیں ریت کے ذروں کی طرح گرا سکتے ہیں۔ اور یہ ریت کے ذرے اسلام آبادی کلچرل میلے سے دور بحیرۂ عرب کی نم ہواؤں کی زد میں آ کر بگولوں کی طرح شہر قائد میں چکراتے پھرتے تھے۔ چونکہ یہ وجود نہیں رکھتے تھے' اس لئے بے نام و بے شناخت تھے۔ لہٰذا اندھی گولیوں کا نشانہ بننا ان کا مقدر تھا۔ انہیں مورچہ بند نامعلوم قاتلوں نے نشانہ باندھ باندھ کر خاک اور خون میں نہلایا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے' بے فکری اور مکمل اطمینان سے تمام دن اپنا شغل جاری رکھا۔

قانون کے ادارے' ان کی جانوں کے محافظ' پولیس' رینجرز اور ان کے سربراہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد کی مثال بنے اس قتل و غارت گری کا تماشہ دیکھتے رہے۔ بالکل رومی اکھاڑوں میں کھیلے جانے والے زندہ انسانوں اور بھوکے شیروں کا کھیل دیکھنے والے تماش بینوں کی طرح اور خلق خدا سڑکوں' گلیوں اور بازاروں میں ذبح ہوتی رہی۔ منی پاکستان جلتا رہا' منی پاکستان کی عمارتوں' گھروں' دکانوں' پٹرول پمپوں' بسوں' ویگنوں اور دیگر نجی و قومی املاک سے دھوئیں کے بادل اٹھتے رہے۔ روشنیوں کے شہر کو جلا کر خاک کر دیا گیا۔ اس کے قمقموں سے لہو ٹپکتا رہا۔ اس کی ہواؤں میں انسانی جسموں کے چیتھڑے اڑتے رہے۔ ماتمی بینوں کی پتنگیں اس کی کثیف فضاؤں میں اڑتی رہیں اور ہم اسلام آباد میں......ہم زندہ قوم ہیں...... پائندہ قوم ہیں...... کے ملی ترانے بجا کر اپنی قومی ''غیرت'' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے جبکہ ادھر شہر قائد میں ملت کا بھرکس نکلتا رہا۔ موت کا نقارہ چار سو بجتا رہا اور حشر کا دن' اپنی تانبے کی زمین اور نفسا نفسی کا سامان لئے' اہل کراچی کو اپنی دہشت کے نظارے کراتا رہا۔ ہم زندہ قوم ہیں' واقعی اے روشنیوں کے شہر' ہم زندہ قوم ہیں۔ جبھی تو باغوں کی ساری بہار اور محفلوں کی رونق' اٹھ کر ''استحکام پاکستان'' کے منظر میں قید ہو گئی ہے اور ہم کہہ رہے ہیں' کس قدر فخر سے کہ عوام کی طاقت ہمارے ساتھ ہے اور جو اس طاقت سے ٹکرایا وہ کچلا جائے گا۔ یقیناً اس میں کیا شک ہے۔

12 مئی کے حشر میں وہ بیگناہ اور نہتے جو جگہ جگہ سجائی جانے والی قتل گاہوں میں بے چون و چرا مارے جاتے رہے اور بعد ازاں ان کے بے گور و بے کفن لاشے کھلی سڑکوں پر زرد پتوں کی طرح بکھرے رہے' انہیں دیکھ کر روشنیوں کے شہر پر عراق و افغانستان کا گمان گزرتا رہا اور ارض پاک پر کسی ایسی بد دعا کے سائے نظر آتے رہے' جس کے توڑ کیلئے کالی دیوی کے چرنوں میں انسانی خون کی ندیاں بہانی ضروری قرار دے دی جاتی ہیں۔ یہ فیصلے پنڈتوں اور پروہتوں کے ہوتے ہیں۔ خدا جانے وہ نامعلوم دہشت گرد جو 12 مئی کو کراچی کے معصوم شہریوں میں موت بانٹتے رہے' وہ کہاں سے آئے تھے اور انہیں کالی ماتا کے چرنوں میں بیگناہوں کی قربانی کا پرمٹ کس نے جاری کیا تھا۔ وہ کون پنڈت اور پروہت تھے جنھوں نے یہ بے رحمانہ فیصلہ صادر کیا؟؟

اسلام آباد میں بلائی جانے والی بھاڑے کی عوام کو اپنی طاقت قرار دینے والے کراچی کے گلی کوچوں میں بیدردی سے ذبح کر دیئے جانے والوں کو عدلیہ اور اپوزیشن کی پارٹی قرار دے کر ان کے لہو کی حرمت کے عہد سے خود کو آزاد سمجھتے ہیں تو ان کی مرضی' مگر انہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے:

جو چپ رہے گی زبان خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

اور لہو کی یہ پکار اتنی شدید ہوتی ہے کہ پھر چاہے کانوں میں روئی ٹھونسیں یا انگلیاں' یہ سنائی دے کر ہی رہتی ہے۔
شہر قائد میں رینجرز کی تعیناتی' انہیں فری ہینڈ دینے کا حکم نامہ' تین درجن سے زیادہ لوگوں کی ہلاکت' سینکڑوں زخمی اور شہر میں کرفیو جیسے حالات اور مزید ہلاکتوں کی ذمہ داری حکومت چیف جسٹس اور اپوزیشن پر ڈال رہی ہے اور اپوزیشن' حکومت اور اس کے اتحادیوں پر' کوئی بھی اس اتنے بڑے سانحہ کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں۔ سبھی کو اپنے اپنے دامن عزیز ہیں' جنہیں اجلا رکھنے کیلئے وہ روزانہ ڈرائی کلینرز سے انہیں کلین کرواتے رہتے ہیں اور خود کو دھلا دھلایا' نہایا دھویا سمجھتے رہتے ہیں۔ اسی لئے خون کی ہولی کے بعد بھی ان کی آستینیں بے داغ اور اُجلی ہی ہیں اور ان کے خنجروں کی نوک پر لہو کا ایک قطرہ بھی دکھائی نہیں دیتا اور بیگناہوں کا خون اپنی ایف آئی آر کٹوانے کے انتظار میں انصاف کے موسموں کا انتظار کرتا رہا' جسے رائیگانیوں کے زمانے کھا جاتے ہیں۔
12 مئی کے دن' جس سفاکی اور بے رحمی سے کراچی کی زمین پر بیگناہوں کا خون بہایا گیا اور بعد میں ایک دوسرے کو الزام دے کر جس بے دردی سے اس خون کی رائیگانی کو ثابت کیا گیا' اس پر کونسا دل ہے جو افسردہ نہیں۔ کونسی آنکھ ہے جو اشکبار نہیں۔ روشنیوں کا شہر جو اک لمبا عرصہ نحوستوں کے سائے میں رہنے کے بعد بمشکل امن کی طرف لوٹا تھا' ایک دفعہ پھر ایسی بدامنی کی لپیٹ میں آ چکا ہے' جس نے اس کے در و دیوار کا سکون چاٹ کر' اس کی فضاؤں میں دھواں ہی دھواں' خوف ہی خوف بھر دیا ہے۔ آگ کے شعلوں اور دھوئیں کی کثافت میں گھرے شہر کی ویران سڑکوں پر بے امانی رقص کرتی ہے اور جمے ہوئے خون کے مٹیالے دھبے دست قاتل تلاش کرتے ہیں۔
شنید ہے قاتل تو دہشت گرد تھے' اچانک کہیں سے نمودار ہوئے اور اپنا کام سرانجام دینے کے بعد غائب ہو گئے جبکہ سب تو اُجلے لوگ ہیں' عوام کے غم میں آٹھ آٹھ آنسو بہانے والے' بلٹ پروف شیشوں کے پیچھے بیٹھ کر عوامی طاقت کا نظارہ کرنے والے' ٹکے ٹکے کے عوض بکتی جانوں کا مول تین تین لاکھ لگانے والے' انہیں کیا معلوم' نامعلوم دہشت گرد کہاں سے نکلے' کدھر گئے۔ اب وہ ان کے کھرے تو ڈھونڈنے سے رہے۔ سو' روشنیوں کے شہر کے باسیوں کو سمجھ لینا چاہئے' یہ ہونی تھی جسے ٹالنا ممکن نہ تھا۔
روم کو جلنا تھا اور نیرو کو اسے جلتا دیکھ کر اپنی بانسری بجانا تھی۔ تاریخ یہی بتاتی ہے اور حکمرانوں کی تاریخ کم و بیش ایک جیسی ہی ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا استحکام پاکستان شو سے اپنی طاقت تولنے والوں کو عوام کو بتانا تھا کہ ہم زندہ قوم ہیں...... واقعی ہم زندہ قوم ہیں...... جب کراچی جل رہا تھا تو ہم کوک اڑا رہے تھے' منرل واٹر بہا رہے تھے اور لڈیاں' جھومر اور بھنگڑے ڈال رہے تھے۔
واقعی ہم زندہ قوم ہیں' مگر کراچی کی ویران سڑکوں پر یہ کن بے اماں لوگوں کا غول نظر آتا ہے' جو لہولہو وجودوں کے پرچم اٹھائے' خون ناحق کی ایف آئی آر کٹوانے نکلا ہے۔ مگر اسے کوئی راستہ ہی نہیں دیتا' جگہ جگہ رکاوٹیں ہیں' رینجرز کے ہاتھوں میں بندوقیں ہیں' پولیس کا لہجہ سرد ہے' انصاف خود اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے اور حاکم اپنی طاقت کے اظہار میں گم ہیں۔ سو ایف آئی آر کیسے درج ہو؟ مگر نامعلوم قاتلوں کے خلاف ایف آئی آر جو اب تک کراچی کے کسی تھانے' کسی پولیس سٹیشن میں درج نہیں ہوئی' تاریخ کے صفحات میں ضرور درج ہو گئی ہے۔ آنے والے وقت میں جب بھی 12 مئی کا دفتر کھولا جائے گا تو یہ ایف آئی آر بھی ضرور سامنے آئے گی' اپنے اصل حقائق کے ساتھ۔ کیونکہ اس وقت خون ناحق کا الزام ایک دوسرے کی گردنوں پر ڈالنے والے' لاشوں کی سیاست کرنے والے منظر پر موجود نہ ہوں گے۔
مطالعہ پاکستان کے ان تمام ہیروؤں کو غیر جانبدار مورخ ہرگز بھی ہیرو نہیں لکھے گا۔ پاکستان کی مختصر تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو ایوب خانوں' یحییٰ خانوں' ضیاء الحقوں اور چند دوسروں کو دیکھ لیں۔ غیر جانبدار مورخ کو چھوڑیں' مطالعہ پاکستان اب ان کے بارے میں کیا کہتا ہے' یہی پڑھ لیں۔ تاریخ کا ادراک رکھنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اک فیصلہ حاکم وقت کرتا ہے اور اک فیصلہ خود وقت کرتا ہے۔ اپنے قاتلوں کے خلاف 12 مئی کی ایف آئی آر درج نہ کروا سکنے والوں کو اسی فیصلے کا انتظار ہے!!



پختون قوم پرستوں کی آزمائش

اے این پی کے سربراہ اسفندیار ولی سے گورنر سندھ کی ملاقات اور حکومت سے بعض نکات پر پیش رفت کے بعد ہڑتال موخر کئے جانے کے فیصلے کے باوجود چونکہ شہر کی دیگر موثر سیاسی و مذہبی جماعتیں اور وکلاء سمیت مختلف تنظیمیں اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی ہیں اس لئے غریب پرور کراچی تاحال غیر یقینی کیفیت سے دوچار ہے' آئے روز نت نئے وسوسے دلوں میں جنم لے رہے ہیں۔شہری حالات کے رحم وکرم پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ہر کوئی ایک دوسرے سے یہ سوال پوچھتا ہوا مضطرب نظر آرہا ہے کہ کل کیا ہوگا......!! شہر کی اس صورتحال نے اندرون و بیرون ملک وطن عزیز کے باسیوں کو بھی فکر مند کر رکھا ہے۔فضا اس قدر گرد آلود' مشکوک اور غیر یقینی ہے کہ مستقبل کے حوالے سے یقینی بات تو کیا کوئی پیشین گوئی بھی نہیں کی جاسکتی......نہیں کہا جاسکتا کہ آسمان شہر پر چھائے گرجتے سیاہ بادل کسی طوفان کا پیش خیمہ ہیں یا یہ مظلوم' غیر محفوظ اور غریب شہریوں کیلئے باران رحمت لئے ہوئے ہے' غیر یقینی کی یہ صورتحال نہ تو یہود و ہنود نے پیدا کی ہے اور نہ ہی دشمن کے طرفدار ہمارے یا امریکہ نے ماضی کی طرح اس میں اپنا حصہ ڈالا ہے بلکہ اس کے محرک وسبب وہ ہیں جنہیں ہمارے اپنے ہونے کا نہ صرف دعویٰ ہے بلکہ جو اپنائیت کے ثبوت کی خاطر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کیلئے ہماری لاشوں پر سے گزرنے کو بھی محبت کی ایک ادا سمجھتے ہیں۔حضرت اقبال نے کہا تھا......

انوکھی وضع ہے' سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق' کونسی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں

کیا حکمران کیا اپوزیشن......کسی جانب شہریوں کو اس اذیت ناک صورتحال سے نکالنے کیلئے کوئی کوئی سنجیدہ' حقیقی اور ایسی کوششیں جو متاثرین کے قلبی سکون کا باعث بنیں ہنوز مفقود ہیں۔اپوزیشن کا یہ موقف برمحل اور صائب ہے کہ حکمران انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے بربریت کے ان واقعات میں ملوث ملزمان کو گرفتار کرلے تاکہ بات آگے بڑھے' اس سلسلے میں مشکل اس لئے بھی نہیں ہونی چاہئے کہ ایک تو حکومت نے روایتی طور پر ان واقعات کی ذمہ داری ابھی تک نہ تو ''را'' پر ڈالی ہے اور نہ ہی طالبان یا القاعدہ کو قصوروار ٹھہرایا ہے چنانچہ اپوزیشن کی بعض جماعتیں اگرچہ لاشوں پر سیاست کے حوالے سے معروف ہیں اور وہ اس طرح کے موقع کو کیش کرانے کے ہنر میں بھی اپنی مثال آپ ہیں لیکن اس کے باوجود ایسی جماعتوں سمیت تمام اپوزیشن کے اس سوال سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ کشت وخون کا بازار حکمرانوں کے عین ناک کے نیچے گرم رہا لہٰذا ملزمان تک رسائی میں آخر کی مصلحت مانع ہے......!! ملزمان کی گرفتاریاں اور ذمہ داروں کیخلاف کارروائی ہی وہ قدم ہوسکتا ہے جس کے نتیجے میں شہر میں قیام امن کیلئے پیش رفت کا آغاز ممکن ہے' وقتی' مصنوعی اور شہداء کے ورثاء اور زخمیوں کو اعتماد میں لئے بغیر مصلحت آمیز اقدامات سے بالفرض اگر امن خرید بھی لیا جائے تو اس کے پائیدار ہونے کا یقین خود کو دھوکا دینے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

کوئی بھی ذی عقل اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ شہریوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت مملکت کا فرض اول ہوتا ہے اور اگر کوئی شہریوں کے ان حقوق کو پامال کرنے کا مرتکب ہوجاتا ہے تو ریاست اسے کیفر کردار تک پہنچا کر اس قبیل کے دیگر عناصر کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہتی ہے کہ اس طرح کے کسی فعل کا انجام کیا ہوسکتا ہے اور اگر مجرم سزا سے بے خوف دندناتے پھرتے رہیں تو قانون اپنی اہمیت وافادیت کھو بیٹھتا ہے معاشرہ انارکی کا شکار ہوجاتا ہے اور پھر جو جتنا طاقتور ہوتا ہے اتنا ہی قانون کا مذاق اڑاتا ہے اس طرز عمل کو عرف عام میں جنگل کا قانون کہا جاتا ہے......اب

اسے کیا کہا جائے کہ اب تک سانحہ 12 مئی کے ملزمان کو نہ صرف یہ کہ قانون کی گرفت میں نہیں لایا جا سکا ہے بلکہ 47 بے قصور شہریوں کو حوالہ اجل کرنے والوں کا تعین تک نہیں ہو سکا ہے' ہمارے حکمران بم دھماکوں کو خودکش قرار دیکر بڑی معصومیت سے یہ کہہ کر خود پر سے ذمہ داری کا بوجھ اتار پھینکتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات کا سدباب اور ملزمان تک رسائی آسان امر نہیں' لیکن مسلسل 8 گھنٹے تک ایسی خون کی ہولی جسے کیمرے کی آنکھ سے پوری دنیا نے دیکھا' اگر حکمران نہ دیکھ سکے ہوں تو جان لینا چاہئے کہ یہ حکمران بصارت سے محروم ہیں اور یا پھر انہوں نے دانستہ آنکھیں بند کر لی تھیں لہٰذا ہر دو صورتوں میں حکمران' حکمرانی کیلئے نااہل قرار پاتے ہیں کہ اندھے اور راہ چلتے آنکھیں بند کرنے والے ڈرائیور سے حادثہ کے ماسوا اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے......!!

مہذب معاشروں میں ہوتا بھی یہی ہے کہ کسی بڑے واقعہ اور بالخصوص ایسے واقعہ جو دیگر بڑے واقعات کا موجب بن سکتا ہے کے رونما ہونے پر یا تو ذمہ داروں کا تعین کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جاتا ہے اور یا پھر حکمران ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے مستعفی ہو جاتے ہیں۔ یہ روایت عوام اور حکمرانوں دونوں کیلئے باعث خیر ثابت ہوتی ہے اور اقوام عالم میں اس مملکت کیلئے عزت کا وسیلہ بھی...... ہمارے ہاں اس طرح کی روایات خوردبین سے بھی دیکھنے کو نہیں ملتیں لہٰذا اب کس خوش فہمی کے تحت یہ توقع رکھی جائے کہ ہم بھی ایسی درخشاں روایت کی داغ بیل ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس سے جھکے ہوئے سر فخر سے بلند ہو سکیں......!! لیکن اگر ایسا ہوتا کہ دہشت گردوں کی گرفتاری میں ناکامی پر امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ داروں کیخلاف فوری کارروائی عمل میں لائی جاتی کہ انہوں نے ان شہریوں کی جان و مال کی حفاظت سے چشم پوشی کی جو ان کی بھاری تنخواہوں و مراعات کیلئے اپنا پیٹ کاٹ کر ٹیکس پر ٹیکس ادا کرتے رہے تھے......اور اگر انہیں کسی نے ایسا کرنے کے احکامات دیئے تھے تو اسے قانون کے دائرہ میں لایا جاتا یا پھر متعلقہ وزیران مشیران اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے مستعفی ہو جاتے تو یہ عمل آگ کی شدت کم کرنے کا باعث بنتا اور بعد ازاں عدلیہ کے جج صاحبان سے واقعہ کی تحقیقات کرا کے ذمہ داران کے تعین پر تادیبی کارروائی عمل میں لائی جاتی' لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے حکومت اپوزیشن پر اور اپوزیشن حکومت پر ذمہ داری ڈالنے کیلئے فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس طرح کے ہتھکنڈوں اور شعبدے بازیوں سے ماضی میں بھی عوام کو دھوکے میں رکھنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اس فلسفہ پر عمل کیا جاتا رہا ہے کہ جھوٹ بولو اتنا جھوٹ بولو کہ لوگ اس کو سچ جانیں!! لیکن اب شاید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے کو ہے کہ ایک چیف کے دوسرے چیف کے سامنے کلمہ حق نے فضا ہی بدل ڈالی ہے۔ اب جہادیوں' روشن خیالوں' قوم پرستوں اور جمہوریت پسندوں کا فعل ہی ان کے قول کی تصدیق کا ذریعہ تسلیم کیا جائیگا' ایسا نہیں ہوگا کہ جہاد کا نعرہ لگانے والے عوام کو تو افغانستان بھیج دیں اور خود اسلام آباد میں مال غنیمت سمیٹنے میں لگ جائیں یا روشن خیالی کے داعی' عوام کے گھروں کو تاریک کریں اور وہ پھر بھی اپنے روشن شبستانوں میں بے فکر خراٹے لیتے رہیں' اس طرح کے خواب اب خواب ہی رہیں گے یا پھر جمہوریت پسند نام تو جمہوریت کا لیں اور ڈیل آمریت سے کر لیں اور لوگ پھر بھی "ہو جمالو" پر رقصاں رہیں' شاید اب یہ سوچ عمل کا جامہ زیب تن نہ کر سکے......!! اسی طرح کا امتحان پختون قوم پرست کو بھی درپیش ہے کہ پارلیمانی نظام میں عددی تناسب کے باعث کوئی بڑا رول نہ رکھنے کے باوجود کراچی کے حالیہ واقعات نے انہیں ایک بڑی آزمائش کے بالمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ پختون قوم پرستوں جماعتوں میں پختونخوا ملی عوامی پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی دو ایسی جماعتیں ہیں جنہیں صوبہ سرحد' بلوچستان' سندھ اور قبائلی علاقوں کے علاوہ افغانستان اور دنیا بھر میں آباد پختون قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں۔ پختونخواہ ملی عوامی پارٹی کے سربراہ محمود خان اچکزئی' خان شہید عبدالصمد اچکزئی کے صاحبزادے اور اے این پی کے سربراہ اسفند یار ولی جنگ آزادی کے مجاہد خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان کے پوتے ہیں۔ کراچی کے حالیہ واقعات میں چونکہ شہداء کی غالب اکثریت پختونوں کی ہے لہٰذا اب ان دونوں رہنماؤں کی بصیرت' بصارت' سیاست' تجربے اور اخلاص کا امتحان ہے کہ ایسے جذباتی کارکنوں' جو اپنے دکھوں کا مداوا چاہتے ہیں ان کے اطمینان قلب کیلئے کیا سامان کرتے ہیں اور شہر میں لگی آگ کے بلند ہوتے ہوئے شعلوں کے بجھانے کیلئے کیا سبیل نکالتے ہیں۔ بلاشبہ سہ روزہ ہڑتال کی کال 8 جون تک مؤخر کرنے کے فیصلے کو ستائش کی نگاہ سے ہی دیکھا جائیگا کہ ہڑتالوں کے ایسے حکمرانوں پر کیا اثر ہوتا ہوگا جو سڑکوں پر لاشوں کو دیکھنے

کے باوجود بھنگڑا ڈالنے میں مگن رہتے ہوں البتہ ہڑتالوں سے غریبوں کے گھروں میں غربت کے سائے مزید گہرے ہو جاتے ہیں۔

23 مئی کو گورنر سندھ کی اسفند یار ولی سے ملاقات قیام امن کے سلسلے میں یقیناً مثبت پیش رفت ہے لیکن یہ سوال ہنوز حل طلب ہے کہ کیا ایسے اقدامات بروئے کار لائے جا سکیں گے جن سے شہداء کے لواحقین اور زخمیوں کی تشفی ممکن ہو سکے گی' اس ملاقات کے بعد اگر متحدہ قومی موومنٹ اور اے این پی کے لیڈران کرام کے بیانات کی گھن گرج کچھ مدھم ہو تو اندازہ لگایا جا سکے کہ حالات کس طرف جا رہے ہیں۔ جہاں تک لسانی اکائیوں کے باہمی تصادم کے خدشے کی بات ہے تو اس سلسلے میں جناب محمود خان اچکزئی کا موقف بہت واضح اور لائق تحسین ہے کہ وہ عام مہاجر کو ان واقعات کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے اور سمجھتے ہیں کہ ایک غریب اردو بولنے والے کے ساتھ پشتونوں کا کوئی جھگڑا نہیں ہے ان کی اس مدبرانہ اور حقیقت پسندانہ سوچ نے تصادم کی سازش کرنے والوں کو یقیناً مشکل میں ڈال دیا ہوگا۔ جبکہ جناب محمود خان اچکزئی نے تو اپنی تقریروں میں بھی روایتی بردباری پر جذبات کو غالب آنے نہیں دیا کہ مشکل وقت میں استقلال و استقامت کا مظاہرہ کرنے والے ہی کسی قوم و ملت کی قیادت کرنے کے اہل قرار پاتے ہیں۔

جناب محمود خان اچکزئی سے متعلق واقفان حال بتاتے ہیں کہ وہ مسئلہ کراچی پر ایسا موقف رکھتے ہیں جو شہداء کے ورثاء اور زخمیوں کی خواہش کا آئینہ دار ہے وہ دھمکیوں اور ایسے بلند بانگ دعوؤں پر یقین نہیں رکھتے جنہیں یا تو پورا نہ کیا جا سکے یا جنہیں بعد ازاں مصلحت و مفاد کی چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے۔ جناب اسفند یار ولی سے گورنر کی ملاقات اور طے پا جانے والے امور پر اگرچہ اپوزیشن کی بڑی جماعتوں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ مسلم لیگ (ن) سندھ کے رہنما جناب طارق خان نے جو 12 مئی کو مسلم لیگ (ن) کے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے فائرنگ سے زخمی بھی ہو گئے تھے نے اسے پختون روایات کے منافی قرار دیا ہے تاہم امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت کو مزید مہلت دینے اور ہڑتال مؤخر کیے جانے کے فیصلے کے باوصف پختون قوم پرستوں نے اپنے ساتھ حکومت کو بھی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حکومت حقیقی متاثرین اور شہر کی دیگر مؤثر اور سندھ اسمبلی میں عوامی مینڈیٹ رکھنے والی قوتوں کو اعتماد میں لینے کیلئے کس طرح اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے اور پختون قوم پرست اپنے سیاسی تجربات کے تناظر میں وہ کیا حتمی فیصلے کرتے ہیں جن سے بقول اسفند یار ولی ''شہر کو اس کی روشنیاں بھی لوٹائی جا سکیں'' اور جوان کی قوم پرستانہ سیاست کی بھی لاج رکھنے کا باعث بن سکیں۔ خدا کرے کہ فیصلے عوامی امنگوں کے مطابق ہی ثابت ہوں اس طرح نہ ہوں کہ جیسا کہ بعض حلقے خدشے کا اظہار کر رہے ہیں احسان دانش نے کہا ہے............

نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر
نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہو گا
وہ داستان جو مصائب میں دفن ہے اب تک
زبانِ خلق پہ گر آ گئی تو کیا ہو گا



سانحہ کراچی کے حوالے سے
لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر کا بے لاگ تبصرہ

سابق گورنر ریٹائرڈ جنرل معین الدین حیدر نے کہا ہے کہ ایمرجنسی یا مارشل لاء کوئی حل نہیں حکمرانوں کے پاس ایکسٹرا پاور تو آج بھی موجود ہیں مملکت کے اداروں کو فریق بننے کی بجائے غیر جانبدار رہنا چاہئے۔ چیف جسٹس کے وکلاء کی صوبہ بدری کے احکامات اس کا ثبوت ہیں۔ کراچی کے واقعات میں مملکت کے اداروں کے تماشائی کردار نے قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ حکومتیں ہمیشہ تصادم اور محاذ آرائی سے گریز برتتی ہیں بدقسمتی سے آج صدر مملکت اور خود ان کے اتحادی ریلیاں کر رہے ہیں چیف جسٹس کراچی میں وکلاء سے خطاب کر لیتے تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑتا تھا کون لوگ ان سے خوفزدہ ہیں اور کیوں ہیں؟ یہ ڈھکا چھپا نہیں۔ مملکت کے ادارے اور حکومتیں آپس میں مل جائیں تو اس کے خراب اثرات نکلتے ہیں اس لئے نواز شریف کو کہا تھا کہ سیاسی گورنر نہ لگائیں اور آج بھی یہی ہو رہا ہے ایک ہی مقاصد کے لئے مملکت کے ادارے اور حکومتیں مل چکی ہیں اور عوام حالات کے رحم و کرم پر ہیں۔ وہ گذشتہ روز نوائے وقت سے خصوصی بات چیت کر رہے تھے۔ جنرل معین الدین حیدر نے کہا کہ یہ کراچی میں حالات کی خرابی نہ ملک کے لئے اچھی ہوتی ہے نہ حکومتوں کے لئے۔ خرابی کس وجہ سے ہوئی کیونکر ہوئی یہ ڈھکا چھپا نہیں حکومت اس کی تہہ تک پہنچ چکی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ خود میں نے ٹی وی کے دو پروگراموں میں واضح کر دیا تھا کہ کراچی میں ایک ہی دن میں دو ریلیوں کا انعقاد خطرے سے خالی نہیں، تصادم کے خدشات پہلے سے تھے پھر حکومت نے اس کا ادراک کیوں نہ کیا لیکن جب حکومت اور حکومتی ادارے خود فریق بن جائیں تو پھر حالات یہی بن جاتے ہیں۔ آخر درجنوں معصوم لوگوں کا قاتل کون ہے ان کے گھر والوں کے سامنے کون جوابدہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ افسوسناک امر تو یہ ہے کہ کھلے عام اسلحہ کا بے جا استعمال ہو رہا تھا۔ لاشے گر رہے تھے اور حکومتی ادارے خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہے تھے اور میں کہتا ہوں کہ چیف جسٹس ہائیکورٹ میں خطاب کر لیتے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑتا تھا۔ انہوں نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ حکومت چیف جسٹس کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے بعد اپوزیشن کی تحریک کے مومنٹم سے خوفزدہ ہے اور وہ اسے کچلنا چاہتی ہے۔ لیکن قوت اور طاقت کا استعمال خرابی پیدا کرتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر اپوزیشن جماعتیں آئین، قانون اور عدلیہ کی بالادستی اور مضبوطی کی بات کرتی ہیں تو یہ خوش آئند امر ہے۔ انہوں نے کہا کہ کراچی میں پولیس کے کردار کے بعد پولیس آرڈر 2002ء کے آگے سوالیہ نشان کھڑا ہو گیا ہے عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لئے بننے والی پولیس کیوں خاموش تماشائی بنی رہی۔ رینجرز کیوں بھولے بھٹکے نظر آتے رہے مملکت کے اداروں کا جانبدارانہ کردار ملک کے مستقبل اور مملکت کے حوالہ سے اچھا رجحان نہیں یہ بھی پتہ چلنا چاہئے کہ سادہ کپڑوں میں فائرنگ کرنے والے کون تھے اور ان کے پاس خطرناک ہتھیار کیسے تھے اور اگر ان خبروں کا پتہ نہ چلایا گیا تو یہ ملک کے مستقبل کے حوالہ سے خطرناک ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اب یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا غیر جانبدارانہ کردار بحال کرے ورنہ حالات ان کے کنٹرول میں نہیں رہیں گے۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ حکومت جو اپنے لئے چاہتی ہے دوسروں کو بھی وہی حق دے اگر ملک کے اندر حکومت موجود اور مضبوط ہے اسمبلیاں چل رہی ہیں اور حکومت کو کوئی خطرہ نہیں تو پھر اسے ریلیوں کی کیا ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا

اندر کا خوف باہر آ گیا ہے اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ خود صدر مملکت غیر جانبدار نہیں رہے ان کی حیثیت جانبدار کی ہے اور ساری خرابی اس لئے پیدا ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک منتخب اور نمائندہ حکومت ہی جلتی پر پانی ڈال سکتی ہے۔ فوری طور پر منتخب حکومتوں اور منتخب اسمبلیوں کے ذریعہ سے صدر کا انتخاب ہونا چاہئے۔ عام انتخابات سے قبل صدارتی انتخابات ملک کو استحکام کی بجائے انتشار سے دوچار کریں گے۔ ایک غیر جانبدار حکومت کے ذریعہ انتخابات ہونے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ باہر بیٹھی قیادت کو انتخابی عمل میں شامل کرنا چاہئے۔ نواز شریف اور بینظیر محب وطن ہیں اگر انہیں انتخابی عمل سے باہر رکھا گیا تو پھر انتشار پیدا ہوگا۔ جنرل معین الدین حیدر نے ایک سوال پر کہا کہ یہ بات الارمنگ نہیں کہ وزیر اعلیٰ سندھ کراچی کی صورتحال میں غیر فعال نظر آئے اور گورنر صاحب متحرک دکھائی دیئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسئلہ کا حل ایمرجنسی یا مارشل لاء نہیں ایکسٹرا پاورز تو آج بھی حکمرانوں کے پاس موجود ہیں ملک کی سیاست سے یہ رجحان ختم کرنا ہے کہ فلاں کو جلسہ کرنے دیں گے فلاں کو نہیں کرنے دیں گے کیونکہ ہم پہلے بنگال مت جاؤ کے نتائج بھگت چکے ہیں قانون اور آئین کے دائرے میں جو بھی سیاسی عمل ہو اس کی اجازت ملنی چاہئے اور میں سمجھتا ہوں کہ کراچی کے حالات کو نارمل کرنے کے لئے چیف جسٹس کو کراچی کے وکلاء سے ملنے کا بندوبست از خود کر دینا چاہئے۔ اس سے آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ صورتحال کے منطقی انجام کے حوالہ سے انہوں نے کہا کہ صورتحال پیچیدہ اور خطرناک ہے اس کے لئے سیاسی تدبر کا مظاہرہ کرنا چاہئے نہ کہ ضد یا ہٹ دھرمی کا۔ انہوں نے ایک سوال پر کہا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حکمران ڈائیلاگ سے انکاری ہیں اور اپنی من و مرضی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح معاملات نہیں چلتے اس طرح حکومتیں نہیں چلتیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ کراچی کی صورتحال کو گہرائی سے لینا چاہئے۔ یہ معاملہ سادہ نہیں جب تک ہلاکتوں کی تحقیقات اور ذمہ داران کی نشاندہی نہیں ہوتی صورتحال نارمل نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ میں زور دے کر کہتا ہوں کہ مملکت کے اداروں کو فریق نہ بنائیں یہ ملک کے مستقبل کے حوالہ سے خطرناک ہے۔ عوام کو دہشت گردوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں یہ قومی اتحاد اور یکجہتی کے لئے خطرناک ہے۔ سیاسی جماعتوں کو اپنا کردار ادا کرنے دیں ورنہ یہ جمہوری سسٹم کے لئے خطرناک ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر چیف جسٹس آئین اور قانون کے تابع رہ کر اپنی بات اور اپنا کیس بیان کر رہے ہیں تو آخر حکومت کو کیا خطرہ ہے۔



دلدل میں کون اُتر رہا ہے

صدر جنرل پرویز مشرف اور متحدہ قومی موومنٹ' اب بڑی حد تک جدا...... کئی محاذوں پر تنہا اس طرح الجھ چکے ہیں کہ وہ مزید ایک دوسرے کی حمایت کرنے سے بھی یوں قاصر ہیں کہ یہ دونوں کیلئے اب مزید نقصان کا سبب بن سکتی ہے!! صدر مشرف مغرب میں اپنے وہ تمام دوست تیزی سے کھو رہے ہیں' جو اب تک ان کے اقتدار کے استحکام میں کلیدی کردار ادا کرتے رہے ہیں!! واشنگٹن میں موجود کئی سابق عسکری اور سفارتی عہدیدار' جنہیں صدر مشرف کے ساتھ گزرے چند برسوں میں کام کرنے کا تجربہ رہا ہے' اب ان کیلئے کلمائے خیر بلند کرنے سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ وہ ذرائع ابلاغ جنہیں متاثر کرنے کیلئے صدر نے گزشتہ برس اپنی کتاب کی رونمائی کیلئے بھی اپنے وطن کا نہیں' انہی کی سرزمین کا انتخاب اور وہاں غیر معمولی طویل قیام کیا تھا' اب ہر روز ان پر اس قدر شدید تنقید کر رہے ہیں کہ اب وہاں موجود ہمارے سفارتی نمائندے (جو ہمیشہ حکومت وقت کی کشتی ڈولتا دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنے آئندہ مستقبل کو محفوظ رکھ سکیں!!) بھی اب "دیکھو اور انتظار کرو" کا لائحہ عمل اختیار کر چکے ہیں!! صدر مشرف کو شاید اب اندازہ ہو چکا ہو کہ صرف مغرب پر تکیہ اور انہیں متاثر کرنے کیلئے اختیار کیا گیا "روشن خیال اعتدال پسندی" کا فلسفہ کس قدر غیر حقیقی' بے معنی اور لغو تھا!!!

وہاں سے شائع ہونے والا ہر اداریہ' کالم...... زیر بحث ہر رپورٹ اور ترتیب دیا گیا ہر مذاکرہ...... صدر مشرف کے اقتدار کے خاتمے کی پیش گوئیاں کر رہا ہے اور کوئی ایک بھی تجزیہ نگار انہیں اپنے ہی ایجاد کردہ فلسفہ کے مطابق شخصیت قرار دے کر انہیں مہلت دینے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا!!!

وہ تمام رفقاء جو صدر مشرف کے دور اقتدار میں تمام تر مراعات' غیر ملکی دورے' خود پر لگے کرپشن کے بدنما داغ مٹانے کے عوض اپنے ضمیر نیلام کر کے...... ان کے سجدے بجا لاتے رہے' اب ایک ایک کر کے نہ صرف پیچھے ہٹ رہے ہیں بلکہ کئی تو نجی محفلوں میں کھل کر ان پر تنقید کرنے اور خود کو ان کے فیصلوں سے دور اور اقدامات سے اختلافات کا بھی دعویٰ کرتے ہیں!!! میرے ذاتی علم میں کئی ایسے معتبر نام ہیں جو اس وقت حکومت میں اعلیٰ منصب پر فائز...... گزرے کچھ عرصے میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف سے براہ راست یا بالواسطہ رابطہ کر چکے ہیں!! اور اس وقت بیرون ملک موجود بیشتر حکومتی اکابرین سرکاری خرچ پر یہی فریضہ سرانجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں!!

گویا 9 مارچ کو چیف جسٹس کے انکار کے بعد صدر کو اس حکمران مسلم لیگ کی ہر ہر سطح پر "انکار" کا سامنا ہے...... جس کے سہارے وہ دوبارہ موجودہ سیاسی سیٹ اپ سے وردی میں انتخاب...... ایک من پسند نگران حکومت اور پھر اگلی پارلیمنٹ سے اپنے عہدے کی توثیق کی توقع کر رہے تھے!! وہ بلدیاتی نظام جس سے صدر کو کسی مشکل گھڑی...... مدد کی امید رہی...... اس قدر بھونڈے انداز میں ان کیلئے جلسے جلوسوں میں مجمع اکٹھا کرتا ہے کہ قبضہ کی گئی نجی گاڑیوں سے لے کر سرکاری ملازمین کی تعداد تک ہر ہر تفصیل ذرائع ابلاغ کے پاس ہوتی ہے اور پھر ان سرکاری اجتماعات میں مزید ہزیمت کا سامان' صدر کی اپنی تقاریر میں بار بار دہرائی گئی وہ گفتگو ہوتی ہے جس سے اب کوفت نہیں' بیزاری ہو چلی ہے "ہمیں خطرہ اندرونی انتہا پسندی سے ہے" یا پھر "ملک میں موٹر سائیکلوں کی بڑھتی تعداد"!!

کیا لاتعداد مسائل کی دلدل میں دھنسے عوام' جو مہنگائی' بجلی کی قلت' پانی کے بحران' صحت کی سہولیات کی عدم فراہمی' تعلیم کے فقدان' انسانی

حقوق کی محرومی اور نظام کی غلیظ ترین بدعنوانیوں سے تنگ آ کر خودکشیاں کر رہے ہیں......کی ان کیلئے ملکی سربراہ کا (جو اگلے برس ان پر حکمرانی کا ارادہ رکھتا ہے) یہ انتخابی نعرے ہیں؟؟

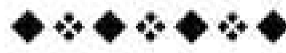
تصور کیجئے کہ صدر بش اپنے اسٹیٹ آف یونین خطاب میں' ٹونی بلیئر دارالعوام میں یا احمد نژاد تہران کے کسی جلسے میں یہ بیان کریں کہ گزرے چند برسوں میں ان کے معاشی ترقی کا سب سے بڑا ثبوت......ان کے ہاں ٹی وی سیٹ اور انٹرنیٹ کنکشنز کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے!! پھر اپنے ہر انٹرویو میں اب صدر ایک نیا تنازعہ چھیڑ جاتے ہیں جو کبھی ''ماورائے آئین اقدامات'' اور کبھی ''کھال'' کی صورت/ ان کے امیج کو مزید ابتر کرتا ہے!! 12 مئی کی شام......جب کراچی لہولہان اپنے جنازے گن رہا تھا......صدر کا شاہراہ دستور پر خطاب کے دوران اختیار کیا انداز بھی شاید کبھی ذہنوں سے حذف نہ ہو سکے اور تبھی یہ سوال بھی جنم لیتا ہے کہ کیا یہ وہی صدر مشرف ہیں جنہوں نے 2001ء میں دورہ بھارت کے دوران وہاں کے انتہائی بے لچک ذرائع ابلاغ تک کو اپنے متاثر کن انداز گفتگو اس طرح گرویدہ بنالیا تھا کہ انہوں نے خود نئی دہلی حکومت پر ہی پلٹ کر تنقید شروع کر دی تھی!!! (لب و لہجے کی کرواہٹ اور انداز بیان میں عدم اعتماد اب اس نہج پر ہے کہ اگر اب صدر وہاں کے ذرائع ابلاغ کا سامنا کریں تو شاید کل یہاں جنگ چھڑ جائے) ایک عرصے تک صدر کی عوامی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ صرف یہی رہی کہ وہ سچی بات بغیر لگے لپٹے انداز میں کیا کرتے تھے!!! کئی مشکل جملے بھی اس طرح کھل کر ادا کر دیا کرتے کہ سننے والے مخالفین بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ ''یار بندہ بات تو ٹھیک کر رہا ہے'' گیارہ ستمبر کے اچانک تبدیل ہوتے موقف سے لے کر قبائلی علاقوں کی قتل و غارت......بدعنوان سیاسی نظام سے لے کر بلوچستان میں فوجی کارروائی تک ......عوام شاید انہیں یوں قبول کرتے رہے کہ صدر مشرف سے پہلے کی نام نہاد جمہوری حکومتوں نے بھی انہیں اس قدر مایوس کیا تھا' کہ صدر انہیں گھپ اندھیروں میں ایک جگنو کی مانند چمکتے نظر آئے اور جہاں لاتعداد مالی اسکینڈلز اور ان میں ملوث اربوں روپے کی بدعنوانیوں میں اعلیٰ شخصیات کے نام مخفی رکھے جاتے رہے......جہاں اسٹیل مل کی نجکاری سے لیکر......کراچی اسٹاک مارکیٹ کے کریش......چینی کے بحران سے لیکر ملک میں ہر روز جنم لیتی ہاؤسنگ اسکیموں کے کردار......پردوں میں چھپے رہے......وہیں عوام کا دل صرف اس بنیاد پر بہلتا رہا کہ ''دیکھو ذرائع ابلاغ کس قدر آزاد ہے! الیکٹرانک میڈیا کتنا کھل کر بول رہا ہے! کیا کبھی کسی حکمران نے اتنی تنقید برداشت کی ہے؟ کیا کبھی اتنا واضح سچ لکھا گیا ہے؟ (یہ موضوع کبھی مستقبل کے لئے چھوڑتا ہوں کہ ذرائع ابلاغ کی اس آزادی کی شرط بھی کہاں اور کن بنیادوں پر طے کی گئی تھی!!) صدر مشرف میں واقعی ایک عرصے بلا کا حوصلہ رہا......اور وہ کھلے ذہن سے مشورے سنا بھی کرتے......سرکاری فائلوں تک خود کو محدود کر لینے کے بجائے......وہ اپنے وسیع حلقہ احباب سے بھی مختلف معاملات پر مشاورت کیا کرتے!!! اور ہر انٹرویو کے دوران وہ اس بات پر زیادہ لطف اندوز ہوتے کہ ان سے سخت تر سوال پوچھا جائے!! یہ وہ دور تھا جب صدر نے خود کو بہترین قانون دان' مذہبی عالم' مثالی سفارتکار' مقبول ترین عوامی رہنما اور عالم اسلام کا مدبرانہ قائد قرار نہیں دیا!!! اور شائد شخصیت میں یہ گرہ تب لگنی شروع ہوئی جب صدر نے بلوچستان میں مفاہمت کی راہ چھوڑ کر عسکری کارروائی کا رستہ اپنایا اور آج جب میں یہ سنتا ہوں کہ ''کسی حکومتی شخصیت کو 9 مارچ سے پہلے ہی اندازہ نہ تھا کہ چیف جسٹس کا معاملہ اس قدر پیچیدہ ہو کر صدر مشرف کے لئے پھندوں کا جال بچھاتا چلا جائے گا'' تو نہ جانے کیوں میرے ذہن میں صدر کا کسی نحس گھڑی اکبر بگٹی کے لئے ادا کیا وہ جملہ گونجتا ہے کہ ''میں اسے اس طرح ختم کروں گا کہ پتا بھی نہیں چلے گا وہ کہاں سے ہٹ ہوا ہے''......ایسا ہی کوئی جملہ شائد تاریخ میں کہیں ''میری کرسی بڑی مضبوط ہے'' کی صورت نشان عبرت ہے اور بدقسمتی سے ایسے جملے......اب تک ادا ہو رہے ہیں' جن میں توبہ' عاجزی' دعا اور انکساری نہیں......اللہ سے مدد اور رہنمائی کی درخواست نہیں ......صرف غرور اور تکبر چھلک رہا ہے!! قدرت یہ انداز پسند نہیں کیا کرتی......!! تیز ہواؤں کا سامنا کرتے درخت بھی کچھ جھک کر خود کو محفوظ کر لیا کرتے ہیں تو کاش صدر مشرف اس مرحلے پر ہی......اس بحران کے انجام سے قطع نظر......صرف اپنا لہجہ نرم کر لیں!! کیا قیامت بپا ہو گئی' اگر ایک

شخص نے ان کے سامنے اختلاف اور انکار کی گستاخی کر لی (اللہ نے انہیں اس مرتبے پر بھی فائز کیا ہے کہ جہاں ہزاروں ہر روز ان کی جی حضور کیا کرتے ہیں) کیا ہوا اگر ان کے خلاف نعرے لگ رہے ہیں (انہیں صبح و شام سلیوٹ بھی تو کیا جاتا ہے) اور پھر یہ تکرار کہ ملک لوٹنے والوں کو واپس نہیں آنے دیا جائے گا (کیا صدر حکمران مسلم لیگ کے کسی جلسے میں یہ کہنے کی جسارت بھی کر سکتے ہیں کہ ملک لوٹنے والوں باہر بھاگنے نہیں دیا جائے گا!!!) کیا یہ بدقسمتی نہیں کہ اب صدر مشرف کی قانونی وکالت ذرائع ابلاغ میں محترم وصی ظفر اور عدالتوں میں ملک قیوم صاحب کے پاس ہے (جن کی سیف الرحمان سے گفتگو کی ریکارڈنگ...... اب تک حافظوں میں محفوظ ہے) یا پھر ارباب غلام رحیم صاحب (جنہیں اب تک یقین ہے کہ اللہ' امریکہ' آرمی اور ایم کیو ایم ان کے ساتھ ہے) اس لئے وہ یہ بیان دیکر آخری کیل ٹھونکنے نکل پڑے ہیں کہ بارہ مئی کی تحقیقات کے لئے عدالتوں سے بھی تعاون کیا جائے گا جب وہ فریق نہیں بنیں گی!! سرکاری حکام کو...... یہ عدالتی احکامات نظر انداز کر دینے کی ہدایت ایک نئی جدت ہے...... اور چونکہ صدر مشرف ابھی دورہ سندھ سے لوٹے ہیں' اس لئے میں وزیر اعلیٰ سندھ کی اس اعصابی کیفیت کی وجوہات سمجھ سکتا ہوں' جن کے تحت انہوں نے یہ بیان داغا ہے!! اب باری کسی وفاقی وزیر کی ہے (جو پہل کر گیا...... وہ نمبر لے جائے گا) کہ سپریم کورٹ سے بھی ہمارا تعاون اسی صورت ہوگا' جب وہ اپنے غیر جانبدار ہونے کا ثبوت دے!! وہ مزید یہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ بارہ مئی کو مرے...... سڑکوں پر مرے...... وہ آخر وہاں کیا کرنے گئے تھے؟؟؟؟ (یہ عقدہ اب کھلا کہ آخر بارہ مئی کو خود وزیر اعلیٰ سندھ کہاں غائب تھے یعنی اگر وہ کہیں نظر آ جاتے تو وہ پھر کبھی نظر نہ آتے)!!!! اور پھر ارباب صاحب کی آہ ان جملوں میں نکلتی ہے "عدالتیں آج کل ہر چیز کا خود نوٹس لے رہی ہیں اور ٹرانسفر پوسٹنگوں اور زمینوں کے معاملات میں بھی مداخلت کرنے لگی ہیں......!!) خدا نہ کرے ارباب صاحب کو مستقبل میں کبھی اقتدار سے باہر ہو کر سندھ کی کسی عدالت میں حاضری دینی پڑے)!! حالات نے اس تیزی سے نظریاتی پلٹا کھایا ہے کہ حکومت پنجاب اب مخلوط میراتھن ریس کے بجائے...... امام کعبہ کے زیر امامت لاکھوں افراد کی نمازوں کا اہتمام کر رہی ہے!! میں نہیں جانتا کہ وہاں صدر کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے یا نہیں (ویسے بھی صدر امام کعبہ سے زیادہ سعادت کے ساتھ کعبہ کی چھت پر اذان دیا کرتے ہیں)!!! یا تو خاموش ہیں اور جو حکومت کی طرف سے بول رہے ہیں وہ ایسے خودکش حملہ آور بن چکے ہیں...... جو اپنے اہداف تک پہنچنے سے پہلے ہی...... اپنی صفوں میں دھماکہ خیز مواد کے ساتھ پھٹ جاتے ہیں!!! مشکل ترین صورتحال محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہے کہ اب انہیں یہ فکر کم کہ صدر مشرف کو اقتدار سے جلد کس طرح الگ کیا جائے اور یہ زیادہ کہ کس طرح اس قدر جلد رخصت ہونے سے روکا جائے؟؟؟ اور پھر وہ مغربی مفکرین اور تجزیہ نگار...... جو ہر زوال پذیر حکمران کے بعد کا منظر نامہ تشکیل دینے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں!!! خود صدر مشرف کے پاس یقیناً اب تک صلاحیت اور مہلت موجود ہے!! وہ صورتحال کا از سر نو جائزہ لیکر شائد معاملات کو اس مرحلے تک لے جانے سے روک سکتے ہیں...... جہاں یہ تیزی سے بڑھ رہا ہے!! غلطیوں کی گنجائش ختم ہو چکی اور ضد کی مدت بھی اب طول نہیں پکڑ سکتی!!! اس سے آگے صرف دلدل کا سفر ہے' جہاں صرف ایک ہی انداز ہوا کرتا ہے!!! وہاں زیادہ ہاتھ پیر مار کر بھی صرف دھنسا ہی جا سکتا ہے اور پھر زیادہ گہرائی میں پہنچ جائیں تو مدد کو آنے والا ہاتھ بھی...... ساتھ ہی اندر گر پڑتا ہے!!!

نئی خاتون امریکی سفیر' کولمبیا رہ کر آ رہی ہیں جہاں کچھ تیس برس قبل باغیوں نے سپریم کورٹ پر قبضہ کر کے جج سمیت 100 وکیلوں کو تب قتل کر دیا تھا...... جب مافیا کے خلاف ایک مقدمے کی سماعت شروع کر دی تھی!! وہاں یہی روایت تھی کہ جب بھی ایسا کوئی مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا تو دھماکے میں جج کو ہلاک کر دیا جاتا!! لیکن تب سو افراد کے مارے جانے کے باوجود...... سماعت جاری رہی اور مافیا کے اہم ترین کردار کو مجرم قرار دیکر تاریخ رقم کر دی گئی......!! عدلیہ کی آزادی کی ہماری لڑائی یقیناً کولمبیا جیسے واقعات کی طرف تو نہیں بڑھ رہی لیکن ملکی عدالتوں میں چھڑا تنازعہ جو پہلے ہی دنیا بھر میں جگ ہنسائی کا سبب بن چکا ہے' اب لندن کی عدالتوں میں عمران خان اور الطاف حسین کے مابین جنگ کی صورت میں مزید سامان

فراہم کر رہا ہے!! ہمارے محترم اور دیرینہ عمران دشمن سرفراز نواز جن کی صلاحتیں......اب تک حکومتی ڈاکٹر نسیم اشرف پر ضائع ہو رہی تھیں......اب مخالف کیمپ میں شمولیت اختیار کر کے......لندن میں عمران خان کے خلاف ایم کیو ایم کا ساتھ دینے جا رہے ہیں!!! وہاں حمایت اور مخالف میں مظاہروں کا آغاز ہو چکا ہے......!!!

اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ صدر مشرف کی طرح......اب ان کی واحد اتحادی جماعت ایم کیو ایم بھی تنہا کئی محاذوں پر لڑ رہی ہے!!! اور ماضی کے برخلاف......اس بار لندن کا محاذ اہم اور حساس ہے!!! اور یہ حقیقت ایم کیو ایم بھی سمجھتی ہے!!! وہاں یہ معاملہ طول پکڑے گا......ایک عرصے تک انہیں الجھائے رکھے گا......اور کئی پنڈارا بکس کھولتا چلا جائے گا......اور یہ ہی عرصہ ہوگا جب پاکستان میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی ہونگی......ایم کیو ایم بھی تنہا......اس غیر ضروری محاذ پر اب اسی طرح لڑے گی......جس طرح یہاں صدر مشرف......!! اور اس دوران باقی کھلاڑی اپنا کھیل سکون سے ترتیب دیتے چلے جائیں گے......یاد رکھئے......!! ''غلطیوں'' کے بعد ''ضد'' صرف ''دلدل'' تک لے جایا کرتی ہے!!! جہاں ہاتھ پیر بھی نہیں مارے جا سکتے!!!



سانحہ کراچی: چیف جسٹس سندھ کا از خود نوٹس

12 اکتوبر 1999ء کو اقتدار میں آنے والا جنرل پرویز مشرف کا سیٹ اپ کراچی میں 12 مئی 2007ء کے واقعات کے بعد اپنی جگہ سے ہل گیا ہے۔ تبدیلی کی لہر چلنے کے آثار ہیں۔ تبدیلی کے لئے عدلیہ اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ وکلاء' سیاستدان' سول سوسائٹی اس کے پیچھے ہیں۔ کالے کوٹ اور کالے گاؤن والے کالا دور ختم کرنے کی تاریخی جدوجہد کر رہے ہیں۔ باوردی صدر کے الفاظ کی کیا حیثیت رہ گئی ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے 25 مئی کو کراچی میں کئی اجلاسوں کے بعد حکم صادر کیا کہ 12 مئی کے واقعات کی انکوائری کو بھول جائیں۔ انکوائری میں پڑے تو حالات بگڑ سکتے ہیں۔ چیف جسٹس نہ آتے تو خون خرابہ نہ ہوتا۔ ڈھائی لاکھ افراد سڑکوں پر تھے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ارباب رحیم نے صدر کی ہاں میں ہاں ملائی کہ انکوائری سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سانحہ نشتر پارک جو 12 ربیع الاول 2006ء کو ہوا اس کی انکوائری کا کیا بنا۔ کوئی 12 مئی کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔

مگر صدارتی حکم کے اجراء کے 24 گھنٹوں کے اندر سندھ ہائیکورٹ نے سانحہ 12 مئی کا از خود نوٹس لے لیا۔ 7 رکنی بنچ تشکیل دے دیا گیا جس نے اپنی کارروائی شروع کر دی ہے۔ حکومت نے اس معاملہ میں خود کو اس قدر ایکسپوز کر لیا ہے کہ کسی انکوائری کی واقعی ضرورت نہیں ہے۔ حکومت واقعات کی ذمہ دار ہے۔ گورنر سندھ نے لندن سے آمد کے بعد سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کر کے کشیدگی کم کرنے کی جو کوششیں کی تھیں ان پر حکومت سندھ نے تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کی آمد پر تیس روز کے لئے پابندی عائد کر کے پانی پھیر دیا۔ اب نئی صورتحال جنم لے رہی ہے۔ چیف جسٹس کے ساتھ ایک اور ہیرو ابھر رہا ہے۔ عمران خان نے اپنی فہم کے مطابق الطاف حسین کو ٹارگٹ بنایا اس طرح بھڑوں کے چھتے کو ہاتھ لگا دیا۔ ایم کیو ایم نے ان کے خلاف راتوں رات ہزاروں افراد کے مظاہرے کرا کے اپنی اسٹریٹ پاور ایک بار پھر ظاہر کر دی ہے۔ اب یہ خدشات ہیں کہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھ رہا ہے۔ مستقبل میں عدلیہ کا اہم رول ہوگا۔

سندھ ہائیکورٹ نے اس واقعہ کا از خود نوٹس لیا کہ حکومت 12 مئی کو سندھ ہائیکورٹ اور سٹی کورٹس کی عمارات کا محاصرہ ختم کرانے میں ناکام رہی۔ چیف جسٹس صبیح الدین احمد نے سندھ ہائیکورٹ کے انچارج رجسٹرار کی رپورٹ پر نوٹس لیا۔ اس رپورٹ کی پٹیشن میں تبدیلی کر کے 7 ارکان کا فل بنچ سماعت کے لئے قائم کر دیا گیا۔ فل بنچ جسٹس سرمد جلال عثمانی' جسٹس انور ظہیر جمالی' جسٹس مشیر عالم' جسٹس عزیز اللہ ایم میمن' جسٹس خلجی عارف حسین' جسٹس مقبول باقر اور جسٹس علی سائیں ڈینو سہو پر مشتمل ہے۔ ہائیکورٹ کے انچارج رجسٹرار عبدالمالک گدی نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ پی ایس فدا حسین نے ان کو 12 مئی کی صبح 7 بجکر 45 منٹ پر اطلاع دی کہ ہائیکورٹ کی ساری عمارت کو ایک ہجوم نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ ہجوم کسی کو اندر جانے نہیں دے رہا ہے جس میں ایڈووکیٹس اور اسٹاف ممبرز شامل ہیں۔ پولیس اس معاملہ میں کوئی مدد نہیں کر رہی ہے۔ انچارج رجسٹرار کے مطابق وہ جب اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے ہائیکورٹ کی طرف بڑھے انہوں نے دیکھا کہ ہائیکورٹ کو جانے والے سارے راستے کنٹینرز' بسوں اور ٹینکرز کے ذریعہ بند کر دیئے گئے وہ کوئی راستہ جانے کو نہیں پا سکے۔ خاص طور پر انہوں نے یہ دیکھا کہ ہائیکورٹ کی بلڈنگ کا

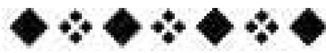
ایک ہجوم نے محاصرہ کر رکھا ہے جو کسی کو جانے نہیں دے رہا ہے۔ وہاں موجود پولیس فورس خاموش تماشائی کی حیثیت سے بیٹھی تھی جو شر پسندوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہی تھی۔

جب سندھ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور انتظامی کمیٹی کے ارکان ہائیکورٹ پہنچے تو اس بات سے ڈسٹرب ہو گئے کہ کورٹ تک رسائی مختلف انٹری پوائنٹس سے بلاک کر دی گئی۔ ججوں' کورٹ اسٹاف' ایڈووکیٹس اور مدعی پبلک کو کورٹ میں جانے سے روک دیا گیا۔ چیف جسٹس نے ان کو ہدایت کی کہ سندھ کے ہوم سیکرٹری اور پراونشل پولیس آفیسر (پی پی او) سے بات کریں جو سکیورٹی انتظامات کے ذمہ دار ہیں ان کو کورٹ کے روبرو طلب کیا جائے تاکہ اپنی پوزیشن واضح کر سکیں۔ پی پی او دستیاب نہیں تھے۔ سی سی پی او اور ٹاؤن پولیس آفیسر پیش ہوئے جنہوں نے وضاحت کی کہ وہ خود پیدل آئے ہیں اور وہ خود مجبور ہیں۔ ہوم سیکرٹری سندھ نے بھی پیش ہو کر کہا کہ وہ اپنی پوری کوشش کریں گے مگر صورتحال جوں کی توں رہی۔ ہائیکورٹ کی عمارتوں کے محاصرہ اور سڑکیں بلاک ہونے سے کئی ججوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انچارج رجسٹرار کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ کراچی ویسٹ اور کراچی ساؤتھ کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے انہیں بتایا کہ سٹی کورٹ کی عمارت کا بھی محاصرہ کر لیا گیا ہے۔ سٹی کورٹ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں پولیس کچھ نہیں کر رہی ہے۔ یہ شکایات ملیں کہ شر پسندوں نے ایڈووکیٹس سے بدسلوکی کی ان کو مارا پیٹا وہ زخمی ہو گئے۔ ایک سینئر خاتون وکیل عصمت مہدی سے بھی بدسلوکی کی گئی۔ جو ججوں کے پروٹوکول افسروں کے خطوط سے ظاہر ہے۔ متاثرہ ججوں میں جسٹس عزیز اللہ ایم میمن' جسٹس مقبول باقر' جسٹس محمد اطہر سعید' جسٹس مسز یاسمین عباسی شامل ہیں۔ ریٹائرڈ جسٹس سجاد علی شاہ کے ڈرائیور نے اس نوعیت کی اطلاع دی۔ انچارج رجسٹرار عبدالمالک گدی نے کہا میں چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کو ریسو کرنے کے لئے ایئرپورٹ نہیں پہنچ سکا کیونکہ ایئرپورٹ کو جانے والے تمام راستے مکمل طور پر بلاک تھے۔ مجھے ہوم سیکرٹری سندھ کے ساتھ ایک ہیلی کاپٹر پر ایئرپورٹ جانا پڑا۔ جہاں میں نے چیف جسٹس آف پاکستان کو ریسو کیا۔ تمام راستے بلاک ہونے کی وجہ سے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ہائیکورٹ نہیں آ سکتے تھے۔ میں ان کے ساتھ رات آٹھ بجے تک ایئرپورٹ پر رہا جب وہ اسلام آباد کے لئے طیارہ میں سوار ہو گئے جب میں رات ساڑھے نو بجے ایئرپورٹ سے واپس گیا تو دیکھا کہ رکاوٹیں ہٹا دی گئی تھیں۔

سندھ ہائیکورٹ کے ججوں پر کیا گزری؟ ججوں کے پروٹوکول افسروں کے خطوط میں کہا گیا ہے کہ مسلح افراد نے سندھ ہائیکورٹ کی عمارت کا محاصرہ کر لیا تھا ان افراد نے ایک جج سے معاندانہ رویہ اختیار کیا اور دو ججوں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا ایک جج کو روکا گیا دوسرے کو گھیرے میں لے لیا گیا پولیس نے کسی مرحلہ پر "نامعلوم وجوہ" کی بنا پر مداخلت نہیں کی۔ جج ججوں کے لئے مخصوص گیٹ کے بجائے سندھ سیکرٹریٹ کے راستے سے پیدل ہائیکورٹ میں داخل ہوئے۔ جسٹس عزیز اللہ ایم میمن کے پی ایس پروٹوکول نے اپنے خط میں کہا کہ مسٹر میمن 12 بجے کے لگ بھگ سندھ ہائیکورٹ کی طرف گئے۔ انہوں نے ہجرت کالونی کے راستے سے کار نکالی مگر سارے راستے بند پائے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہتھیاروں سے لیس لوگوں نے سندھ ہائیکورٹ کی عمارت کو گھیر رکھا ہے۔ ان کو واپس آنا پڑا۔ جسٹس مسز یاسمین عباسی کے پی ایس کے خط میں کہا گیا کہ جسٹس مسز یاسمین عباسی نے سندھ ہائیکورٹ کی بلڈنگ کے راستے میں شر پسندوں اور ایک سیاسی جماعت کے ورکرز کو ہتھیار اٹھائے دیکھا وہ واپس آ گئیں۔ ریٹائرڈ جسٹس سجاد علی شاہ کے ڈرائیور کے مطابق جب مسز شاہ کلفٹن پنجاب کالونی پر سب میرین راؤنڈ اباؤٹ پر پہنچے روڈ مکمل طور پر بلاک تھا۔ ڈرائیور نے کہا کہ اس کو کار روکنا پڑی۔ نامعلوم مسلح افراد کی طرف بڑھے تاہم رینجرز کی ایک جیپ آ گئی جس نے جج کی سرکاری کار کے لئے راستہ صاف کیا۔ جب کار آرٹلری میدان پہنچی تو ہائیکورٹ کے سارے راستے بند تھے اس نے کار ڈی آئی جی کے دفتر پر پارک کی جج کو پیدل جانا پڑا۔ جسٹس محمد اطہر سعید کے پی ایس نے اپنے خط میں ایک ناخوشگوار واقعہ کا ذکر کیا ہے جو ناظم آباد چورنگی پر سرسید گرلز کالج کے سامنے پیش آیا۔ جب دو کاروں نے جج

کی کار کا راستہ روک دیا۔ جج کو مین روڈ سے واپس جانے نہیں دیا گیا جب ڈرائیور پاک کالونی کی طرف مڑا ایک نوجوان نے اسے رکنے کا حکم دیا۔ اس نے جونہی کار روکی ایک کار نے جج کی کار کو پیچھے سے ٹکر ماری جس میں ریئر بمپر کو نقصان ہوا۔ فوری طور پر کئی لوگوں نے کار کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک نوجوان نے کار کی چابی چھین لی اور جج کے ڈرائیور سے معاوضہ طلب کیا۔ ہجوم نے کار پر گھونسے مارے کار میں سوار افراد کو گالیاں دیں۔ عوام نے فلیگ راڈ لاتوں اور گھونسوں سے توڑ دی۔ تاہم ہجوم کے سرغنہ کی مداخلت پر کار کی چابیاں واپس کر دی گئیں۔ ڈرائیور کار کو پاک کالونی تھانہ لے گیا جہاں وہ 45 منٹ تک رہے۔ وہاں سے ایس ایس پی انویسٹی گیشن مشتاق مہر نے ذاتی طور پر جج کو اسکورٹ کیا۔ ہائیکورٹ کے راستے بند تھے جج اپنے گن مین اور ڈرائیور کے ساتھ پیدل گئے۔ ہائیکورٹ کا راستہ تنگ تھا مخالف ہجوم موجود تھا۔ جج کو معاندانہ نظروں سے دیکھا گیا اس کشیدہ ماحول میں وہ سندھ سیکرٹریٹ کی پیرکس کے راستے ہائیکورٹ میں داخل ہوئے۔ جسٹس مقبول باقر کے پی ایس پروٹوکول کے مطابق راستے بند تھے وہ سیکرٹریٹ سے گزر کر ہائیکورٹ پہنچے۔

سندھ ہائیکورٹ کے ججوں نے فیصلہ کیا کہ وہ گورنر سندھ کی غیر حاضری میں قائم مقام چیف جسٹس کے فرائض انجام نہیں دیں گے۔ یہ فیصلہ چیف جسٹس کی سربراہی میں ججوں کے اجلاس میں کیا گیا جس سے حکومت سندھ اور فیڈرل کیبنٹ سیکرٹری کو آگاہ کر دیا گیا۔ اجلاس میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ جب کوئی جج (چیف جسٹس) قائم مقام گورنر بن جاتا ہے تو عدالتی کام متاثر ہوتا ہے۔ یہ انتظامیہ سے عدلیہ کی علیحدگی کے بنیادی اصول کی بھی خلاف ورزی ہے۔ گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد جب نجی دورہ پر لندن گئے تو قائم مقام چیف جسٹس سرمد جلال عثمانی نے قائم مقام گورنر کا حلف اٹھایا مگر حلف برداری کی تقریب گورنر ہاؤس میں نہیں ہوئی' سندھ ہائیکورٹ میں ہوئی۔ چیف جسٹس کے ساتھ عدلیہ اُٹھ کھڑی ہوئی ہے یہ تاریخی جنگ ہے جس میں عدلیہ کے حق میں عوام فیصلہ دے چکے ہیں عدالتی فیصلہ باقی ہے۔



کتاب کی ترتیب وتالیف میں جن مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے مصنفین اور مضامین کی تفصیل ذیل میں درج ہے

1-	چیف جسٹس کی معطلی کے محرکات	
2-	چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس	"ڈیلی نیوز" 21 مارچ
3-	نعیم بخاری کا اختلاف ذاتی تھا یا اصولی	ہارون الرشید، نوائے وقت
4-	سپریم جوڈیشنل کونسل کی آئینی حیثیت	بزنس ریکارڈر کراچی
5-	جوڈیشنل ایکٹوازم	اصغر عبداللہ، سنڈے میگزین نوائے وقت 20 مئی
6-	آئین کی دفعہ 209	اشاعت خاص جنگ
7-	چیف جسٹس کی پہلی پیشی	اداریہ 15 مارچ، روزنامہ پاکستان
8-	چیف جسٹس کی آئینی درخواست کے اہم نکات	اشاعت خاص جنگ
9-	آئینی درخواست کا صدر کی جانب سے جواب	اشاعت خاص جنگ
10-	چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا بیان حلفی (اردو)	
11-	چیف جسٹس کا بیان حلفی (انگلش)	
13-	اعلیٰ حکومتی حکام کے بیان حلفی	
14-	اظہار یکجہتی کے لئے ججوں کے استعفے	
15-	چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکلا	اشاعت خاص جنگ
16-	حکومتی وکلا کا پینل	اشاعت خاص جنگ
17-	فل کورٹ کے ارکان	اشاعت خاص جنگ
18-	عبوری آئین کے تحت حلف نہ اٹھانے والے جج صاحبان	اشاعت خاص جنگ
19-	پاکستان کے چیف جسٹس صاحبان	رفیق شیخ، سنڈے میگزین جنگ
20-	عدلیہ کے سربراہان کی رسوائی	جسٹس (ر) ملک عبدالمجید ٹوانہ، روزنامہ پاکستان
21-	سپریم کورٹ کا ضابطہ اخلاق	ارشاد احمد حقانی، روزنامہ جنگ
22-	پیمرا آرڈی ننس میں حکومت کی نئی ترامیم	روزنامہ جنگ 5 جون
23-	پیمرا ترمیم پر ردعمل	اداریہ نوائے وقت
24-	ونی کیس کا از خود نوٹس (ایک ٹیسٹ کیس)	رپورٹ، روزنامہ خبریں
25-	عدلیہ کے ساتھ کس دور میں کیا ہوا	
27-	لاہور ہائی کورٹ بار سے چیف جسٹس کا خطاب اور والہانہ استقبال	رپورٹ ندائے ملت
28-	سپریم کورٹ بار سے چیف جسٹس اوران کے وکلا کے خطابات	رپورٹ ندائے ملت

29-	عدالتی بحران کے حوالے سے چند اہم انٹرویو	
30-	سپریم کورٹ بار کے صدر منیر اے ملک کا انٹرویو	ممتاز شفیع روزنامہ پاکستان 20 مئی
31-	جسٹس (ر) رشید احمد رضوی کا انٹرویو	آصف مالک، سنڈے میگزین روزنامہ ایکسپریس
32-	ممتاز قانون دان ضیا احمد اعوان کا انٹرویو	سین میم، ندائے ملت
33-	ممتاز صحافی اور دانشور مجیب الرحمان شامی کا انٹرویو	اسداللہ غالب، دھوم ٹیلی ویژن اشاعت روزنامہ پاکستان
34-	عدالتی بحران کے حوالے سے اہم سیمینار کی روداد	واصف ناگی خصوصی اشاعت روزنامہ جنگ 5 اپریل
	12 مئی قومی تاریخ کا سیاہ ترین دن	
35-	سانحہ کراچی ___ قومی تاریخ کا بدترین دن	ندیم اوپل ارشد ورک، سپیشل ایڈیشن خبریں 13 مئی
36-	12 مئی قیامت صغریٰ کا ایک خوفناک منظر	
37-	منیر اے ملک کے دفتر کی بندش اور خاتمہ	سین میم، ندائے ملت
38-	کراچی سے قانون شہر بدر کر دیا گیا	سالک مجید ندائے ملت
39-	نازک ترین حالات اور غیر یقینی صورت حال	
40-	حکومت اور ایم کیو ایم کی وضاحتیں	رپورٹ، ندائے ملت
41-	کیا معاوضہ دکھوں کا مداوا کر سکے گا	منیر احمد منیر روزنامہ پاکستان
43-	اہل پاکستان کے نام الطاف حسین کا کھلا خط	روزنامہ جنگ 19 مئی
44-	کیا مہاجر ہونا گناہ ہے	تنویر قیصر شاہد، روزنامہ پاکستان
45-	کراچی ـــ نامعلوم افراد کہاں سے آئے	13 مئی 2007، اداریہ روزنامہ دن
46-	12 مئی کی ایف آئی آر	بشریٰ اعجاز روزنامہ خبریں
47-	پختون قوم پرستوں کی آزمائش	اجمل خٹک کثر، جنگ 31 مئی
48-	کراچی کو پراکسی وار کے لئے تیار کیا جا رہا ہے	سلیم جاوید چودھری روزنامہ دن 31 مئی
49-	معین الدین حیدر کا بے لاگ موقف	نوائے وقت 14 مئی
50-	دلدل میں کون اتر رہا ہے	ڈاکٹر شاہد مسعود، روزنامہ جنگ
51-	سانحہ کراچی: چیف جسٹس سندھ کا ازخود نوٹس	یوسف خاں، نوائے وقت

